درمیان ایک رابطہ بن جاتا ہے۔ اپنی آفاقی طبیعت (جمعیۃ) کی بدولت اسے سلسلۂ وجود میں ایک بے مثال اور اعلیٰ ترین حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ الجیلی نے صفاتِ الٰہیہ کی چار قسمیں بیان کی ہیں: (۱) ذات (اَحدیت، اَبدیت، خالقیت اور اسی طرح کی دوسری صفات)؛ (۲) صفاتِ جمال؛ (۳) صفاتِ جلال اور (۴) صفاتِ کمال ــــ جمال، جلال اور کمال کی صفات کا ظہور اس دنیا میں بھی ہوتا ہے اور آخرت میں بھی ــــ مثال کے طور پر جنّت اور جہنّم دونوں علَی الترتیب جمال و جلال کا ظہورِ مطلق ہیں۔ لیکن یہ صرف انسانِ کامل ہے جس سے صفاتِ الٰہیہ کا نمایاں اظہار ہوتا ہے اور وہی ہے جسے حیاتِ الٰہیہ سے پورا پورا حصّہ ملتا ہے۔ قرآن پاک کی ایک آیت (۳۳ [الاحزاب]: ۷۲) کی صوفیانہ تفسیر کی رُو سے عالمِ اصغر کے درجے تک پہنچنے کا یہ فریضہ انسان نے خود برضا و رغبت بطور ایک امانت خدا کے ہاتھ سے قبول کر لیا تھا۔ اس کی ذات میں روحانی اور مادّی ہر شے کا نمونہ موجود ہے۔ اس کا قلب اللہ [تعالیٰ] کے عرش کا عقل اس [اللہ تعالیٰ] کے قلم (کلام) کی، نفس لوحِ محفوظ اور فطرت عناصر کے مرادف ہے۔ وہ نُسخۃُ الحَق ہے (قب حدیث کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا)۔ یہ اَمر ناگزیر تھا کہ اسلامی عقائد کی بنا پر حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو انسان کامل کا مثالی نمونہ تصوّر کیا جائے؛ کیونکہ راسخ العقیدہ مسلمان یہ مانتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تخلیق روزِ ازل ہی سے ہو چکی تھی (رک بہ Goldziher: *Neuplatonische und gnostische Elemente im Hadit*، در *Zeitschrift für Assyriologie*، ۲۲: ۳۲۴ ببعد)۔ افلاطونی نظریۂ ظہور (emanation) کی طرح متعدّد صوفی بھی حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم یعنی انسانِ کامل کو [جن میں صفات حسنۂ الٰہیہ کا ظہور ہوا ہے] عقلِ کل یا ''کلامِ کلمہ'' سے ممیّز نہیں کرتے۔ الجیلی نے صاف صاف لفظوں میں وضاحت کر دی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اکمل ترین انسان تھے اور جتنے بھی انبیا اور اولیا ہیں ان کا مرتبہ آپ سے کم ہے۔ الجیلی کے نزدیک [معاذ اللہ] حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہر زمانے میں کسی زندہ ولی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح صوفیہ پر ظاہر ہوتے ہیں (قب گولڈ تسیہر (Goldziher)، محلِّ مذکور، اس عقیدے کے بارے میں کہ نورِ محمدی منتقل ہوتا رہتا ہے)۔ پھر اس عقیدے میں بھی اسلام کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ انسان کامل کے لیے شریعت کی پابندی ضروری ہے۔

مآخذ: متن مادّہ میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ (۱) محمود شبستری: گلشن راز، طبع Whinfield، اشعار ۳۱۲-۵۶۱؛ (۲) Tholuck: *Sufismus*، باب ۴؛ (۳) پامر (Palmer): *Oriental Mysticism*، باب ۳؛ (۴) شیخ محمد اقبال: *The Development of Metaphysics in Persia*، جس میں الجیلی کے فلسفیانہ نظریات کا بہترین اور مفصّل ترین بیان ملتا ہے؛ [اس سلسلے میں اقبال کے مردِ کامل کا تصوّر بھی قابلِ مطالعہ ہے، دیکھیے (۵) یوسف حسین خان: روح اقبال؛ (۶) خلیفہ عبدالحکیم: فکر اقبال وغیرہ]؛ (۷) نِکلسن (Nicholson): *The Mystics of Islam*، باب ۶۔

(NICHOLSON)

اِنشا: تخلّص سیّد انشاء اللہ خان، اردو کے ممتاز شاعر، نثر نگار اور ماہر لسانیات۔ ⊗ ان کے اجداد نجفِ اشرف کے جعفری سیّد تھے، جو ہندوستان چلے آئے اور دِلّی میں بس گئے (مجموعۂ نغز؛ تذکرۂ ھندی)۔ انشا کے والد مُخبر الدّولہ حکیم ماشاء اللہ خان مصدر ایک حاذق طبیب، خوش بیان شاعر اور مردِ میدان تھے (دستور الفصاحت؛ مخزن الغرائب)، لیکن ان کے اوائلِ عمر کے حالات دست یاب نہیں ہوتے۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ دِلّی میں شاہی طبیب اور زمرۂ امرا میں داخل تھے، جہاں سے وہ مرشد آباد گئے اور وہاں کے دربار میں بڑی شان و شوکت اور امارت کے ساتھ رہے۔ یہیں انشا کی ولادت ہوئی۔ تاریخ پیدائش کے متعلّق مجموعۂ نغز میں لکھا ہے کہ ان دنوں سراج الدولہ کا عہدِ حکومت تھا (جو بروے سیر المتأخّرین ۹ رجب ۱۱۶۹ھ [۱۰/ اپریل ۱۷۵۶ء] تا ۵ شوال ۱۱۷۰ھ [۲۳/ جون ۱۷۵۷ء] ہے)۔ اکلوتے بیٹے ہونے کے باعث ان کی تعلیم و تربیت پر انتہائی توجہ دی گئی، چنانچہ وہ کم عمری ہی میں شریفانہ فنون سے بہرہ ور ہو گئے۔ ان کی ذہانت و ذکاوت، علمیت و فضیلت اور حسنِ سیرت و صورت کا اعتراف سبھی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔

میر قاسم کے عہد میں بنگالہ کے سیاسی و اقتصادی بحران سے پریشان ہو کر میر ماشاء اللہ، نواب شجاع الدولہ والیِ اودھ کے ہاں فیض آباد چلے گئے (مخزن الغرائب)۔ انشا کی عمر سولہ سال ہو گی جب نواب کے دربار میں باریاب ہوئے۔ اس وقت وہ اپنا ایک دیوان مرتب کر چکے تھے (دستور الفصاحت)۔ شاعری میں شاگردی کا جال کسی ہم عصر تذکرے میں نہیں ملتا۔ احد علی یکتا نے انھیں میر سوز کا اور نساخ نے مُصحفی کا شاگرد ٹھیرایا ہے، مگر اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ درحقیقت انشا کی افتادِ طبع کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ وہ شاعری میں استادی و شاگردی کے متحمّل ہی نہیں ہو سکتے تھے۔

شجاع الدولہ کی وفات (۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء) کے بعد انشا چندے امیر الامراء ذوالفقار الدولہ نجف خان کے لشکر میں اور کچھ مدّت بندھیل کھنڈ میں قیام کرنے کے بعد دِلّی پہنچ گئے اور شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ تباہی و انتشار کے باوجود دِلّی میں شاعری کے قدردان موجود تھے اور میر و سودا کے شاگردوں کے دم سے شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتی تھیں، جہاں انشا کو جولانیِ طبع دکھانے کا موقع خوب نصیب ہوا۔ اس دور کا اہم ترین واقعہ مرزا عظیم، شاگردِ سودا سے انشا کا معرکہ ہے، جس کی تفصیل ایک چشم دید گواہ قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز میں بیان کی ہے۔

انشا دلّی چھوڑ کر لکھنؤ کب پہنچے؟ اس کی قطعی تاریخ کا تعیّن دشوار ہے، البتہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۸-۱۷۸۹ء میں لکھنؤ میں تھے اور غالباً نواب الماس علی خان کی سرکار میں ملازم تھے (تحقیقی نوادر)۔ نواب کی مدح میں انشا کا ایک قصیدہ موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا کہ اس کی تحریر کے وقت نواب مذکور کی عمر چالیس برس تھی اور ۱۲۳۳ھ میں بعمر ساٹھ سال ان کا انتقال ہوا۔ بنا بریں

آزاد کا یہ بیان صحیح نہیں کہ انشا، مصحفی کے بعد لکھنؤ پہنچے اور اس وقت مصحفی مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ دہلی کے استاد تھے (دیکھیے آبِ حیات)، کیونکہ تذکرۂ ھندی گویان میں خود مصحفی رقم طراز ہیں کہ مرزا سلیمان شکوہ نے انشا کے کہنے پر مجھے طلب کیا۔ یہ تذکرہ ۱۲۰۹ھ/ ۱۷۹۴ء میں تمام ہوا تھا اور اس سے دوسال قبل ۱۲۰۷ھ/ ۱۷۹۲ء میں سلیمان شکوہ نے ولی اللہ مُحِب کے انتقال کے بعد مصحفی کو اپنا استاد بنایا۔ خود سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء میں لکھنؤ پہنچے تھے۔ بہرحال انھیں کے دربار میں مصحفی وانشا کا وہ تاریخی معرکہ پیش آیا جس نے دونوں شاعروں کو رسوا اور اردو شاعری کو بدنام کیا۔ اس کی جزئی تفصیلات کسی ہم عصر نے قلم بند نہیں کیں۔ زمانۂ حال کے اکثر نقادوں نے آبِ حیات پر اعتماد کیا ہے، جس میں آزاد نے بڑے پُرلطف پیرائے میں یہ داستان بیان کی ہے؛ لیکن آزاد کی نگارشات کے بارے میں اس اَمر کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ حقیقت بیان کرتے کرتے افسانہ طرازی پر کب اتر آتے ہیں۔ بہرکیف قدیم تذکروں سے یہ ظاہر ہوتا کہ پلّہ انشا کا بھاری رہا اور مصحفی کو نہ صرف رسوائی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ سلیمان شکوہ کی خفگی مول لے کر پچیس روپے کے بجاے پانچ روپے ماہوار تنخواہ پر اکتفا کرنا پڑی۔ کچھ عرصے بعد یہ بدمزگی اس قدر بڑھی کہ ان استادوں کے شاگرد بھی میدان میں اتر آئے، جس سے لکھنؤ میں بدامنی کا خدشہ پیدا ہوگیا اور نواب آصف الدولہ نے انشا کو شہر سے چلے جانے کا حکم دے دیا؛ چنانچہ وہ حیدرآباد کی طرف روانہ ہوے (تذکرہ خازن الشعراء)، لیکن اسی دوران میں آصف الدولہ کا انتقال ہوگیا (۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء) تو وہ لَوٹ آئے۔ نواب وزیر علی خان کے چندروزہ عہدِ حکومت کی افراتفری میں کسی نے اس حکم عدولی کا جائزہ نہ لیا (نگار، مصحفی نمبر)۔ جب نواب سعادت علی خان ۳ شعبان ۱۲۱۲ھ/ ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو مسند نشین ہوے تو انشا نے تہنیتِ جلوس کا قصیدہ پیش کیا۔ چونکہ تذکرۂ ھندی گویان میں اس مناقشے کا کوئی ذکر نہیں ملتا، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ۱۲۰۹ھ/ ۱۷۹۴ء سے ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء تک پیش آیا ہوگا۔ انشا کی وفات پر مصحفی نے جس پیرائے میں اظہارِ غم کیا ہے اس سے گمان گزرتا ہے کہ یہ افسوس ناک صورتِ حال دوبارہ پیدا نہ ہوئی ہوگی۔

لکھنؤ واپس آکر انشا کچھ مدّت تو اپنے پرانے مربّی سلیمان شکوہ ہی کی سرکار میں ملازم رہے، لیکن ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء میں انھیں وہاں اثر و رسوخ حاصل نہ رہا تھا (گلشن ھند)، چنانچہ بقول صاحبِ مخزن الغرائب وہ وہاں سے رخصت ہوکر چند روز نواب الماس علی خان کی ملازمت میں رہے، پھر نواب سعادت علی خان کے دربار میں پہنچ گئے اور جلد ہی اپنی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی کی بدولت مقرّبِ بارگاہ ہوگئے۔ یہ انشا کے عروج کا زمانہ تھا، لیکن علمِ مجلس اور دربارداری کے قرینوں سے واقف ہونے کے باوجود انشا اس مقام پر زیادہ عرصے تک فائز نہ رہ سکے اور اپنی کسی بات سے نواب کو ایسا برافروختہ کردیا کہ ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء میں انھیں ملازمت سے برطرف کرکے گھر میں نظر بند کردیا گیا (معدن الفوائد)۔

انشا کی زندگی کا آخری دور رنج و مصائب سے پُر نظر آتا ہے۔ ۱۲۲۸ھ/ ۱۸۱۳ء میں ان کی جوان سال بیٹی چیچک کا شکار ہوگئی، پھر اکلوتا بیٹا تعال اللہ خان بھی داغِ مفارقت دے گیا۔ نظر بندی، عزیز دوستوں کی بے رخی اور جوان اولاد کی موت نے انشا کے حواس مختل کردیے (دستور الفصاحت)۔ بالآخر ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷-۱۸۱۸ء میں وہ وفات پاگئے۔ عمر ساٹھ برس سے کچھ زیادہ پائی۔

تصنیفات: (۱) کلیات انشا (مطبوعۂ نول کشور ۱۸۹۸ء): اس میں اردو غزلیات کے علاوہ ایک پورا دیوان ریختی، متعدّد قصائد، چند مثنویات، دیوان فارسی، دیوان بے نقط، اور متفرّق ابیات، رباعیات، قطعات وغیرہ سے ان کی قادرالکلامی اور نغز گوئی کا ثبوت ملتا ہے؛ (۲) دریاے لطافت: یہ فارسی نثر میں مرزا محمد حسن قتیل کے اشتراک سے لکھی گئی۔ پہلا حصّہ انشا کی تصنیف ہے، جس میں زبان کی اصل وارتقا اور اس کے اصول وقواعد، اردو کی صرف ونحو، نیز دلّی اور لکھنؤ اور اس کے مختلف محلّوں اور طبقوں میں بولی جانے والی اردو کے نمونے تحریر کیے گئے ہیں۔ ہماری زبان میں یہ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے اور اسے اردو لسانیات کی تاریخ میں ایک اہم دستاویز قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسے مولوی عبدالحق کے مقدّمے کے ساتھ انجمن ترقیِ اردو نے شائع کیا ہے؛ (۳) داستان رانی کیتکی اور کنور اودھے بھان کی: ٹھیٹ ہندی میں ہے ــــ پوری کہانی میں کوئی لفظ عربی، فارسی یا سنسکرت کا نہیں آنے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اسلوب تکلّف سے خالی نہیں، لیکن اس سے مصنّف کی جدّت طبع اور قدرتِ زبان کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی طرف سے شائع ہوئی تھی، آج کل انجمن ترقی اردو کا مطبوعہ نسخہ دست یاب ہے؛ (۴) لطائف السعادت، نواب سعادت علی خاں کی فرمائش پر ان کی دلچسپی کے واسطے لکھی گئی تھی۔ حال ہی میں ڈاکٹر آمنہ خاتون (بنگلور) نے مرتّب کرکے شائع کی ہے؛ (۵) بحر السعادت: تاحال شائع نہیں ہوئی، غالباً یہ دریاے لطافت کا نقشِ اوّل تھا (مرزا محمد عسکری)۔

انشا کے ابتدائی کلام میں قدما کا اثر نمایاں ہے، چنانچہ اس دور کی غزلوں میں عشق کے پاکیزہ تصوّرات، تصوّف کے بلند مسائل اور اخلاقی مضامین نہایت سادہ زبان اور دل نشین انداز میں بیان کیے گئے ہیں، لیکن آگے چل کر انھوں نے سوز کی سادہ زبان، سودا کے پُرشکوہ انداز اور جرأت کے بے باک بیان کو اپنی طبعی ظرافت کی چاشنی دے کر ایک ایسا انفرادی رنگ پیدا کیا جس کے، بقول آزاد، وہ آپ ہی بانی تھے اور اس کا آپ ہی خاتمہ کرگئے۔ ان کے بیشتر کلام میں سوز و درد کم اور زور وشکوہ زیادہ ملتا ہے۔ اس خصوصیّت نے علمیت وفضیلت، مضمون آفرینی اور قدرت زبان و بیان کے ساتھ مل کر انھیں اردو کا ممتاز قصیدہ نگار بنادیا، لیکن اسی کے بے جا استعمال نے ان کے تغزّل کو مجروح کرکے رکھ دیا۔ شوخی وظرافت اور شگفتگی وزندہ دلی کے بعد ان کے ہاں جو بات سب سے زیادہ جاذبِ توجّہ نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے پرانے الفاظ وتراکیب چھوڑ کر ایک نئی زبان اور ایک نیا لہجہ اختیار کیا، جسے روزمرّہ زندگی سے حاصل کیا تھا۔ اس میں چاہے عظمت اور حسن

نہ ہو بہر حال یہ ایک جرأت مندانہ جدّت ضرور تھی۔ روزمرّہ کے احوال و کیفیات کے، جنھیں نظیر اکبرآبادی نے بڑی جامعیت و وسعت سے بیان کیا، ابتدائی نقوش انشا کے ہاں ملتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر عالم اور درباری تھے، چنانچہ ایک طرف تو طویل سہ غزلوں اور چہار غزلوں، سنگلاخ زمینوں، عجیب و غریب قافیوں، لمبی لمبی ردیفوں، نامانوس تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں، پھر مختلف زبانوں کے الفاظ کے استعمال میں ان کی علمیت کا جا و بے جا اظہار ہوا، دوسری طرف اپنی افتادِ مزاج، لکھنؤ کے ماحول، نیز معاشی اعتبار سے ایسے درباروں کے ساتھ وابستگی کے باعث جہاں عامیانہ جذبات کا دور دورہ تھا ان کے اشعار میں جذبات کی عریانی اور خیالات کی پستی در آئی یا وہ محض زبان و بیان کے چٹخارے تک محدود ہو کر رہ گئے۔ یہ سب کچھ غزل کی روایت کے خلاف تھا، لیکن انشا نے اپنی شاعری کی خشت بندی انھیں سے کی ہے۔ ان کی جدّت و ظرافت، جس سے صحیح کام لے کر گری ہوئی قوم کو ابھارا جا سکتا تھا (قبؔ اکبر الٰہ آبادی)، بے لگام ہو کر صرف درباروں اور مشاعروں میں وقتی قہقہوں اور داد و تحسین کے لیے وقف ہو کر رہ گئی۔ بایں ہمہ ان کا یہ کارنامہ قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے غزل کی حدود کو وسعت بخشی، اردو زبان میں لچک پیدا کی، اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کر لینے کی صلاحیت پیدا کی اور جس زمانے میں اردو شاعری کی تان یاس و افسردگی کی آہوں پر ٹوٹ رہی تھی انھوں نے طرب و نشاط کے نغمے سنا کر ہنسی اور قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوڑیں۔

مآخذ: (۱) احمد علی یکتا: دستور الفصاحت، مرتبۂ امتیاز علی عرشی، کتاب خانۂ رام پور ۱۹۴۳ء، اور وہ تذکرے جن کی فہرست بذیلِ مادّۂ انشا درج ہے، بالخصوص (۲) مصحفی: تذکرۂ ہندی گویاں، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۴ء؛ (۳) قدرت اللہ قاسم: مجموعۂ نغز، مرتّبۂ محمود شیرانی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۳۳ء؛ (۴) شیفتہ: گلشنِ بے خار، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۱۰ء؛ (۵) میرزا علی لطف: تذکرۂ گلشن ہند، مع تحشیہ و تصحیح از شبلی نعمانی و مقدمہ از مولوی عبدالحق، دارالاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۰۶ء؛ (۶) محمد حسین آزاد: آب حیات، مطبوعۂ شیخ غلام علی، لاہور ۱۹۵۷ء؛ (۷) عبدالسلام ندوی: شعر الہند، مطبع معارف، اعظم گڑھ، تاریخ ندارد؛ (۸) عبدالحی: گلِ رعنا، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۳۷۰ھ؛ (۹) محمد حسن قتیل: معدن الفوائد (''رقعات قتیل'')، مطبع جعفری، کانپور ۱۲۷۳ھ؛ (۱۰) امیر احمد علوی، در نگار، لکھنؤ (مصحفی نمبر)؛ (۱۱) سکسینہ و عسکری: تاریخ ادب اردو، مطبع نول کشور، لکھنؤ؛ (۱۲) ابواللیث صدیقی: لکھنؤ کا دبستان شاعری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۴۴ء؛ (۱۳) سیر المتأخّرین، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء؛ (۱۴) خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۵ء؛ (۱۵) آمنہ خاتون: تحقیقی نوادر، کوثر پریس بُک ڈپو، بنگلور ۱۹۴۹ء؛ (۱۶) احمد علی سندیلوی: مخزن الغرائب، مخطوطہ، در کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی، لاہور؛ (۱۷) کلیاتِ انشا، مطبع اردو اخبار، دہلی ۱۸۵۵ء؛ (۱۸) کلام انشا، مرتّبۂ مرزا محمد عسکری و محمد رفیع، ہندوستانی اکیڈمی، الٰہ آباد ۱۹۵۲ء؛ (۱۹) دریاے لطافت، مرتبۂ انجمن ترقی اردو، کراچی؛ (۲۰) داستان رانی کیتکی، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۳ء؛ (۲۱) سیّد عبداللہ: چند شاعر، نئے اور پرانے، لاہور ۱۹۶۳ء؛ نیز اسی کتاب میں مضمون ادبی معرکے؛ علاوہ ازیں راقم کے متعدّد مقالات، بالخصوص (۲۲) سیّد انشا کی شخصیّت، در ادب لطیف، لاہور (جون ۱۹۵۰)؛ (۲۳) انشا اور طریقۂ راسخۂ شعراء، در مجلّۂ مذکور (اکتوبر ۱۹۵۱ء)؛ (۲۴) انشا کی شورش پسندی، در ماحول، لاہور (شمارہ ۱)؛ (۲۵) انشا کی ریختی، در ادبی دنیا، لاہور (اگست ۱۹۵۳ء).

(سید امجد الطاف)

اِنْشاء: (ع) (= ایجاد)۔ مفاتیح العلوم، طبع فان فلوٹن (Van Vloten)، ص ۷۸، کے مطابق اِنْشاء کے ایک معنی کسی دستاویز کا تیار کرنا ہے۔ جسے بعد ازاں رئیس دفتر معائنہ کر کے ضروری ترمیم کے بعد یا کسی قسم کے ردّ و بدل کے بغیر آخری شکل دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس سے کسی دستاویز کا مسوّدہ مقصود ہے۔ علم الانشاء سے مراد دستاویز نویسی ہے، یعنی خطوط اور دستاویز کی تحریر کا فن۔ خیال کیا جاتا ہے کہ عربوں کے ہاں آخری اُمَوی خلیفہ مَرْوان ثانی کا کاتبِ سِر عبدالحمید ابن یحییٰ (اس کے لیے دیکھیے ابن خِلّکان، بذیلِ مادّہ) پہلا شخص تھا جو اس فن میں شہرۂ آفاق ہوا۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں عربی، فارسی اور ترکی میں بے شمار کتابیں ہیں، جن میں ضمناً تہذیب و تمدّن کی تاریخ کے متعلّق بھی بہت سی معلومات شامل ہیں، مثلاً القَلْقَشَنْدِی [رکؔ بآن] کی ضخیم کتاب صُبْحُ الأعْشٰی اور ابن فَضل اللہ [رکؔ بآن] کا بہت ہی مختصر رسالہ موسوم بہ التَعْرِیفْ بالمُصْطَلَح۔ الشریف مَرْعی بن یوسف نے عربی زبان میں رہنماے انشا کے طور پر کتاب بدِیْع الاِنْشاء وَ الصِفات فِی المُکاتبات و المُراسلات لکھی، جو بولاق، قاہرہ اور قسطنطینیہ میں بار بار چھپی ہے اور بعض اوقات حَسَن العَطّار [رکؔ بآن] کی اسی قسم کی تصنیف اِنْشاء العَطّار کے ساتھ۔ مذکورۂ بالا کتابوں سے بھی قدیم تر کتاب ابن فَہْد الحَلَبی (قاہرہ ۱۲۹۸ھ، ۱۳۱۵ھ) کی حُسْن التَوَسُّل اِلٰی صِناعَةِ التَرَسُّل ہے۔ عربی زبان میں ایسے بہت سے مجموعے ہیں جن میں خطوط کے نمونے دیے گئے ہیں، قبؔ فہرست مخطوطات عربیہ کی متعلقہ فصل۔ حال کی تصانیف: سعید شَرْتُونِی: *Manuel de style epistolaire*، بیروت ۱۸۸۰ء؛ جے۔ حَرْفُوش: *Correspondance Commerciale*، بیروت ۱۹۰۲ء؛ فَیُومِی (E. Fumey): *Choix de Correspondances Marccaines*, etc.، ۱۹۰۳ء، وغیرہ؛ فارسی زبان میں ابن مُؤَیَّد البَغدادی، ہِنْدُو شاہ المُنْشی النَّخْجوانی اور ابوالفَضْل [رکؔ بآن] وغیرہ۔ مجموعۂ خطوط کے علاوہ ہمارے پاس خط کتابت کے موضوع پر ہَرْکَرْن [رکؔ بآن]، خلیفہ شاہ محمد (جامع القوانین، لکھنؤ ۱۸۴۶ء و کانپور ۱۸۶۴ء) اور سیّد الاِنْشاء نَوظُہُوْر، تہران ۱۳۲۷ھش وغیرہ بھی موجود ہیں۔ ترکی زبان میں خط کتابت کی کتابیں نِرْکِسی زادہ اور قِنالی زادہ نے لکھیں۔ فِرِیْدُون کے مشہور و معروف مجموعے کے متعلّق بہت کچھ کہا جا چکا ہے ([آ آ، طبع اوّل] ۲: ۹۵)؛ نیز قبؔ خَیْرات اِفِنْدی: اِنشاء، طبع ہشتم بولاق ۱۲۴۲ھ)۔ تصانیفِ دورِ حاضرہ: احمد راسم: اِلاَوِلِی خَزِینۂ مکاتب [مکاتیب] (استانبول ۱۳۳۱ھ)؛ محمد فؤاد: رَہْبرِ کتابت عثمانیہ یا

خود مکمّل منشئات (استانبول ۱۳۲۸ھ)؛ سعید افندی: *Guide complet de correspondance turcfrançais* (قسطنطینیہ ۱۳۳۱ھ) وغیرہ۔

دیوان انشاء کے پیشہ ور کاتبوں [رک بہ کاتب] کو منشی کہا جاتا ہے، لیکن ہندوستان میں ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی، بالخصوص وہ جو ہندوستانی زبان کی تعلیم دیتا ہو، منشی کہلاتا ہے؛ قب Hobson-Jobson، بذیل مادّۂ منشی؛ نیز قب دوات دار اور کاتب، جہاں مزید مآخذ دیے گئے ہیں۔

[نیز دیکھیے وحید قریشی: *Insha Literature of Persian* (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)؛ سیّد عبداللہ: انشاے فارسی، در اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۲۷ء، موزۂ بریطانیہ، لنڈن اور انڈیا آفس کے مخطوطاتِ فارسی کی فہرستوں میں انشائی ادب پر مزید حوالے ملتے ہیں]۔

(ادارہ)

⊗ **اِنْ شاءَ اللہ**: زمانۂ مستقبل کے متعلّق کوئی بات کہتے وقت اِنْ شاء اللہ کے الفاظ کا عام استعمال اسلامی معاشرے کی ایک نمایاں خصوصیّت ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اس جملے کو بطور فرض استعمال کرنے کی بنیاد قرآن مجید میں ملتی ہے، جہاں فرمایا: وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا o اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیْتَ (۱۸[الکہف]:۲۳) (= کسی کام کی نسبت ہرگز نہ کہنا کہ اسے کل یعنی زمانۂ مستقبل میں کروں گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے)۔ خود قرآن مجید میں اس کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں، جیسے سورۃ الکہف میں ہے: سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا (۱۸:۶۹) (= اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے)، نیز دیکھیے ۱۱[ھود]:۳۳؛ ۱۲[یوسف]:۹۹؛ ۳۷[الصّٰفّٰت]۱۰۲۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اِنْ شاء اللہ کا استعمال فرماتے تھے، دیکھیے قبرستان میں داخل ہوتے وقت کی دعا، جس میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: اِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ، یعنی ہم بھی اِنْ شاء اللہ تم لوگوں سے آملیں گے۔ احادیث میں ان شاء اللہ کے استعمال کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، مثلاً البخاری، کتاب الایمان، باب ۱، ۳، ۴، ۱۸؛ کتاب الکفارات، باب ۹، ۱۰؛ کتاب الجہاد، باب ۲۳؛ کتاب النکاح، باب ۱۹ و مسلم، کتاب الأدب، باب ۶۲؛ کتاب الطّب، باب ۱۹؛ کتاب الفِتَن، باب ۶ و الترمذی، کتاب الصّلوٰۃ، باب ۱؛ کتاب النذور، باب ۷ و نسائی، کتاب الجنائز وغیرہ۔ ان شاء اللہ کا جملہ خواہش یا امید کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔

(عبدالمنان عمر و ادارہ)

⊗ **اَلاِنْشِراح**: قرآن مجید کی چورانویں سورت کا نام۔ یہ بعثت نبوی سے جلد ہی بعد مکّۂ معظّمہ میں نازل ہوئی (الاِتقان، ۱:۱۰)۔ اس میں ایک رکوع اور آٹھ آیتیں ہیں۔

عربی میں شرح کے معنی ہیں کھولنا، کاٹنا، پھیلانا۔ شرح الغامض کے معنی ہیں کسی پیچیدہ بات کو واضح اور معمّے کو حل کر دینا، اس کی تفسیر کرنا، اسے وضاحت کے ساتھ بیان کرنا اور سمجھا دینا۔ شرح صدر کے معنی امام راغبؒ نے بیان کیے ہیں: الٰہی نور اور الٰہی کلام کے ذریعے سکون اور اطمینان کے ساتھ قلب میں وسعت پیدا ہو جانا (مفردات، تحت مادّۂ ش رح)۔ ماہرِ لغت ابن الاَعْرابی کے نزدیک شرح کے معنے بیان، فہم، فتح اور حفظ کے ہیں اور شرح صدر کے معنی ہیں قبولِ حق اور قبولِ خیر کے لیے دل کا کھل جانا (تاج العروس، تحت مادّہ)۔

اس سورت میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے شرح صدر کا ذکر ہے اور اس ضمن میں آپؐ کے فضائل و محامد بیان ہوے ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح وحی اور انوار الٰہیہ کے ذریعے اطمینان اور سکینت سے آپؐ کا سینۂ مبارک بھر دیا گیا، کس طرح اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو صداقتوں اور نیکیوں کے قبول اور ان پر عمل پیرائی کے لیے سرورِ قلب عطا فرمایا اور کس طرح آپؐ کو اپنی صداقت اور وحی قرآن کی صداقت پر یقینِ کامل حاصل ہے اور اس پر اعلیٰ درجے کے دلائل نیز ازالۂ مشکلات کے سامان میسّر ہیں۔ ۱۸[الکہف]:۶؛ ۲۶[الشعراء]:۳؛ ۳۵[الفاطر]:۸ سے ظاہر ہے کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو نوعِ بشر کی گم راہی اور حق و صواب سے محرومی کا بے حد غم تھا۔ یہ بھی حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی انتہائی شفقت اور شانِ رحمت ہی کا ایک روشن نشان تھا۔ پھر اگرچہ کارِ تبلیغ جاری رکھنے میں قدم قدم پر خوفناک مشکلات پیش آ رہی تھیں، پھر بھی خوش نصیبوں کی خاصی تعداد دولتِ ایمان سے بہرہ مند ہو رہی تھی۔ ہدایت خلق کا بھاری اور صبر آزما کام روز بروز ترقی پر تھا، نیز اہلِ ایمان ہر قسم کی مشکلات صبر و ہمّت سے برداشت کرتے جا رہے تھے اور حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا بوجھ ہلکا کرنے والے جاں نثار صحابہ کی ایک جماعت میسّر آ گئی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو برگزیدہ وجود دعوتِ حق کے لیے ماموری کا منصب پاتے ہیں وہ ادب و خشیت کے مقام پر ہوتے ہیں۔ منصبِ نبوت اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلند ترین منصب ہے، جس کی ذمّے داریاں بڑی ہی گراں قدر ہیں۔ ان ذمّے داریوں کا احساس طبیعت کو قدرے مضطرب رکھتا ہے (نیز دیکھیے ۲۰[طٰہٰ]:۷۰)۔ پس وہ کمر توڑ دینے والا بوجھ جس کا اس سورت میں ذکر ہے (وِزْرَکَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ) عظیم ذمّے داریوں کے متعلّق شدید احساس کا بوجھ تھا، اصلاحِ عالم کا بوجھ تھا، قیامِ توحید کی مشکلات کا بوجھ تھا، منصبِ نبوت کی گراں بار ذمّے داریوں کا بوجھ تھا۔ الرازی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ آنحضرتؐ کو اہل و عیال کے نان و نفقہ وغیرہ کا کوئی بوجھ نہ رہا؛ پھر یہ کہ مکروہاتِ دنیا کا کوئی بوجھ آپؐ پر نہ تھا اور آپؐ دنیا کے ہمّ و غم سے مبرّا تھے، کیونکہ عرب ہمّ کے لیے ضیقِ صدر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ پھر اس سے امت کے گناہوں کا بوجھ مراد ہے۔ ایک معنی یہ کیے گئے ہیں کہ یہ بوجھ نزول وحی و جبریلؑ کا تھا۔ اسی طرح انھوں نے نو بوجھوں کا ذکر کیا ہے۔ امام رازی نے لکھا ہے: اَلْوِزْرُ مَا کَانَ یَکْرَھُہٗ مِنْ تَغْیِیْرِ ھِمْ لِسُنَّۃِ الْخَلِیْلِ الخ یعنی اس جگہ وزر سے مراد یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو سخت ملال تھا کہ عرب حضرت ابراہیمؑ کی قائم کردہ راہ

سے منحرف ہو گئے تھے اور آپؐ کو کوئی راہ نہ مل رہی تھی کہ اس گم راہی سے انھیں نکالیں.

پچھلی سورت الضُّحٰی میں وعدہ فرمایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے حق میں ہر آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہوگی (وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى) اور اللہ تعالٰی آپؐ کو ان انعامات سے نوازے گا جو آپؐ کی خوشی اور انبساط کا موجب ہوں گے۔ پیشِ نظر سورت میں اس کی تائید میں بعض دلائل دیے ہیں اور اس وعدے کی تکمیل کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم نے آپؐ کے ذکر کو رفعت اور بقاے دوام عطا کی ہے اور آپؐ کا وجود اور دعوٰی اپنے اندر غلبے کے آثار رکھتا ہے۔ دوست و دشمن کی توجّہ آپؐ کی طرف ہے۔ ہر مجلس اور ہر نادیہ میں آپؐ کا ذکر ہے۔ یہ تو ابتدائی حالت تھی اور اب دیکھ لیجیے کہ روے زمین کا کوئی ناحیہ، کوئی گوشہ، کوئی حصّہ ایسا نہیں جہاں دن اور رات کے ہر ثانیے میں کہیں نہ کہیں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی دعوت کا اعادہ نہ ہوتا ہو، درود وسلام کی صدائیں نہ اٹھتی ہوں۔ یہ سب وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کی روشن براہین وشواہد نہیں تو اَور کیا ہیں؟ آج اس پاک وجود کے سوا کون سا فرد ہے جسے عالم انسانیت میں آج تک یہ رفعتِ ذکر نصیب ہوئی ہو۔ رات کے ہر حصّے میں آپؐ پر درود بھیجنے والے اور آپؐ کا نام بلند کرنے والے موجود ہیں۔ سورت کے آخر میں یہ پیشگوئی ہے کہ اسلام پر دو دفعہ مصیبت اور تنگی کا زمانہ بھی آئے گا، مگر ہر دفعہ عُسر کے بعد یُسر یقینی ہے؛ (دو مرتبہ دہرانے کا ایک مقصد تاکید ہے (روح المعانی)۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اسلام پر ایک دَورِ عُسر کا آئے گا اور اس کے ساتھ دو دور یُسر کے ہوں گے (الرازی) بلکہ جب بھی اسلام کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی اللہ تعالٰی اپنی جناب سے انھیں دُور کرنے کے سامان پیدا فرما دے گا۔ آخر میں مسلسل جدوجہد کی تلقین کی ہے تاکہ اسلام غیر متناہی ترقیات حاصل کرتا چلا جائے.

مآخذ: (۱) ابن جریر؛ (۲) روح المعانی؛ (۳) البحر المحیط؛ (۴) السیوطی: الاتقان، قاہرہ ۱۳۶۸ھ؛ (۵) الرازی: مفاتیح الغیب [بذیلِ سورۃ].

(ادارہ)

⊗ **اَلاِنْشِقاق**: قرآن مجید کی چوراسیویں سورت کا نام۔ اس میں ایک رکوع اور پچیس آیتیں ہیں۔ یہ ہجرت سے پہلے ابتدائی مکی زمانے میں نازل ہوئی (الاتقان).

اِنْشِقاق کا لفظ شَقّ سے بابِ اِنْفعال ہے اور شَقَّ الشَّیْئَ کے معنی ہیں چیز میں شگاف کر دیا، اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اِنْشَقَّ الْبَرْق کے معنی ہیں بجلی بادلوں سے کوندتی ہوئی نکل گئی (لسان العرب، تاج العروس واقرب الموارد، تحت مادّہ)۔ پس انشقاق کے معنی ہیں پھٹ جانا اور اس کے پھٹنے سے دوسری چیز جو اس کے پیچھے ہو اس کا نظر آنے لگنا اور ظاہر ہو جانا.

اس سورت میں قیامت اور قربِ قیامت کی علامتیں بیان کی گئی ہیں اور اسلام کی ترقیات کی بشارت دی گئی ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ قیامت کے وقت آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ نزول ملائکہ کا راستہ کھل جائے گا (ابن حیان)۔ زمین پھیلا دی جائے گی اور وہ اپنے رب کی بات اور اس کے اوامر و نواہی سنے گی (ابن حیان)۔ جو کچھ اس میں ہے وہ اسے نکال پھینکے گی اور خالی ہو جائے گی (روح المعانی)۔ پھر بتایا کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ اپنے رب کی طرف زور لگا کر جائے پھر اس سے ملے (لیکن سب لوگوں کی یہ فطرت پوری طرح اس عالم میں ظہور پذیر نہیں ہوتی)، اس لیے ضروری ہے کہ دوسرے عالم میں اس کی بالیدگی کا سامان کیا جائے۔ اس کے بعد قیامت پر چند دلائل دیے ہیں اور احوال قیامت کا ذکر ہے.

اس سورت میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے زمانے کی ترقّی اور اس کے مختلف ادوار کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے البخاری میں منقول ہے کہ اس سورت کی آیت لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ذکر ہے (کتاب التفسیر) اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی کفّار سے جنگوں اور فتوحات کا بیان ہے (الرازی؛ البحر المحیط) اور بتایا ہے کہ آپؐ کا اَمر بتدریج ترقی کرے گا، یعنی پہلے مغلوبیت کی حالت ہوگی، پھر برابری کی، پھر غلبے کی اور اس طرح اسلام ترقی کرتے کرتے تمام ظلمتوں کو محو کر دے گا اور بدرِ کامل کی طرح ہو جائے گا اور کفّار کو دنیا اور آخرت میں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا.

مآخذ: (۱) البخاری: کتاب التفسیر؛ (۲) احمد: مسند، ۶: ۴۷، ۹۱، ۱۰۸، ۱۲۷، ۱۸۵، ۲۰۶؛ (۳) ابن حیان: البحر المحیط، ان آیات کے تحت جن میں بعض انصاب کا ذکر ہے؛ (۴) الآلوسی: روح المعانی، ان آیات کے تحت جن میں بعض انصاب کا ذکر ہے؛ (۵) الرازی: فتوح الغیب، ان آیات کے تحت جن میں بعض انصاب کا ذکر ہے؛ (۶) الزمخشری: کشاف، ان آیات کے تحت جن میں بعض انصاب کا ذکر ہے.

(ادارہ)

اَنْصاب: یہ نُصُب کی جمع ہے (اقرب)۔ ایک جمع نُصُب بھی ہے، جس ⊗ کا مفرد نَصِیب ہے (لسان)۔ جمع کی ان دونوں صورتوں کا استعمال قرآن مجید میں موجود ہے (۵[المائدۃ]: ۳؛ ۷۰[المعارج]: ۴۳)۔ نَصْبٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا قائم کرنا، بلند کرنا، اونچا کرنا۔ اَنْصَاب کے معنی میں صاحبِ تاج العروس نے لکھا ہے: كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، یعنی ہر وہ چیز اَنْصَاب میں داخل ہے جس کی اللہ تعالٰی کے سوا پوجا کی جائے۔ اسی لیے اَنْصَاب کے معنی ''اوثان'' اور ''اصنام'' بھی کیے گئے ہیں، یعنی بُت۔ اس طرح یہ لاطینی لفظ deus اور انگریزی god کے ہم معنی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ فرق کیا ہے کہ اَنْصاب انسانی شکل پر لکڑی یا دھات کے بنے ہوئے ہوں تو انھیں صَنَم اور پتھر وغیرہ کے ہوں تو وَثَن کہتے ہیں (یاقوت، ۴: ۹۱۴؛ ابن الکلبی: کتاب الاصنام، ص ۵۳)۔ اَلثُّقَیْفِی کا قول ہے: النُّصُب صَنَمٌ اَو حَجَرٌ و كانت الجاهلية تَنْصِبُهُ وَ تَذبَحُ عِنْدَهُ، فَيَحْمَرّ لِلدَّمِ (بحوالہ لسان العرب)، یعنی قبل اسلام عربوں میں اَنْصَاب کا تصوّر یہ تھا کہ کوئی

بت یا ان گھڑا پتھر ہو جسے گاڑ لیا جائے، اس پر قربانیاں کی جائیں اور ان قربانیوں کا خون لنڈھا کر اسے سرخ کر دیا جائے۔ انصاب پر جو قربانیاں دی جاتی ہیں انھیں عَتائِر کہتے تھے، جس کا مفرد عَتِیْرَۃٌ ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ کعبے کے گرد جو پتھر گاڑ رکھے تھے اور جن پر قربانیاں کی جاتی تھیں وہ انصاب کہلاتے تھے (تحت ن ص ب)۔

دنیا کی ہر قوم میں بت پرستی کا رواج رہا ہے۔ عرب بھی اس شرک میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر گھر میں بت موجود تھے (الاَزرَقی، ص ۷۸)۔ سفر پر جاتے اور کوئی بت ساتھ نہ رکھتے تو آٹے کا پُتلا سا بنا کر ہم راہ رکھ لیتے تھے۔ کسی جگہ پڑاؤ ہوتا تو چار پتھر ڈھونڈ لاتے۔ تین پتھروں کا چولھا بناتے اور چوتھے کو، جو نسبتہً خوب صورت ہوتا، بطورِ بت کام میں لاتے اور چلتے وقت چاروں پتھر وہیں چھوڑ جاتے (ابن الکلبی: کتاب الاصنام، ص ۳۳)۔ ابن الکلبی نے عربوں کی بت پرستی کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں: وَاسْتُهْتِرَت العَرَبُ فِی عِبَادَةِ الاَصْنام (ابن الکلبی، ص ۳۳)، یعنی عرب بت پرستی کے بڑے ہی والہ وشیدا تھے۔ افراد کی طرح ہر قبیلے کا بت بھی جدا تھا۔ کچھ بت عمومی عظمت کے حامل تھے۔ خود خانۂ کعبہ کے اندر اور حرمِ کعبہ میں سینکڑوں بت رکھے ہوئے تھے۔ ظہورِ اسلام کے وقت وہاں تین سو ساٹھ بت تھے، گویا ہر دن کے لیے نیا بت تھا۔

بعثتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا سب سے اہم مقصد شرک کا ابطال اور توحید کا قیام تھا، اس لیے اسلام نے عبادتِ اصنام اور بت پرستی کی ہر شکل کو مٹایا۔ سرزمینِ عرب سے خود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ ہی میں ایک ایک کر کے تمام اَنصاب واَصنام ختم کر دیے گئے۔ خود حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زندگی بعثت سے پہلے بھی شرک اور بت پرستی کی ہر آمیزش سے پاک وصاف تھی اور بعثت کے بعد بھی آپؐ نے بڑے زور سے انصاب کی بے حقیقتی کا اظہار فرمایا، مثلاً چند بتوں کا بطور مثال ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے: اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَی الْاَنْفُسُ (۵۳[النجم]: ۲۳)۔

عربوں میں بت پرستی کا آغاز علامہ اَزرَقی کے قول کے مطابق (تاریخ اخبار مکہ، ص ۱۲) یوں ہوا کہ جب مکّے کا کوئی باشندہ سفر پر جاتا تو حرم کی عظمت کے نقطۂ نگاہ، نیز مکّے اور کعبے سے محبت کے باعث وہاں کا کوئی پتھر ساتھ رکھ لیتا اور جہاں پڑاؤ ڈالتا اس پتھر کو گاڑ کر اس کے گرد اسی طرح طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کا طواف کیا جاتا تھا۔ نسلاً بعد نسلٍ یہی صورت حال زیادہ سے زیادہ شدّت اختیار کرتی گئی۔

مکّے میں بتوں کی باقاعدہ پوجا کا بانی عمرو ابن لُحَیّ ہے (مسلم، کتاب الجنۃ)۔ اس نے سرزمینِ حِیرَہ کے مقام ہِیت سے ہُبَل نام بت لا کر کعبے میں رکھا (الازرقی، ص ۵۸) اور اس کی عبادت کی تلقین کی۔ بعض کے نزدیک سب سے پہلے اسے خُزَیمہ بن مُدرِکہ نے نصب کیا (ابن الکلبی، ص ۲۸)۔ بعد میں بت پرستی اتنی بڑھ گئی کہ انبیاے بنی اسرائیل اپنی قوم کے سامنے عربوں کی بت پرستی کو بطورِ تمثیل پیش کرتے تھے۔ یہود نے عربوں کو توحید کی طرف کھینچنے کی کوشش کی، لیکن یمن کے ایک حصّے کو چھوڑ کر وہ عموماً ناکام رہے۔ عیسائی پانچ صدیوں تک عرب میں عیسائیت پھیلانے کی کوشش کرتے رہے۔ خود پولوس اس سرزمین میں پہنچا، لیکن بجز قلیل تعداد کے کسی نے مسیحیت قبول نہ کی۔ اس پر شام، مصر اور حبشہ سے بار بار حملے ہوئے، مگر عرب کے مذہب کی بنیاد شدید قسم کی بت پرستی پر قائم رہی۔ ان پر صدیوں تک نہایت سختی سے یورشیں ہوئیں، مگر ان کی اصنام پرستی میں کسی قسم کے زوال وانحطاط کے آثار ظاہر نہ ہوئے بلکہ بعثتِ نبوی کے وقت، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، گھر گھر بت خانہ بنا ہوا تھا۔

جب ہُبَل خانۂ کعبہ میں لا کر رکھا گیا تو اس کا دایاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ قریش نے سونے کا ہاتھ بنوا کر لگا دیا۔ یہ بت عقیق کا بنا ہوا تھا۔ عمرو بن لُحَیّ کی طرف جن اَور بتوں کا نصب کرنا منسوب ہے ان میں بعض یہ ہیں: اَلْخَلَصَۃ جو اسفل مکّہ میں تھا۔ اسے عرب کپڑے پہناتے، گلے میں ہار ڈالتے، غلّہ نذر کرتے، اس پر دودھ بہاتے، شتر مرغ کے انڈے لٹکاتے اور اس کے پاس قربانیاں کرتے۔ باقی بتوں کا ذکر آگے آئے گا۔

قومِ نوح کے جو بت عربوں نے اپنا لیے تھے ان کا ذکر قرآن مجید نے بھی کیا ہے: وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا ۚ (۷۱[نوح]: ۲۳) ایک روایت یہ ہے کہ ان کی پوجا بھی عمرو ہی نے شروع کرائی (کتاب الاصنام، ص ۵۴)۔

وَدّ: یہ بت دُوْمَۃ الجَنْدَل میں تھا۔ بنو مُضَر اور بنو کَلب اس کے خاص پجاری تھے۔ غزوۂ تبوک سے واپسی پر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حضرت خالدؓ بن ولید کو دُوْمَۃ الجَنْدَل بھیجا اور انھوں نے یہ بت توڑ پھوڑ دیا۔ ابن الکلبی نے لکھا ہے کہ میں نے مالک بن حارِثہ سے وَدّ کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا: كَانَ تِمْثَالُ رَجُلٍ كَاَعْظَمِ مَا یَكُوْنُ مِنَ الرِّجَالِ قَدْ ذُبِرَ عَلَیْهِ حُلَّتَانِ مُتَزِرٌ بِحُلَّةٍ، مُرْتَدٍ بِاُخْرٰی- عَلَیْهِ سَیْفٌ قَدْ تَقَلَّدَهٗ وَقَدْ تَنَكَّبَ قَوْسًا وَبَیْنَ یَدَیْهِ حُرْبَةٌ فِیْهَا لِوَاءٌ وَوَفْضَةٌ فِیْهَا نَبْلٌ (ابن الکلبی: کتاب الاصنام، ص ۵۶) یعنی اس کی شکل ایک بلند و بالا انسان کی سی تھی۔ ایک چادر تہ بند کے طور پر اسے باندھی جاتی تھی اور ایک چادر جسم کے اوپر کے حصّے پر اڑھائی جاتی تھی۔ تلوار حمائل کی ہوتی۔ کمان لٹکائی ہوتی، سامنے ایک حَرْبہ (=برتن، جس میں جھنڈا رکھا ہوتا) اور تیروں کا ترکش دھرا رہتا۔

سُواع: یہ سمندر کے کنارے یَنْبُوع میں تھا اور بنو لحیان اس کے مجاور تھے، بنو ہُذَیل بطورِ خاص اس کی عبادت کرتے تھے۔ عمرو بن العاصؓ نے اسے منہدم کیا۔

یَغُوث: سبا (مَارِب، جنوبی عرب) کے پاس جُوف نام ایک مقام میں بنو مَذْحِج، حَرِیش، بنو ہُذَیل اور بنو غُطَیف بطورِ خاص اس کے عبادت گزار تھے۔ پھر اسے نجران منتقل کر دیا گیا۔

یَعُوق: یہ یمن میں خَیْوان نام ایک مقام میں تھا، جو صنعاء کی طرف آنے

والی شاہ راہ پر واقع تھا۔ بنو ہَمْدان اور بنو خَوْلان اس کے پجاری تھے۔

نَسْر: یہ حِمْیَریوں کا بت بَلْخَع نام مقام پر تھا۔ جب حِمْیَریوں نے یہودیت اختیار کر لی تو اسے چھوڑ دیا۔

ابن الکلبی لکھتا ہے (کتاب الاصنام، ص ۵۱) وَدّ، سُواع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسْر نیک لوگ تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ان سب کی وفات ایک ہی مہینے میں ہو گئی۔ رشتے داروں کے لیے یہ بڑے ماتم کی بات تھی۔ بنو قابیل کے ایک شخص نے (جو معلوم ہوتا ہے اچھا سنگ تراش تھا) کہا اگر کہو تو میں ان کی تمثال بنا دوں، جس میں ان کی پوری شبیہ آ جائے گی۔ ہاں میں ان میں روح نہیں پھونک سکوں گا۔ چنانچہ اس نے سنگ تراشی کر کے ان کی تمثالیں بنا دیں۔ رشتے دار ان مجسموں کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ تیسری نسل میں ان کی عبادت شروع ہو گئی (کتاب الاصنام، ص ۵۱)۔

خاص عربوں کے اہم بتوں میں سے لات، مَنات، عُزّیٰ، اِساف اور نائلہ قابل ذکر ہیں۔ اوّل الذکر تین کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے، دیکھیے (۵۳ [النجم]: ۱۹)۔

لات طائف میں تھا جس کے مجاور بنو ثَقِیف تھے۔ یہ ایک مربّع پتھر تھا، جس پر ایک عمارت بھی بنا رکھی تھی۔ جاحظ نے لکھا ہے: یُضاھُوْن بِذٰلِکَ قُرَیْشًا (کتاب الحیوان، ۷: ۶۰) یعنی بنو ثَقِیف اسے قریش کے خانۂ کعبہ کا مدِّ مقابل سمجھتے تھے، حضرت مُغِیرہؓ بن شُعْبہ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم سے اسے مسمار کر کے حوالۂ آتش کر دیا۔

مَناۃ: مکّۂ معظّمہ اور مدینۂ مَنوّرہ کے راستے کی ایک بستی قُدَید کے قریب تھا۔ اَوس اور خَزْرَج خصوصًا اس کی تعظیم کرتے تھے، بلکہ رسومِ حج کی تکمیل کے لیے یہاں حاضری ضروری سمجھتے تھے اور احرام اسی جگہ پہنچ کر کھولتے تھے۔ بنو ہُذَیل اور بنو خُزاعہ بھی اس کی پوجا کرتے تھے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم جب ۸ھ میں فتح مکّہ کے لیے روانہ ہوئے تو راستے سے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کو اس کے انہدام کے لیے بھیجا۔

اَلعُزّیٰ: یہ مکّے سے شمال مشرق کی طرف ذاتُ العِرْق کے قریب حُراض نام وادی میں تھا۔ یہاں قربانی کے لیے ایک مذبح بھی تھا، جسے غَبْغَب کہتے تھے۔ عُزّیٰ کے مجاور بنو شَیْبان تھے۔ یہ دراصل ایک درخت تھا۔ حضرت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم سے حضرت خالدؓ بن ولید نے اسے کاٹ دیا۔ سب سے بڑا مقام عربوں کی نظر میں غالبًا عُزّیٰ کا تھا، پھر لات کا، پھر مناۃ کا۔

اِساف اور نائلہ: یہ دونوں بت مکّے میں تھے۔ اِساف صفا کے قریب تھا اور نائلہ مروہ کے قریب۔ کہتے ہیں فتح مکّہ کے وقت صَفا اور مَرْوَہ کے درمیان کوئی چھتیس بت تھے (الفاکہی، ص ۶)۔ جب آنحضرتؐ نے حرم کو بتوں سے صاف کرایا تو ان سب کو بھی آگ میں ڈلوا دیا۔

مندرجۂ بالا بتوں کے علاوہ ہر قبیلے کا الگ الگ بت بھی تھا۔ ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں۔ اَلیَعْبُوب: یہ گھوڑے کی شکل کا تھا۔ اس کے پجاری بنو طَیِّئ تھے۔ اس سے پہلے اس قبیلے کا ایک اَور بت تھا، جسے بنو اَسُوان ان سے چھین کر لے گئے تھے۔

اَلْفَلَس: اَلْفُلْس (الحازمی)، اَلْفِلْس (ابن دُرَید) اور اَلْفُلُس (یاقوت ۳: ۹۱۱)، یہ نَجْد کے پہاڑوں سَلْمٰی اور اَجَا کے درمیان تھا۔ سیاہ رنگ کے پتھر کو انسانی شکل میں تراش لیا گیا تھا۔ اس کے متولّی بنو بَوْلان تھے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم سے حضرت علیؓ نے اسے توڑ پھوڑ دیا۔ وہاں سے حضرت علیؓ کو دو تلواریں ملیں، جن میں سے ایک تلوار ذوالفقار تھی (ابن الکلبی، ص ۱۵)۔

باجَر: یہ بنو الاَزْد کا بت تھا۔ بنی طَیِّئ اور قُضاعہ بھی اس کی پوجا کرتے تھے۔ اس کا ایک تلفظ باجِر بھی ہے۔ ابن الاثیر نے بَاحر (بجائے حطی) قلم بند کیا ہے۔

ذوالخَلَصہ: یہ سفید سنگِ مرمر کا منقوش بت تھا، جس کے سر پر ایک تاج سا رکھا ہوا تھا۔ اس کے مجاور بنو اُمامہ بن باہِلَہ تھے۔ یہ مکّے اور یمن کے درمیان تَبالہ نام ایک مقام میں تھا۔ عام الوفود میں حضرت جریرؓ بن عبداللہ البَجَلی نے مدینے سے واپسی پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے اسے توڑ پھوڑ کر آگ لگا دی۔

ذوالکَفَّیْن: یہ دَوس اور خُزاعہ کا بت تھا، جسے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم سے طُفَیلؓ بن عمرو الدَّوسی نے نذرِ آتش کر دیا (ابن الکلبی، ص ۳۷)۔ المحبر (ص ۳۱۸) میں ہے کہ اسے عمرو بن حُمَمَہ الدَوسی نے توڑا۔

ذوالشَّرٰی: یہ بنو حارث کا بت تھا۔

اُقَیْصِر: یہ شام کی سرحد پر قُضاء، جُذام، یمن کے عامِلَہ بن سبا اور غَطَفان کا بت تھا۔

نُہْم: بنو مُزَیْنَہ کا بت تھا، ظہورِ اسلام کے بعد اس کے پجاریوں نے پہلے خود ہی اسے توڑ پھوڑ دیا اور پھر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔

سَعْد: جدّہ کے قریب محض ایک لمبوترا پتھر تھا۔

عائم یا عایم: اَزْدالسَّراۃ کا بت تھا۔

سُعَیْر: اس کے پجاری بنو عُنَزہ تھے۔

عُمْیانُس یا عمّ اَنَس: بنو خولان کا بُت۔

تَیْم: بنو تمیم کا بُت۔

جِہار: بنو ہَوازِن کا بُت۔

اُوال: بَکْر و تَغْلِب کا بت۔

مُحَرِّق: بنو بکر بن وائل کا بُت۔

بعض بتوں کے صرف نام معلوم ہیں۔ جیسے بَجَّہ، جَرِیْش یا جُرَیْش، الجَلْد، الشارِق، کُسَیْعَۃ، مدان، عَوْف یا اُرَیْل، جَبْہَۃ، الأَشْہَل، البَعِیْم، الدّار، الجَلْسَد، ذوالرَّجَل، الشَّمْس، ضِمار، المُرْحَب (یہ حضرموت میں تھا)، مِنْہَب۔ مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت میں ہے: مَعَ کُلِّ صَنَمٍ جِنِّیَّۃٌ (۵: ۱۳۵) کہ عرب کے ہر بت کے ساتھ ایک جِنّی کا تصوّر بھی موجود تھا۔ ان بتوں کے متعلّق دیکھیے تاج العروس؛ لسان العرب؛ صحاح؛ جاحظ: التربیع و التدویر؛ مسعودی: مُروج الذّھب

وغیرہ).

بلادِ دادر میں جواہرات سے مرصّع الزَّ ورنام سونے کا ایک بُت تھا۔ اس کی آنکھیں یاقوت کی تھیں، جبل الزُّون پر رکھا ہوا تھا۔ عہدِ عثمانی میں حضرت عبدالرحمٰن بن سَمُرہؓ نے اسے توڑ پھوڑ کر سونا اور جواہرات متولّیوں کو دیتے ہوے کہا ہمیں اس دولت کی ضرورت نہیں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بت کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے (یاقوت، ۲:۵۴۲)۔ فتح مکہ کے موقع پر خود آنحضرتؐ نے حرم کے تمام بت تڑوا کر انھیں جلوا دیا (الازرقی، ص ۷۶).

آ، لائڈن (طبع اوّل ۱:۳۸۰) کا مضمون نگار لکھتا ہے: بہت امکان ہے کہ بہت ابتدا ہی میں یونانیوں نے جنوبی عرب کے تاجروں سے اپالو (Apollo) اور اس کی ماں لات (Lelo) وغیرہ سے بتوں کا تصوّر اخذ کیا ہو.

مآخذ: (۱) ابن السائب الکلبی: کتاب الأصنام، قاہرہ ۱۹۲۴ء؛ (۲) جاحظ: کتاب الأصنام؛ (۳) السُّہَیلی: الرَوْض الأُنف؛ (۴) یاقوت: مُعجم الأُدَباء؛ (۵) دمیری، حیوۃ الحیوان؛ (۶) الاَزْرَقی: اخبار مکۃ، غوطا ۱۸۵۸ء؛ (۷) محمد بن اسحٰق الفاکہی: تاریخ مکۃ؛ (۸) محمد بن احمد الفاسی: شفاء الغَرام؛ (۹) محمد بن امین ابن ظُہیرہ: الجامع اللطیف؛ (۱۰) عبدالقادر البغدادی: خِزانۃ الأدب؛ (۱۱) محمود شکری آلوسی: بلوغ الارب فی احوال العرب، (آلوسی، یاقوت، البغدادی نے اپنی معلومات ابن الکلبی سے حاصل کی ہیں)؛ (۱۲) ابن القیّم: اِغاثَۃ اللَہفان؛ (۱۳) W. Robertson Smith: *The Religion of the Semites*، طبع دوم، لنڈن ۱۸۹۴ء؛ (۱۴) جواد علی: العرب قبل الاسلام؛ (۱۵) عمر فروخ: تاریخ الجاھلیۃ؛ (۱۶) محی الدین العطار: بلوغ الارب، عبیہ (لبنان) ۱۳۱۹ھ، ص ۲۵۳ ببعد، ۸۹ ببعد؛ (۱۷) ابن حزم: جمھرۃ انساب العرب، طبع عبدالسلام، مصر ۱۹۶۲ء، بہ امداد اشاریہ؛ (۱۸) تفسیر المنار، ۸:۵ ۱۴ ببعد؛ (۱۹) محمد بن حبیب: کتاب المُحَبّر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۶ء، ص ۳۱۵ ببعد.

(عبدالمنّان عمر و ادارہ)

⊗ **اَنْصار:** یثرب (آگے چل کر مدینۃ النبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) کے دو قبیلوں اَوْس اور خَزْرَج کا اسلامی تسمیہ (بمقابلۂ مہاجرین مکّہ)، بفحوائے وَالَّذِینَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا (۸ (الاَنْفال): ۷۲)، ان سے بشمول مہاجرین بحیثیت صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم (مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ ۭ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ، ۴۸ [الفتح]: ۲۹) امّت اسلامیہ کی تشکیل ہوئی۔ پھر یہ شرف بھی انصار ہی کو ملا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کی دعوت پر ہجرت فرمائی۔ [امام بخاری نے کتاب مناقب انصار کا آغاز قرآن مجید کی اس آیت سے کیا ہے: وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِہِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْہِمْ (۵۹ [الحشر]: ۹)۔ حضورؐ یثرب تشریف لائے تو اسلام کو وہ خطۂ ارض مل گیا جہاں فرد اور جماعت کی زندگی میں اس کی ترجمانی ہونے لگی، یعنی اقامتِ دین کا عمل شروع ہوا اور اوّلین اسلامی معاشرہ وجود میں آیا.

انصار جمع کا صیغہ ہے بمعنی مددگار، لیکن یہاں مدد سے مراد ہے دین کی مدد۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار (= انصار) بنو جیسے عیسیٰؑ ابن مَرْیَم نے حواریوں سے کہا تھا کون اللہ کے راستے میں میرے مددگار (انصار) ہیں (۶۱ [اَلصَّف]: ۱۴)۔ پھر ارشاد ہوتا ہے ''جو لوگ ایمان لائے جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کیا، جنھوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی وہ سب آپس میں رفیق ہیں (۸ [الانفال]: ۷۲)۔ چنانچہ اَوس وخَزْرَج ایمان لائے تو انھوں نے یہ دونوں ارشاد بوجہ احسن پورے کر دکھائے۔ انھوں نے دین کی مدد کی، اللہ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انصار بنے، مہاجرین کو پناہ دی، ہر طرح سے ان کے رفیق اور مدد گار ثابت ہوے اور دین کی نصرت میں مال اور جان سے جہاد کیا۔ بلاشُبہہ وہ ان دونوں آیتوں کا مصداق ہیں ایک کے بالمعنی، جس میں مہاجرین اور وہ لوگ بھی شریک ہیں جنھیں دولتِ ایمان حاصل ہوئی اور دوسری کے بالخصوص اور واقعۃً۔ [غُیْلان بن جَریر کہتے ہیں میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ آپ لوگ انصار کے لقب سے خود اپنے آپ کو پکارتے تھے یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ لقب دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ لقب دیا ہے (البخاری: کتاب مناقب الانصار، باب ۱)].

اَوس وخَزْرَج ان دو قبیلوں کا نام ہے جو صدیوں سے یثرب میں آباد تھے اور یثرب جیسا کہ ہمیں معلوم ہے مکّۂ معظّمہ سے شمال کی جانب تقریباً اڑھائی سو میل پر اس تجارتی شاہراہ کے قریب واقع ہے جو یمن سے شام کو گئی ہے۔ ان کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ بنوغسّان کی طرح وہ بھی دراصل قَحْطانی الاصل اور بنوکہلان کی ایک شاخ ہیں۔ ایک اَور تحقیق یہ ہے (دیکھیے سیّد سلیمان: ارض القرآن، ج ۲، طبع چہارم) کہ شمالی عرب کے دوسرے قبائل (العرب المُستعربہ) بالخصوص اہلِ مکّہ کی طرح اَوس وخَزْرَج بھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ان کا اپنا دعوٰی یہ تھا کہ بنوغسّان کی طرح وہ بھی یمن سے حجاز آئے اور یثرب میں آباد ہو گئے۔ بنوغسّان نے شمالی عرب کا رخ کیا لیکن اوس وخزرج حجاز ہی میں بس گئے۔ خیال یہ ہے کہ ان قبائل کی ہجرت کا سبب وہ سیلاب (سیل عَرِم) تھا جس سے سبا کا علاقہ تباہ و برباد ہو گیا تھا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے (۳۴ [سبا]: ۱۵-۱۶) مگر پھر اوس وخزرج کا قریش مکّہ سے بھی رشتہ ناتا تھا چنانچہ مُنذِر بن حرام خزرجی (حضرت حَسّان بن ثابتؓ کے دادا) نے اپنا سلسلۂ نسب نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام سے ملایا تھا۔ البخاری (بحوالۂ ارض القرآن، ۲:۸۵، طبع چہارم) کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جب انصار سے حضرت ہاجرہؑ کا قصّہ بیان کیا تو یہ بھی کہا کہ وہ تمھاری ماں ہیں۔ جس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ اوس وخزرج دراصل عدنانی الاصل ہیں اور ہمیشہ سے یثرب میں آباد تھے (نیز دیکھیے وفاء الوفاء، ۱:۱۱۶ ببعد)۔ بہرحال جیسے جیسے زمانہ گزرا وہ متعدّد شاخوں میں بٹ گئے۔ اسلام کا ظہور ہوا تو یثرب میں بھی، جس کے متعدد نخلستان اوس وخزرج اور یہود کے درمیان بٹے ہوے تھے، ایک شہری ریاست کا سا نظام قائم تھا لیکن بغایت نامکمّل اور ابتدائی حالت میں کہ اس کی کوئی معیّن شکل ہمارے سامنے نہیں آتی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ اوس وخزرج یہود کے زیرِ اثر آ گئے، جن کی متعدد

بستیاں شمالی عرب میں پھیلی ہوئی تھیں گو بالآخر بنوغسّان کی مدد سے انھوں نے یہود کا زور توڑ ڈالا اور اپنے وطن میں پھر سیادت حاصل کر لی، لیکن یہود کی دست برد سے نجات ملی تو خانہ جنگی کا شکار ہو گئے، جس کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ ایک کے بعد دوسری لڑائی ہوئی، جن کے نام کتبِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ آخری لڑائی بُعاث ہے، جس میں طرفین کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور جس کے پیشِ نظر انھوں نے فیصلہ کیا کہ عبداللہ بن اُبَیّ کو اپنا سردار تسلیم کر لیں تاکہ کسی طرح صلح و امن نصیب ہو لیکن حالات نے کوئی معیّن شکل اختیار نہیں کی تھی کہ اسلام کے آفتابِ عالم تاب کی شعاعیں یثرب میں جا پہنچیں اور دیکھتے ہی دیکھتے صورتِ حالات بدل گئی۔

بظاہر اس واقعہ کی ابتدا نہایت معمولی تھی جو آگے چل کر عظیم انقلاب کا باعث ہوا۔ عرب جاہلیت میں قاعدہ تھا کہ جیسا جیسا موقع ہوتا قبائل ایک دوسرے کے حلیف بن جاتے۔ قبیلۂ اَوس نے بھی جب خَزرج کے مقابلے میں اپنے آپ کو ضعیف پایا تو کوشش کی کہ قریش کو اپنا حلیف بنائیں، لہٰذا انھوں نے ایک سفارت قریش کی طرف بھیجی۔ آنحضرتؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو ارکانِ سفارت کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی، جس پر اَیاس بن مُعاذ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: خدا کی قسم یہ کام اس سے بہتر ہے جس کے لیے ہم آئے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہمیں اسلام قبول کر لینا چاہیے (ابن ہشام، سیرت، طبع وُسٹنفلڈ، ص ۲۸۵)۔ یہ واقعہ سنہ ۱۰ نبوی کا ہے۔ اس سے پہلے سُوَید بن الصامت بھی، جس کی شاعری اور جنگ جوئی کا شہرہ تھا، حج کے موقع پر حضور رسالت مآبؐ سے قرآن پاک سُن کر اسلام کا معتقد ہو چکا تھا (الطبری، ۱:۱۲۰۸، البدایۃ و النہایۃ، ۳: ۱۴۷ ببعد)۔ چنانچہ بُعاث کی لڑائی میں جب خزرج کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کی قوم بھی جانتی تھی کہ وہ اسلام قبول کر چکا ہے (ابن ہشام، طبع وُسٹنفلڈ، ص ۲۸۵؛ ابن الأثیر: الکامل، ۲:۴۵، مطبع ازہریہ، ۱۳۰۱ھ)۔

یہ ابتدا تھی اوس و خزرج کی حضور رسالت مآبؐ سے ربط و ضبط کی۔ لیکن ان کے باقاعدہ قبولِ اسلام کی ابتدا آنحضرتؐ کی نبوت کے گیارھویں برس ہوئی۔ جیسا کہ معلوم ہے نبی اکرمؐ ایّامِ حج میں ہر سال قبائلِ عرب سے ملتے اور تبلیغِ اسلام فرماتے، چنانچہ سنہ ۱۱ نبوی میں قبیلۂ خزرج کے چھے افراد سے عَقَبہ میں آپ کی ملاقات ہوئی، جنھوں نے وہیں اسلام قبول کر لیا۔ ان کے نام یہ ہیں: [مالک] ابوالہَیثَم بن [التَّیِّہان]، ابواُمامہ اَسعَد بن زُرارہ، عَوف بن الحارث، رافع بن مالِک، قُطبَہ بن عامِر بن حَدِیدہ اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم (دیکھیے ابن ہشام، طبع وُسٹنفلڈ، ص ۲۸۶)۔ [بعض روایات میں ابوالہَیثَم کے بجائے عُقبہ بن عامر بن نابی کا نام ہے (ابن سعد، ۱/۱:۱۴۷)۔ یہ انصار کے اسلام کی ابتدا تھی۔] اگلے برس اسی موسم میں بیعت عَقَبۂ اُولیٰ ہوئی، یعنی نبوت کے بارھویں برس میں، جس میں بارہ افراد شامل تھے۔ ان میں سے پانچ تو وہی گزشتہ سال والے مُصدِقین تھے اور سات نئے تھے۔ اسی موقع پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے انصار کی درخواست پر حضرت مُصعَبؓ بن عُمَیر کو بحیثیتِ معلّم ان کے ساتھ روانہ کیا۔ حضرت مُصعَبؓ یثرب پہنچے تو ان کی کوششوں سے روز بروز اسلام پھیلنے لگا۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ نے اسی زمانے میں حضرت مُصعَبؓ ہی کے ذریعے اسلام قبول کیا۔

اگلے برس یعنی ۱۳ نبوی میں بیعت عَقَبۂ ثانیہ ہوئی، جس میں حضرت عبّاس بھی موجود تھے [اس میں پچھتر افراد شریک تھے، جن میں سے دو عورتیں تھیں، ابن ہشام، ۲:۴۹، طبع عبدالحمید]۔ روایت اگرچہ یہ ہے کہ حضرت عبّاس ہی نے اوس و خزرج سے کہا تھا کہ محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تمھارے پاس آنا چاہتے ہیں اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو بہتر ورنہ ابھی جواب دے دو۔ جس پر حضرت البرَاءؓ بن مَعْرُور نے کہا: ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں۔ مگر وہ اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ حضرت ابوالہیثمؓ نے کہا یا رسول اللہ! ایسا تو نہ ہوگا کہ آپ کو قوّت و اقتدار حاصل ہو تو آپ ہمیں چھوڑ کر پھر مکّۂ معظّمہ واپس آ جائیں۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں میرا اور تمھارا خون ایک ہو چکا ہے۔ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے (ابن ہشام، ص ۲۹۷، طبع وُسٹنفلڈ، ص ۱۸۶)۔

بیعت ہو گئی تو آنحضرتؐ نے اوس و خزرج میں بارہ نقیب مقرّر کیے، جو سب کے سب سردارانِ قبائل تھے، جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے ساتھ قبائل نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔ نُقبا کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ابن ہشام (حوالۂ مذکور)۔

بیعت عَقَبۂ ثانیہ کی خبر مکّۂ معظّمہ میں پھیلی اور قریش کو معلوم ہوا کہ اہلِ یثرب نے آنحضرتؐ کو یثرب آنے کی دعوت دی ہے تو انھوں نے آپؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ لہٰذا آنحضرتؐ نے مکّۂ معظّمہ سے ہجرت [رَکِ بان] فرمائی اور سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے اوّل یثرب سے باہر قُبا میں (یثرب سے تین میل کے فاصلے پر بسمت جنوب) قیام فرمایا۔ سفر کی کلفت دور ہوئی تو یثرب کا رخ کیا۔ انصار ہمہ تن انتظار تھے۔ ان کا شوق لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا تھا۔ خواتین نے ''طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا'' (ہم پر چاند طلوع ہوا) کا ترانہ گایا۔ لڑکیاں دف بجا بجا کر آپ کا خیر مقدم کرتیں اور کہتیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِی النَّجَّار
یَا حَبَذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَار

(ہم بنونجار کی لڑکیاں ہیں، محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کیسے اچھے ہمسایہ ہیں۔)

حضورؐ نے یثرب میں قدم رکھا تو ہر کوئی متمنّی تھا کہ آپؐ کی مہمان داری کا شرف حاصل کرے۔ بالآخر یہ شرف حضرت ابوایّوب انصاریؓ کو حاصل ہوا۔ آپؐ نے ان کی دعوت قبول فرمائی اور جب تک مسجدِ نبوی اور ازواجِ مطہراتؓ کے حجرے تعمیر نہیں ہو گئے انھیں کے ہاں قیام فرمایا۔ مسجد تعمیر ہو رہی تھی تو یہ الفاظ مسلمانوں کی زبان پر تھے:

لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْآخِرَۃ
اَللّٰھُمَّ ارْحَمِ الْاَنْصارَ و المُھَاجِرَۃ
(ابن ہشام)

یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ مسجد نبوی دو یتیم انصاری بچوں کی زمین پر تعمیر ہوئی تھی، جس کی قیمت ان کے انکار کے باوجود ادا کر دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار کے دلوں میں اسلام کی محبت کس قدر راسخ ہو چکی تھی اور وہ اس کی راہ میں ہر طرح کے ایثار و قربانی پر آمادہ تھے۔ اسلام سے ان کا قبائلی تشخص بدلا۔ ان کے شہر کا نام بدلا۔ ان کی زندگی بدلی اور وہ سرتاسر اسلام کے سانچے میں ڈھل گئے۔

اسلام کی تاریخ میں واقعۂ ہجرت سے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ اسلام کو ایک خطۂ ارض کی ضرورت تھی، جہاں فرد اور جماعت کی زندگی میں عملاً اس کی ترجمانی ہو سکے۔ ہجرت سے یہ ضرورت پوری ہوئی، اسلامی ریاست وجود میں آئی اور آنحضرتؐ نے اس کا اوّلین دستور تیار کیا، جو کتب حدیث و تاریخ میں اب تک محفوظ ہے [ابن ہشام، ۲:۱۱۹، طبع عبدالحمید]۔ یہ ابتدا تھی اس نظامِ اجتماع و عمران کی جو اسلام کا مقصود ہے۔ اس نظامِ اجتماع و عمران کا تقاضا تھا کہ انصار و مہاجرین کے مقامی اور نسبتی رشتوں کے مقابلے میں محکم دینی و روحانی رشتہ قائم ہو؛ لہٰذا آنحضرتؐ نے اس سلسلۂ مؤاخات کی ابتدا فرمائی جس نے انصار و مہاجرین کو اس طرح یک جا کر دیا جیسے وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ آپؐ مسجدِ نبوی کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انصار کو طلب کیا اور مہاجرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ تمھارے بھائی ہیں۔ ایک طرف انصار تھے کہ ان کے پاس جو کچھ تھا انھوں نے بے دریغ مہاجرین کی خدمت میں پیش کر دیا، یہ تھا ان کا جذبۂ ایثار و خلوص و محبت، دوسری جانب مہاجرین تھے ان کی غیرت، خودداری اور قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے انصار کے ایثار و قربانی سے صرف اس حد تک فائدہ اٹھایا جس حد تک وہ مجبور تھے۔

مدینۂ منوّرہ میں اسلام کی اشاعت اور اس کی تقویت و استحکام بالفاظ دیگر اسلامی ریاست کے قیام سے وہ مرحلہ بھی آ گیا جس میں مہاجرین و انصار کو ایک ایسی کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا جس میں ہر طرح مالی اور جانی قربانی ناگزیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ جہاد فی سبیل اللہ کی نوبت آئی اور سلسلۂ غزوات کا آغاز ہوا تو مہاجرین کی طرح انصار نے بھی ہر غزوے میں جان و مال سے حصّہ لیا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر جب آنحضرتؐ نے مہاجرین و انصار سے خطاب فرمایا اور انصار بظاہر خاموش رہے حتّٰی کہ آنحضرتؐ کو ان کی رائے دریافت کرنا پڑی تو معلوم ہوا کہ ان کا خیال تھا حضورؐ شاید مہاجرین سے مخاطب ہیں، کیونکہ انصار تو ہر حالت میں آپؐ کی نصرت اور تائید کا عہد کر چکے تھے؛ چنانچہ انھوں نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا خطاب ہم سے ہے؟ ہم تو ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہیں۔ انصار بدر میں شریک ہوئے اور ابوجہل ایسا دشمنِ اسلام دو انصاری نوجوانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ انھوں نے بغیر کسی غرض یا ذاتی منفعت کے ہر نازک موقع پر نبی اکرمؐ کا ساتھ دیا۔ ان کے ایثار کا یہ عالم تھا کہ طائف کے محاصرے کے بعد جب آنحضرتؐ نے جِعْرانہ میں قیام فرمایا اور حُنَین اور اَوْطاس کا مالِ غنیمت مؤلّفۃ القلوب میں تقسیم کیا تو انصار میں بعض کو خیال گزرا کہ رسول اللہؐ نے جو بمقابلۂ قریش ان کا حصّہ کم رکھا ہے تو اس کا مطلب کہیں یہ تو نہیں کہ حضورؐ ان کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں، لہٰذا جِعْرانہ ہی میں حضور رسالت مآبؐ نے انصار کے مجمع میں وہ خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس کا خاتمہ آپؐ نے ان الفاظ پر کیا تھا کہ اے انصار کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ اونٹ بکریاں تو لوگوں کے حصّے میں آئیں لیکن محمد رسول اللہ کو تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ انصار نے حضورؐ کے اس ارشاد کو سنا تو بے اختیار آب دیدہ ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں آ گیا کہ آنحضرتؐ نے مؤلّفۃ القلوب سے کوئی ترجیحی سلوک نہیں کیا بلکہ ایک اَمر ضروری تھا کہ مفتوحین کی دل جوئی کی جائے۔ وہ خوش تھے کہ حضور علیہ الصلٰوۃ والسلام ان کے ساتھ مدینۂ منوّرہ واپس جا رہے ہیں۔ انھوں نے اسلام کی تائید اور نصرت کا بیڑا اٹھایا اور وہ اس کی راہ میں ہر قربانی کے لیے تیار تھے، جس کی شہادت خود اللہ نے دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۵۹[الحشر]:۹)۔ انھیں مہاجرین سے محبت ہے۔ مہاجرین کو جو کچھ دیا جائے اس سے وہ دل تنگ نہیں ہوتے اگرچہ انھیں خود فاقہ برداشت کرنا پڑے۔ جس نے اپنے نفس کو لالچ سے محفوظ رکھا وہ فلاح پانے والوں میں سے ہے۔ آنحضرتؐ نے بھی وفات سے قبل مہاجرین کو بالخصوص وصیت کی کہ انصار سے اچھا برتاؤ کریں۔ ارشاد ہوا مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ لیکن انصار کم ہوتے جائیں گے۔ انھوں نے مجھے پناہ دی سو اپنے محسنوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آؤ اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرو (ابن ہشام، طبع وُسٹِنْفِلْڈ، ۱۸۶۰ء، ص ۱۰۷)۔ انصار نے آگے چل کر ایران و روم کے خلاف جنگوں میں حصّہ لیا۔ وہاں بعض اہم واقعات سے ان کا خاص تعلق ہے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوایّوب انصاریؓ [رک بآں] کا نام سرفہرست ہے، جنھیں آنحضرتؐ کی مہمان داری کا شرف حاصل ہوا اور جو امیر معاویہؓ کے زمانے میں قسطنطینیہ کے حملے میں شریک تھے، وہیں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ پھر حضرت سعدؓ ابن مُعاذ ہیں، جنھیں آنحضرتؐ نے بنوقُریظہ کے معاملے میں حَکَم بنایا۔ حضرت حسّان بن ثابتؓ کا یہ شرف کیا کم ہے کہ انھیں بارگاہِ نبوّت کے شاعر کا مَنْصب حاصل ہوا۔ ان کے علاوہ اَور بھی کئی نام ہیں جن سے ہم ایران و روم کی لڑائیوں میں روشناس ہوتے ہیں۔ خلافت اولٰی و ثانیہ میں بھی انصار نے انتہائی ایثار و بے غرضی سے خلفا کا ہاتھ بٹایا۔ اپنے لیے کسی خاص حیثیت یا ترجیحی سلوک کی خواہش نہیں کی۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف جب ایک طوفان مخالفت اٹھا جب بھی انصار فتنہ و فساد سے الگ رہے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی خلافت میں بھی انھوں نے دیانت داری کے ساتھ خلیفۂ وقت کا ساتھ دیا؛ پھر کربلا کے المیے پر ان کا غم و الم اور واقعہ حرّہ میں جب مُسْلِم بن عُقْبَہ مدینہ منورہ میں ایک آفت بن کر داخل ہوا ان کا صبر اور برداشت اس امر کی دلیل ہے کہ انصار خوب سمجھتے تھے امّت کے مصالح کیا ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت ایک جماعت انھوں نے امّت کی اصلاح اور فلاح و بہبود کی خاطر ہمیشہ ایک صلح پسند

روش اختیار کی۔ ایسا نہیں کیا کہ اس وقت کی سیاسی گروہ بندیوں میں کسی انتہا پسند جماعت کا ساتھ دیں.

سقیفۂ بنی ساعدہ میں البتہ انصار چاہتے تھے کہ حضرت سعد بن عُبادہؓ خلیفہ منتخب ہو جائیں لیکن ان کا یہ مطالبہ بھی حصولِ اقتدار کی خاطر نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ آنحضرتؐ کے بعد اب یہ انصار ہی کی ذمے داری ہے کہ خلافت کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لیں۔ بایں ہمہ جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی تقریروں سے یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ وقت کا اقتضا یہی ہے کہ خلیفہ کا انتخاب قریش میں سے ہو تو یہ ایک انصاری یعنی بشیر بن سعدؓ ہی تھے جنھوں نے آگے بڑھ کر انصار میں سے سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی۔ حضرت سعد بن عبادہؓ بے شک دل گرفتہ ہو کر شام چلے گئے لیکن شاید مصلحت اسی میں تھی کہ ان کا قیام مدینۂ منوّرہ میں نہ رہے۔ بالفرض انھیں حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب سے اختلاف بھی تھا تو ان کی آئندہ زندگی ان کی صلح پسندی کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔ ان کی طرف سے اَمر خلافت میں کبھی رخنہ پیدا نہیں ہوا.

مدینۂ منوّرہ اسلام کا قلب اور مرکز ہے۔ یہیں سے اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا۔ پھر فتوحات کی بدولت جب اسلام نے ایک عالم گیر طاقت کی حیثیت اختیار کی تو مدینۂ مُنوّرہ کی آبادی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ لہٰذا اس کی آبادی کا دار ومدار محض انصار اور مہاجرین پر نہ رہا۔ انصار بھی مہاجرین کی طرح اب کشورِ اسلام میں پھیل رہے تھے۔ ان کی قبائلی حیثیت کا پہلے ہی سے خاتمہ ہو چکا تھا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ بحیثیت ایک جماعت ان کا جداگانہ وجود بھی ختم ہو گیا۔ یہ صرف چند خاندان یا افراد تھے جنھوں نے اس نام کو باقی رکھا۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر بنو احمر ہیں، جنھوں نے امارتِ قرطبہ اور طوائف الملوک کے زوال کے بعد غرناطہ میں اس خانوادۂ شاہی کی بنیاد رکھی جس نے ۱۴۹۲ء تک اندلس کے انتہاے جنوب میں ہسپانوی عیسائیوں کی یلغار کو روکے رکھا اور تہذیب وتمدّن میں بھی نہایت قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ اسلامی ہندوستان میں پوربی اضلاع کے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کا دعوٰی ہے کہ وہ انصار کی اولاد ہیں۔ لہٰذا انصاری کہلاتے ہیں.

مآخذ: (۱) ابن ہشام: سیرۃ، طبع وسٹنفلڈ، ۱۸۶۰ء؛ (۲) شبلی: سیرۃ النبیؐ، ۱/۱: ۲۵۸ ببعد؛ (۳) سیّد سلیمان: ارض القرآن، ج ۲؛ (۴) قاضی محمد سلیمان: رحمۃٌ لِلعالمین، ج ۱؛ (۵) ابن الأثیر: کامل، طبع ازہریہ ۱۳۰۱ھ، [۲: ۴۴ ببعد]؛ (۶) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، تحت انصار مع تعلیقات؛ (۷) احمد: مسند، ۳: ۱۰۵، ۱۸۸، ۴۶۰-۴۶۲؛ (۸) مسلم، غزوۃ الفتح و باب الہجرۃ؛ (۹) السیرۃ الحلبیۃ، ج ۳؛ (۱۰) المواہب اللدنیہ، ج ۱؛ (۱۱) الزرقانی، ج ۲؛ (۱۲) البخاری، کتاب مناقب الانصار، و باب الہجرۃ؛ (۱۳) الدِّیَنوری: کتاب المعارف، ص ۵۴، گوٹنجن ۱۸۵۰ء؛ (۱۴) Margoliouth: *Muhammad and the rise of Islam*، بمد اشاریہ؛ (۱۵) Reuben Levey: *The Social Structure of Islam*، بمد اشاریہ].

(سیّد نذیر نیازی)

---

(۲) **الأنصار**: مدینے کے بنو اَوس وخزرج اسلام لانے کے بعد نبی اکرم ﷺ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور مسلمانوں کے حامی و ناصر بن گئے۔ اوس اور خزرج دونوں حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو مُزَیقیاء الأَزْدِی القَحْطانی کے بیٹے تھے، ان کی والدہ قَیْلہ بنت الأَزْرَم تھی۔ اسی وجہ سے اوس وخزرج کو بنو قیلہ بھی کہتے ہیں (فتوح البلدان، ص ۲۳؛ جمہرۃ انساب العرب، ص ۴۸۱)۔ ان کی آمد سے پہلے مدینے میں یہود آباد تھے۔ جب عَرِم کے سیلاب سے سدِّ مأرب میں شگاف آ گیا تو قبیلۂ ازد کے لوگ یمن سے نکلے۔ ان میں سے اوس وخزرج مدینے میں آ بسے (فتوح البلدان، ص ۲۳)، اوس مدینے کے جنوب میں خزرج مدینے کے اندر وسط آبادی میں۔ اوس کا میل جول بنو قُرَیْظہ اور بنو نَضِیر سے رہا اور خزرج کا بنو قَینُقاع سے۔ اوس کے حسبِ ذیل بطون اور خانوادے تھے: (۱) بنو عوف بن مالک بن الاوس، یہ اہلِ قبا تھے؛ (۲) بنو عمرو بن مالک بن الاوس، یہ النَّبِیت مشہور ہوے، ان میں سے بنو الأَشْہل نے نام پایا؛ (۳) بنو مُرّۃ بن مالک بن الاوس، انھیں الجعادِرَۃ کہتے ہیں۔ بنو وائل وغیرہ انھیں میں سے تھے؛ (۴) بنو جُشَم بن مالک بن الاوس، انھیں میں سے بنو واقف تھے (جمہرۃ، ص ۴۷۰)۔ خزرج کے بطون اور اولادیں حسبِ ذیل تھیں: (۱) بنو عوف بن الخزرج، بنو سالم وغیرہ انھیں کی نسل میں سے تھے؛ (۲) بنو عمرو ابن الخزرج، ان کی نسل سے زیادہ مشہور بنو النجّار ہیں؛ (۳) بنو جُشَم بن الخزرج، ان کی نسل سے بنو زُرَیق وغیرہ تھے؛ (۴) بنو الحارث بن الخزرج، ان کی نسل میں بنو خُدْرہ زیادہ مشہور تھے؛ (۵) بنو کعب بن الخزرج، ان کی نسل سے بنو ساعدہ وغیرہ تھے (جمہرۃ، ص ۴۷۱-۴۷۲)۔ بنو اوس وخزرج بیسیوں قبائل وبطون اور خاندانوں میں منقسم ہوتے چلے گئے (تفاصیل کے لیے دیکھیے جمہرۃ انساب العرب، ص ۳۳۲-۳۶۶)۔ یہ قبائل ایک عرصے تک یہود کے زیرِ تسلّط رہے اَور زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت میں ان کے کارندے بنے رہے۔ بعد ازاں بیرونی امداد حاصل کر کے قبائل اوس وخزرج نے یہود سے نجات حاصل کی، مگر ایک اَور مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ آپس میں لڑائیاں چھڑ گئیں۔ کچھ یہودی قبائل نے اوس کی پشت پناہی کی اور کچھ نے بنو خزرج کی (تفاصیل تاریخ ابن خلدون میں دیکھیے)۔ ان معرکوں میں یوم الدّرک، یوم الربیع اور یوم بُعاث زیادہ مشہور ہیں.

بنو قَیلہ آپس کی خانہ جنگی اور فتنہ وفساد سے تنگ آ کر امن وسلامتی اور باہمی دوستی کے خواہاں تھے، نیز یہود کے طعنوں سے تنگ آ کر کسی صاحبِ کتاب نبی پر ایمان لانے کے خواہش مند۔ انھوں نے یہود سے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے۔ ان کی یہ تمنّا تھی کہ وہ دوسرے لوگوں سے پہلے اس آنے والے نبی پر ایمان لا کر یہود کی طرح اہلِ کتاب بن جائیں، نیز اس نبی کی بدولت دونوں متحارب قبیلوں میں دوستی اور محبت لوٹ آئے اور آئے دن کی لڑائیوں سے نجات مل جائے۔ جب نبوت کے نویں سال بنو خزرج کے چھے آدمی آنحضرتؐ پر ایمان لائے تو یہ انھیں خواہشات کی ایک کڑی کی تکمیل تھی.

حضرت مُصعب ؓ بن عُمَیر اور اسعد بن زُرارہ ؓ کی کوششوں سے اسلام کا پیغام مدینے کے ہر گھر میں پہنچنے لگا۔ حضرت مُصعب قرآن مجید پڑھاتے اور تبلیغ کرتے اور حضرت اسعد امامت کراتے تھے۔ جب مسلمانوں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی تو نماز جمعہ شروع کی گئی (زاد المعاد؛ اعلام النبلاء، ۱: ۲۱۸)۔ سعد بن عُبادہ ؓ اور اُسَید بن الحُضَیر ؓ کے ایمان لانے کے بعد عمرو بن ثابت بن وقش الاُصَیرِم کے سوا بنو عبدالاَشہل کے تمام افراد ایمان لے آئے۔ عمرو بن ثابت ؓ بھی جنگ اُحد کے دوران مسلمان ہو کر لڑائی میں شریک ہوے اور شہید ہو گئے۔ نماز پڑھنے کا موقع ہی نصیب نہیں ہوا تھا۔ لوگوں کے شکوک رفع کرنے کے لیے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عمرو ایک بھی سجدہ نہ کرنے کے باوجود جنت میں داخل ہو گیا (جمھرۃ؛ انساب الاشراف)؛ البتہ بنواوس کے بالائی مدینے میں رہنے والے چند خاندان مثلاً بنو خَطْمہ، بنووائل، بنوواقف اور بنواُمیّہ بن زید جنگِ خندق کے موقع پر ایمان لائے۔ اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ ان کا سردار ابوقَیس صَیفی بن اسلَت انھیں اسلام سے روکتا رہا (ابن خلدون)۔ ان میں سے صرف بنوالسَّلَم اپنے حلیف بنوعمرو بن عَوف کی بدولت جلد ایمان لے آئے تھے (جمھرۃ انساب العرب، ص ۳۴۵)۔

نبوّت کے گیارھویں سال تہتّر انصاری مسلمانوں نے حج کے موقع پر عقبہ میں ایامِ تشریق کی درمیانی شب کا ایک تہائی حصّہ گزرنے کے بعد چپکے چپکے آ کر بیعت کی۔ ان کے ساتھ دو انصاری عورتیں بھی تھیں (جوامع السیرۃ، ص ۷۵؛ ابن خلدون، ۱: ۳۰۸)۔ ایک بنومازن ابن النجّار کی اُمّ عُمارہ نسیبہ بنت کعب بن عمرو تھیں اور دوسری بنوسَلِمہ کی اُمّ مَنیع اَسماء بنت عمرو بن عدی (الطیالسی، ۲: ۹۳؛ زادالمعاد، ۲: ۵۱)۔ اوّل الذکر خاتون بڑی فاضلہ، مجاہدہ، بہادر، نڈر اور جان باز تھیں۔ اُحد، حُدَیبیہ، حُنَین اور یمامہ کی جنگوں میں شرکت کی۔ جنگ اُحد، میں اپنے خاوند اور دو بیٹوں سمیت شریک ہوئیں۔ مشکیزہ اٹھائے زخمیوں کو پانی پلاتیں، مرہم پٹی کرتیں اور لڑائی میں حصّہ لیتے ہوے بہادری کے جوہر دکھاتی تھیں۔ اُحد میں بارہ زخم آئے تھے۔ جب بڑا نازک مرحلہ آیا تو ڈھال لے کر رسول اللہؐ کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور اپنے دونوں بیٹوں اور خاوند کی رفاقت میں بڑی بہادری سے آپؐ کی حفاظت کی۔ زخمی ہو جانے کے باوجود دشمنوں کے حملوں کو روکتی رہیں۔ بارہ دشمنوں کو زخمی کیا اور چند ایک کو بیٹے کی معاونت سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک شاہ سوار آنحضرتؐ کی طرف بڑھنے لگا تو امّ عمارہ ؓ نے اسے اور اس کے گھوڑے کو پتھر مار مار کر گرا دیا۔ آخر ابن قمیئہ نے کندھے پر تلوار کا وار کیا۔ اتنا گہرا زخم آیا کہ سال بھر علاج کراتی رہیں۔ رسول خداؐ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! انھیں جنت میں میری رفاقت حاصل ہو، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جنگ احد میں اُمّ عُمارہ کا مقام فلاں فلاں شخص سے بلند ہے۔ یہی بہادر انصاری مجاہدہ جنگ یمامہ میں اپنے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر شریک ہوئیں۔ ماں بیٹے اس کوشش میں تھے کہ مُسَیلَمہ کذّاب کو قتل کریں۔ اس کوشش میں اُمِ عمارہ ؓ کا اپنا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ ایک بیٹا حَبیب (بقول بعض خُبَیب) بن زید بن عاصم تو مسیلمہ کے ہاتھوں شہید ہوا مگر دوسرے بیٹے عبداللہ بن زید المازِنی نے تلوار مار کر مسیلمہ کو قتل کر دیا (اعلام النبلاء، ۲: ۲۰۰-۲۰۴؛ أنساب الأشراف، ۱: ۳۲۵)۔ بنوسَلِمہ کا سردار عبداللہ بن عمرو بن حرام اسی رات ایمان لا کر بیعت میں شریک ہوا۔ بیعت عقبۂ ثانیہ میں انصار نے آنحضرتؐ کے ہاتھ پر یہ عہد کیا کہ وہ آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنی عورتوں اور بچوں کی کرتے ہیں۔ یہ بھی طے پایا کہ آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ انصار کی درخواست پر یثرب ہجرت کر جائیں گے۔ انصار نے یہ عہد و پیمان آپ کے چچا عباس ابن عبدالمطلب کی موجودگی میں کیا، جو ابھی حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہوے تھے (ابن خلدون)۔ اس موقع پر حضرت البَراء بن مَعْرُور انصاریؓ نے پورے اخلاص کا ثبوت دیتے ہوے سب سے پہلے بیعت کی، ان کے بعد ابوالہَیثَم بن التَّیِّہان نے، پھر عبّاس بن عُبادہ نے، بعد میں دوسرے انصار نے (جوامع السیرۃ، ص ۷۴)۔

رسول خداؐ نے ان میں سے بارہ نقیب مقرّر فرمائے، نو بنوخزرج سے اور تین بنواوس سے (انساب، ۱: ۲۵۳): (۱) حضرت ابواُمامہؓ اَسعد بن زرارہ النَّجّاری الخزرجی انصار میں سب سے پہلے ایمان لائے۔ بنوالنجّار کے سردار، نقیب النقباء، تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں گرم جوشی اور مساعی کے اعتراف میں بارگاہِ نبوی سے اسعدالخیر کا لقب ملا۔ مدینے میں سب سے پہلے انھوں نے جمعہ پڑھانا شروع کیا۔ ہجرت نبوی کے نو ماہ بعد، جب کہ مسجد نبوی زیرِ تعمیر تھی، حُناق کی بیماری سے وفات پائی۔ وہ پہلے انصاری تھے جو جنۃ البقیع میں دفن کیے گئے۔ ان کی وفات کے بعد بنوالنجّار نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے عرض کیا کہ ہمارا نقیب فوت ہو گیا ہے، آپ ہمارا نقیب نام زد فرما دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب میں تمھارا نقیب ہوں۔ آپ نے حضرت اَسعدؓ کی تینوں بیٹیوں کو اپنی کفالت میں لے لیا اور جب آپؐ کے پاس سونے اور موتیوں کے زیورات آئے تو آپؐ نے ان لڑکیوں کو بھی پہنائے (ابن سعد، ۳/ ۲: ۱۳۸؛ أُسد الغابۃ، ۱: ۷۱؛ الإصابۃ، ۱: ۳۲)؛ (۲) حضرت سَعد بن الربیعؓ الخزرجی البدری، حضرت عبدالرحمن بن عَوفؓ کے مؤاخاتی بھائی، جنگ اُحد میں ستّر زخم کھانے کے بعد شہید ہوے۔ اپنی قوم کے نام آخری وصیت میں یہ کہلا بھیجا کہ اگر تمھارے ایک فرد کی موجودگی میں بھی کفّار آنحضرتؐ تک جا پہنچے تو خدا کو کیا جواب دو گے (سیر اعلام النبلاء، ۱: ۲۳۰ بعد)؛ (۳) حضرت رافع بن مالِکؓ بن العَجْلان الزُرَقی، بدر میں شریک نہ ہو سکے، غزوۂ اُحد میں شہید ہوے؛ (۴) حضرت البَراء بن مَعْرُور الخزرجیؓ، بنوسَلِمہ کے سردار، بیعتِ عَقَبۂ اولیٰ میں پہل کرنے والے، ہجرتِ نبویؐ سے ایک مہینہ پہلے ماہِ صفر میں وفات پائی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مدینے تشریف لانے کے بعد ان کی قبر پر جا کر دعاے مغفرت کی۔ وہ ابتدا ہی سے قبلے (کعبہ) کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے۔ اپنی جائداد کے تین حصّے کیے۔ ایک آنحضرتؐ کے لیے، ایک اللہ کی راہ میں اور ایک اپنے لڑکے کے لیے۔ آنحضرتؐ نے اپنا حِصّہ ان کے وارثوں کو لوٹا دیا (سیر اعلام النبلاء، ۱: ۱۹۳ بعد)؛ (۵) حضرت ابوجابِر عبداللہ

بن عمرو بن حرام السلمیؓ، البدری، جنگ اُحد کے پہلے شہید۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابوجابر کو شہادت کا اتنا مزہ آیا کہ شہید ہونے کے بعد اللہ سے درخواست کی تھی کہ پھر دنیا میں بھیج دے تاکہ دوبارہ شہادت کا مزہ پائیں؛ (۶) حضرت سَعْد بن عُبادہ الساعدیؓ، البدری، بنوخزرج کے بڑے معزّز اور فیاض سردار، آنحضرتؐ اور اصحابِ صُفّہ کی مہمان نوازی کرنے والے، انصار کے علم بردار، حوران میں ۱۶ھ کو وفات پائی (سیر اعلام النبلاء، ۱:۱۹۶)؛ (۷) حضرت المُنذِر بن عمرو بن خُنَیسؓ الساعدی الخزرجی، البدری، ۴ھ میں وفد بئرِ مَعُونہ کے امیر مقرّر کیے گئے اور اسی حادثے میں دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہوے (أنساب الأشراف، ۱: ۲۵۰؛ جمھرۃ، ص ۳۶۶)؛ (۸) حضرت عُبادہ بن الصامتؓ البدری، من جملہ پانچ انصار کے عہدِ نبوی میں قرآن مجید جمع کیا۔ حمص اور فلسطین میں قرآن مجید اور دینی تعلیم کے لیے مامور ہوے اور بعمر بہتّر سال، ۳۴ھ میں بمقام رَملہ (فلسطین) وفات پائی (أنساب؛ سیر اعلام النبلاء، اوّل وثانی)؛ (۹) حضرت عبداللہ بن رواحہؓ البدری، مشہور خزرجی سردار، شاعر، کاتب، ۸ھ میں غزوۂ مُوتہ میں سپہ سالاری کرتے ہوے شہید ہوے (سیر اعلام النبلاء، ۱: ۱۶۶ بعد)؛ (۱۰) حضرت اُسَید بن الحُضَیر الاَوسی الاَشْہَلی، بڑے عقلمند اور صائب الرائے سردار، حضرت مُصعب بن عُمَیرؓ کے ہاتھ پر مدینے میں اسلام لائے۔ بڑے خوش الحان قاری تھے۔ خلافت فاروقی میں ۲۰ھ کو وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے (سیر اعلام النبلاء، ۱:۲۴۶ بعد)؛ (۱۱) حضرت سَعْد بن خَیْثَمہ الاوسیؓ، البدری، ان کے والد حضرت خَیْثَمہ بھی ایمان لائے اور غزوۂ بدر میں شرکت کے لیے باپ بیٹے میں مقابلہ ہوگیا۔ باپ چاہتا تھا کہ جنگ میں جاکر میں شہادت پاؤں۔ بیٹا کہتا تھا کہ اگر حصولِ جنت کا سوال نہ ہوتا تو میں باپ کی خواہش کو ترجیح دیتا۔ آخر قرعہ اندازی ہوئی سعد کا نام نکلا، بدر میں شریک ہوکر شہادت پائی۔ ان کے والد حضرت خَیْثَمہؓ جنگ اُحد میں شہید ہوے (سیر اعلام النبلاء، ۱: ۱۹۳)؛ (۱۲) حضرت ابوالہیثم مالک بن التَّیِّہان الاوسی، البدری، بیعت عَقَبۂ اُولیٰ اور ثانیہ میں شریک ہوے تھے۔ عہدِ فاروقی میں ۲۰ھ کو وفات پائی۔ الذہبی وغیرہ کے نزدیک صِفّین میں ان کے شہید ہونے والی روایت قابلِ اعتماد نہیں (سیر اعلام النبلاء، ۱:۱۳۸ بعد).

اسلام نے اوس وخزرج کی دیرینہ عداوت و دشمنی کو محبّت و اخوّت میں تبدیل کردیا اور یہود کی اقتصادی اجارہ داری اور سیاسی تفوّق کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ انصار نے اسلام کی حمایت ونُصرت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اپنی بے مثال قربانی اور نُصرت سے اسلام کی شان وشوکت کو دوبالا کردیا۔ ان کی جاں نثاری اور فداکاری کی داستانوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ غزوۂ بدر میں دوسو تیس سے زائد انصار نے شرکت کی، جن میں بنوخزرج کے ایک سو ستّر جاں نثار تھے، باقی بنواوس کے۔ کل ستّر اونٹوں میں سے اکیلے حضرت سعد بن عُبادہؓ الانصاری الخزرجی نے بیس اونٹ دیے تھے (الاستبصار فی نسب الانصار، بحوالۂ الانصار و الاسلام، ص ۹۹)۔ بدر کے چودہ شہدا میں آٹھ انصاری تھے (جوامع السیرۃ، ص ۱۴۶)۔ غزوۂ احد میں مہاجرین کے دوش بدوش انصار بھی بکثرت شریک ہوکر بڑی بےجگری سے لڑے، ستّر شہدا میں چھیاسٹھ انصاری تھے۔ بعض کے جسموں پر ستّر ستّر زخم تھے۔ شہدا کی فہرست ابن ہشام، جوامع السیرۃ، انساب الأشراف اور سیر اعلام النبلاء وغیرہ میں موجود ہے۔ یومِ بئرِ مَعُونہ کے شہدا میں بھی انصار نمایاں ہیں۔ انصاری خاتون حضرت عَفراءؓ بنت ثُعْلبہ النجّارہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ان کے سات بیٹے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ جنگِ بدر میں شریک ہوئے۔ چھے مختلف غزوات میں شہید ہوے اور ان کی نسل صرف ایک لڑکے عوف سے چلی (المُحبّر، ص ۳۹۹ بعد)۔ یہ شرف بھی ایک انصاری حضرت عبداللہ بن زید الخزرجی کے حصّے میں آیا کہ انھیں خواب میں اذان بتائی گئی۔ (جمھرۃ، ص ۳۶۱)۔ آنحضرتؐ نے انصار کے جود وکرم کی تعریف فرمائی (کتاب البخلاء، ۲: ۱۰۶)۔ حضرت اُبَیّ بن کعب انصاری کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے پہلے کاتب بننے کا شرف حاصل ہوا (انساب الأشراف، ۱: ۵۳۱)۔ کعب ابن اشرف یہودی اور دیگر شرپسند دشمنانِ اسلام کے سر کچلنے کا شرف بھی انصار کے حصّے میں آیا (انساب، ۱: ۳۷۴؛ سیر اعلام النبلاء، ۱: ۱۶۶)۔ حضرت حَنْظلہؓ بن ابی عامر (شہیدِ اُحد) کو ''غَسِیل الملائکہ'' کا لقب ملا، حضرت عاصم بن ثابتؓ بن ابی الاَقْلح (شہید یوم رَجِیع) کو ''حَمِیّ الدَّبر'' کا (ابن خلدون)، حضرت المُنذِر بن عمرو بن خُنَیس (شہیدِ بئر معونہ) کو ''المُعْنِق لِیَمُوت'' کا (جمھرۃ)، حضرت خُزَیمہ بن ثابتؓ بن الفاکہ کو ''ذوالشہادتین'' کا (انساب، ۱: ۵۰۹)، حضرت سعد بن مُعاذؓ کی شہادت پر عرشِ الٰہی سے مسرّت وفرحت کا اظہار کیا گیا۔ انصار میں تنہا حضرت اوسؓ بن خَوْلی بن عبداللہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تدفین کے وقت قبر میں اترے (جمھرۃ، ص ۳۵۵)۔ حضرت ابوبکر الصدیقؓ کے انتخاب کے وقت انصار کو وزرا کا لقب دیا گیا (انساب، ۱: ۵۸۲)۔ انصار میں سب سے پہلے حضرت اُسَید بن الحُضَیرؓ (یا بشیر بن سعدؓ) نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی (حوالۂ مذکور)۔ حضرت سَہلؓ بن مالک انصاری نے مدینے میں صحابہ میں سے سب سے آخر وفات پائی (جمھرۃ، ص ۳۶۶)۔ انصار نے مہاجرین کو اپنے کاروبار اور باغات کے پھلوں میں شریک کرلیا۔ اخوّت کی بنا پر مہاجرین کو انصار کا ورثہ ملنے لگا، لیکن بعد میں قرآن مجید نے اس وراثت کو ختم کر دیا (البخاری، کتاب الکفالہ)۔ مہاجرین نے بھی خوب محنت سے کام کیا اور انصار سے جو کچھ لیا تھا واپس کردیا (البخاری، کتاب الھبہ)۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے پیشِ نظر یہ بھی تھا کہ انصار کو بحرَین کی آمدنی اور جاگیریں عطا کردی جائیں (البخاری، کتاب الجزیہ).

کُتبِ تراجم سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار میں عظیم المرتبت اور جلیل القدر محدّث، فقیہ، راوی، شاعر، قاضی، قاری اور مفتی پیدا ہوے۔ آنحضرتؐ کے شعرا میں حضرت عبداللہ بن رَواحہؓ، حضرت حسّان بن ثابتؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ کے اسما خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انصار کے کئی خاندان مشرق ومغرب کے ممالکِ

اسلامیہ میں جا بسے۔ اس سلسلے میں ابن حزم نے جمھرۃ انساب العرب میں مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اَندَلُس کے مختلف علاقوں میں انصار کے نام کے آثار ملتے ہیں۔ اشبیلیہ میں شُوش الانصار کے نام سے ایک بستی آباد تھی۔ ابن منظور صاحبِ لسان العرب بھی ایک انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انصار کے کارناموں کی داد شعرا نے بھی دی ہے؛ من جملہ ان قصائد کے کعب بن زُہَیر نے بھی ایک قصیدۂ رائیہ فی مدح الانصار لکھا ہے (براکلمان، تعریب عبدالحلیم النجار، ۱: ۱۵۷)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو بھی انصار سے بڑی محبت تھی۔ آپؐ ان کی خدمات و ایثار و قربانی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انصار کی محبت کو آپؐ نے جزوِ ایمان قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص انصار سے بیر نہیں رکھ سکتا۔ انصار سے بُغض رکھنے کو منافقت قرار دیا ہے۔ آپؐ نے انصار، ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لیے رحم و مغفرت کی دعا فرمائی ہے (البخاری، کتاب مناقب الانصار؛ ابوداؤد الطیالسی، ۲: ۱۳۶-۱۳۸)۔

اسلام سے پہلے انصار کی عادت تھی کہ حج سے واپسی پر گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہوتے بلکہ پچھواڑے سے آتے، اس پر قرآن مجید کی آیت: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (۲: [البقرۃ]: ۱۸۹) نازل ہوئی (مسلم: کتاب التفسیر)۔

مآخذ: (۱) القرآن المجید: ۲ [البقرۃ]: ۱۸۹؛ ۸ [الانفال]: ۷۲، ۷۴، ۹ [التوبۃ]: ۱۰۰، ۱۱۷؛ ۵۹ [الحشر]: ۹؛ ۶۱ [الصّف]: ۱۴؛ (۲) ابوداؤد الطیالسی: المسند (تبویب، منحۃ المعبود فی ترتیب مسند الطیالسی ابی داؤد، تالیف احمد عبدالرحمٰن البنّا الساعاتی) ۲: ۹۳، ۱۳۶-۱۳۸، مصر ۱۳۷۲ھ؛ (۳) البخاری، کتاب الایمان، کتاب مناقب الانصار، کتاب العمرہ، کتاب الحرث والمزارعۃ، کتاب الہبہ، کتاب الجزیہ، کتاب المظالم والغصب، کتاب الکفالہ؛ (۴) مسلم: کتاب التفسیر: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا؛ (۵) ابن سعد: الطبقات، ۱/۱: ۱۴۵ ببعد؛ ۱/ ۲: ۱ ببعد؛ ۳/ ۲: ۲۱ (نیز بہ امداد اشاریہ)؛ (۶) ابن حبیب: المحبّر، ص ۲۶۸ (نیز بہ امداد اشاریہ)، حیدرآباد دکن ۱۳۶۱ھ؛ (۷) ابن حزم: جمھرۃ انساب العرب (طبع عبدالسلام ہارون)، ص ۳۳۲-۳۶۶، ۴۷۰-۴۷۲، ۴۸۱، مصر ۱۹۶۲ء؛ (۸) ابن حزم: جوامع السیرۃ (طبع احسان عباس)، ص ۷۵، ۷۶، (نیز بہ امداد اشاریہ)، مصر ۱۹۵۶ء؛ (۹) ابن دُرَید: کتاب الأشتقاق، ص ۲۶۰؛ (۱۰) ابن الأثیر: الکامل فی التاریخ، ۲: ۴۵ ببعد؛ (۱۱) وہی مصنّف: أُسد الغابۃ، قاہرہ ۱۲۸۶ھ؛ (۱۲) ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۳: ۵۱ ببعد؛ (۱۳) ابن عبد البرّ: الأستیعاب، حیدرآباد دکن؛ (۱۴) ابن خلدون: تاریخ (اُردو ترجمہ حصّۂ اوّل از ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ)، ۱۸۰-۲۰۱، ۳۰۵-۳۱۱، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۱۵) ابن حجر: الاصابۃ؛ (۱۶) ابن سید الناس: عیون الأثر، ۱: ۱۵۵ ببعد، قاہرہ ۱۳۵۶ھ؛ (۱۷) ابن الجوزی: تلقیح فھوم اھل الأثر، ص ۲۱۳ ببعد؛ (۱۸) ابن کثیر: البدایۃ والنّھایۃ، ۳: ۱۴۵ ببعد، قاہرہ ۱۳۵۸ھ؛ (۱۹) ابن القیّم: زاد المعاد، ۲: ۵۰ ببعد، مصر ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء؛ (۲۰) ابن منظور: لسان العرب؛ (مادّہ: نصر، اوس، خزرج)؛ (۲۱) ابوالفداء: تاریخ، ۱: ۱۰۷؛ (۲۲) البلاذری: انساب الاشراف (طبع محمد حمید اللہ)، ۱: ۲۳۸ ببعد (نیز بہ امداد اشاریہ)، مصر ۱۹۵۹ء؛ (۲۳) وہی مصنّف: فتوح البلدان، ص ۹-۲۳، قاہرہ ۱۳۱۹ھ؛ (۲۴) الاصفہانی: الأغانی (بہ امداد اشاریہ)؛ (۲۵) الجاحظ: کتاب البخلاء، ۲: ۱۰۶، قاہرہ ۱۹۴۰ء؛ (۲۶) الکلبی: اِنسان العُیُون (السیرۃ الحلبیۃ)، ۲: ۱۴ ببعد؛ (۲۷) الدیار بکری: تاریخ الخمیس، ۱: ۳۱۶ ببعد؛ (۲۸) الذہبی: سیر اعلام النبلاء (طبع صلاح الدین المنجد) ہر سہ جلد (بہ امداد اشاریہ) قاہرہ؛ (۲۹) وہی مصنّف: تاریخ الاسلام، ۱: ۱۷۱ ببعد و ۲: ۳۳ ببعد، قاہرہ ۱۳۶۷ھ؛ (۳۰) السَّمہودی: وفاء الوفاء باخبار دار المصطفٰی، (طبع وسٹنفلڈ ۱۸۶۰ء)؛ (۳۱) السُّہَیلی: روض الأُنف، ۱: ۱۳ ببعد، قاہرہ ۱۳۳۲ھ؛ (۳۲) صبحی الصالح: النظم الاسلامیۃ (بہ امداد اشاریہ)، بیروت ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء؛ (۳۳) الطبری: تاریخ، ۲: ۲۳۴ (نیز بہ امداد اشاریہ)؛ (۳۴) عبدالدائم البقری: الانصار و الاسلام، قاہرہ ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۵ء؛ (۳۵) عمر رضا کحّالہ: معجم قبائل العرب، الجزء الاول (مادّہ، اوس، خزرج)، دمشق ۱۹۴۹ء؛ (۳۶) القسطلانی: المواھب اللدنیۃ، ۱: ۷۶ ببعد؛ (۳۷) القلقشندی: صُبح الاعشٰی، ۱: ۳۱۹، مصر ۱۳۴۰ھ؛ (۳۸) وہی مصنّف: نھایۃ الارب فی معرفۃ الانساب، (طبع ابراہیم الابیاری)، قاہرہ ۱۹۵۹ء؛ (۳۹) المقریزی: أمتاع الأسماع، ۳۲ ببعد؛ (۴۰) النُّویری: نھایۃ الارب، ۲: ۳۱۶، مصر ۱۳۴۲ھ؛ (۴۱) الہَمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، ص ۲۱۱؛ (۴۲) ابن سَلّام الجُمحی: طبقات الشعراء؛ (۴۳) امین دویدار: صور من حیاۃ الرسول، ص ۲۱۸-۲۳۱، ۲۵۰-۲۵۵، ۳۶۱، مصر ۱۹۵۸ء۔

(عبدالقیوم)

الأنصاری الہَرَوی: ابواسمٰعیل عبداللہ بن محمد بن علی بن محمد بن علی بن جعفر بن منصور بن مَتّ الأنصاری الہَرَوی الحَنبلی، ہَرات کے قلعۂ کہن دِژ میں ۲ شعبان ۳۹۶ھ/ ۴ مئی ۱۰۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ عالمِ شیر خوارگی ہی میں غیر معمولی کیفیات کے حامل تھے۔ صِغر سنی میں ابومنصور اَلأزدی، ابوالفضل الجارُودی اور یحییٰ بن عَمّار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے حدیث اور تفسیر پڑھی۔ اگرچہ تعلیم کا سلسلہ شافعی اساتذہ سے شروع کیا تھا لیکن جلد ہی پُرجوش حنبلی بن گئے؛ کیونکہ حنابلہ قرآن و سنت کے بہت دل دادہ تھے۔ ۴۱۷ھ/ ۱۰۲۶ء میں وہ حصولِ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے نیشاپور گئے، جہاں الأصَمّ کے مریدوں سے اکثر ملتے رہے۔ وہاں سے طُوس اور بِسطام پہنچے۔ ۴۲۳ھ/ ۱۰۳۱ء میں سفرِ حج پر روانہ ہوئے اور راستے میں بغداد ٹھیرے تاکہ ابومحمد الخَلّال کے درس میں شریک ہو سکیں۔ حج سے واپسی پر انھوں نے ابوالحسن الخِرَقانی سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ ان کی صحبت نے الأنصاری کی عبادت گزارانہ زندگی پر بہت اثر ڈالا، جو انھوں نے اپنے والد ابومنصور کی صحبت و تربیت ہی میں شروع کر دی تھی۔ ابومنصور بَلخ کے شریف العَقیلی کے مُرید تھے۔ آخر الامر الانصاری نے ہَرات میں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ وقت شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں اور کچھ علماے دین کے ساتھ بحثوں اور مناظروں میں صرف کرنے لگے۔ مؤخّر الذکر سرگرمیوں کے باعث انھیں پانچ دفعہ جان کا خطرہ لاحق ہوا اور تین مرتبہ جلاوطن کیے گئے۔ انھوں نے ۲۲ ذوالحجہ ۴۸۱ھ/ ۸ مارچ ۱۰۸۹ء کو اپنے زادبوم میں شیخ الاسلام کے معزّز لقب کے ساتھ وفات پائی۔

سوانح نگاران کے زُہد وتقوٰی، علومِ دینیہ کے ہر شعبے میں ان کے تبحُّر، قرآن وسُنّت اور حنبلی مسلک کے ساتھ ان کی غیر متزلزل وابستگی کے بہت مدّاح ہیں لیکن حنبلیت سے شغف کے باعث مخالفین نے ان پر مذہب میں غلو اور خدا کی تجسیمیت اور تشبّہ بالانسان کے قائل ہونے کے الزامات بھی لگائے ہیں۔

تصنیفات میں ان کی ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔ تصوّف میں انھوں نے اپنی روح کا جلوہ مناجات اور ان مسجّع یا منظوم تحریروں میں دکھایا ہے جو ادب فارسی کے شاہ کاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان کی کتاب مَنازل السائِرِین ایک بیش قیمت روحانی ہدایت نامہ ہے، جو جدّت، اختصار اور نفسیاتی تجزیوں کی وجہ سے خاصا اثر آفرین ہے۔ اس کتاب کی شرحیں جس کثرت سے لکھی گئی ہیں وہی اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ کتاب تصوّف کی تاریخ میں کس قدر عظیم اہمیّت کی حامل ہے۔ [بہترین شرح حافظ ابن القیّم کی مدارج السالکین تین جلدوں میں ہے۔] ان کی ایک اَور کتاب طبقات الصُّوفیہ ہے جو السُّلمی کی تصنیف اور جامی کی نفحات الأُنس کے درمیان کڑی کا کام دیتی ہے۔ یہ ایک مستند تذکرہ ہے، اور اس اعتبار سے بھی بہت قابلِ قدر ہے کہ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کی ہراتی بولی کا نمونہ ہے۔ آخر میں ان کی تصنیف ذَمّ الکلام وَاَھْلِہ، مسلمانوں میں فقہ معقول [یعنی فلسفۂ اعتزال] کے خلاف جو جدوجہد ہوتی رہی اس کی تاریخ کا ایک بڑا ماخذ ہے۔

ان کے شاگردوں میں حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں: ابو الوقت عبدالاوّل السِّجزی، مُؤتمن السّاجی اور سب سے بڑھ کر یوسف الہَمَذانی، جو ان کے عقائد کے وارث ہیں۔

مآخذ: (۱) Storey، ۱: ۹۲۴-۹۲۶؛ (۲) براکلمان، ۱: ۴۳۳؛ تکملہ، ۱: ۷۷۴؛ (۳) رِٹّر (H. Ritter)، در *Isl.*، ۱۹۳۵ء، ص ۸۹-۱۰۰ (اس کی تصنیف بجنسہٖ اور وہ مخطوطات جن پر وہ مبنی ہے استانبول میں محفوظ ہیں)؛ (۴) ابن ابی یَعْلٰی: طَبَقات الحَنابلة، دمشق ۱۳۵۰ھ، ص ۴۰۰؛ (۵) ابن رَجَب البغدادی: طَبَقات الحَنابِلة، (طبع Laoust) شمارہ ۲۷؛ (۶) جامی: نَفَحات الأنس (طبع Lees)، ص ۳۱۶؛ (۷) الذَّہَبی: تاریخ الاسلام، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، شمارہ Or ۵۰، P ۲۷۵۲۴، ۱۷۶ b؛ (۸) وہی مصنّف: تذکرۃ الحُفّاظ، حیدرآباد، ص ۳۷۵؛ (۹) السبکی: طَبَقات الشافعیة، قاہرہ، ۳: ۱۱۷؛ (۱۰) مُسَجّعات کے بارے میں دیکھیے: براؤن (Browne)، ۲: ۲۶۴؛ (۱۱) مُناجات، طبع Kaviani، برلن ۱۹۲۴ء؛ (۱۲) اِلٰہی نامہ، طبع وترجمہ در *BIFAO*، ج ۴۷؛ (۱۳) طبقات کی زبان کے متعلّق دیکھیے ایوانوف (Ivanow)، در *JRAS*، ۱۹۲۳ء، ص ۱-۳۴، ۳۳۷-۳۸۲؛ (۱۴) منازل کے متعلّق دیکھیے: (۱) شرح از ابن القیّم الجوزیّہ: مدارج السالکین، قاہرہ ۱۹۵۶ء؛ (۲) مجموعۂ انصاریات، در *IFAO*؛ (۳) متعدّد مقالات، در *MIDEO*، قاہرہ و (۴) کتاب صَدْمَیْدان، در *Mel Islam*.، *IFAO*، ۱۹۵۴ء۔

(S. De Beaurecuil)

---

* **الأنطاکی:** داؤد بن عُمر الضَّرِیر عُرف البصیر، ایک ''عثمانی عرب'' عالم، محقّق اور شاعر، اس کی نہایت مفصّل سوانح عمری مؤلّفہ محمد امین بن فضل اللہ المُحبّی، موسومہ خُلاصة الأثر فی اَعیان قَرنِ حادی عشر ہے (راغب پاشا لائبریری، شمارہ ۹۹۹ بعد، ۱۵۸ ب، قاہرہ ۱۲۸۴ھ [۲: ۱۴۰-۱۴۹]) اور ابو المعالی الطالوی کی سانِحات، جو خود انطاکی کی مہیّا کردہ معلومات پر مبنی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ بمقام انطاکیہ ۹۵۰ھ/۱۵۴۱ء [کذا؟ ۱۵۴۳ء] میں پیدا ہوا اور پیدائشی نابینا تھا۔ اسی لیے اس کا عُرف ''الضَّرِیر'' (یا بعض اوقات اَکْمَہ = جنم کا اندھا) مشہور ہو گیا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ عربوں کی رسم کے مطابق، جو ہر چیز کی مبارک تاویل کیا کرتے ہیں، الأنطاکی کو تفاؤُلاً البَصیر (صاحبِ بصیرت) کا عرف دیا گیا ہو۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لقب اسے اس کی جودتِ طبع اور قوّتِ مشاہدہ کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ سانحات میں مُحبّی کی تصانیف میں اور بعد کی سوانح عمریوں میں بھی، جو انھیں کتابوں پر مبنی ہیں، اس کے لیے ''اعجوبۃ الدّہر'' کا لقب استعمال کیا گیا ہے؛ گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنے اندھے پن کے باوجود طب، فلکیات اور طبیعیات کا ماہر تھا۔ اس کا باپ عُمر ایک گاؤں حبیب النَّجّار [رک بآں] کا مختار (یعنی مکھیا) تھا۔ اس نے حبیب النجّار کی تربت (مقبرے) کے قریب ایک مہمان خانہ قائم کر رکھا تھا، جس میں غریب مسافروں کے لیے خورد ونوش کا سامان مہیّا کیا جاتا تھا۔ ایک دن ایک ایرانی عالم محمد شریف یہاں آیا اور جب اس نے دیکھا کہ داؤد کسی شدید مرض کی وجہ سے کھڑے ہونے اور چلنے سے معذور ہے تو اس نے اس کے جسم پر کوئی تیل ملا، کس کر پٹیاں باندھیں اور کچھ خون خارج کیا۔ اس علاج سے داؤد کو شفا ہو گئی۔ اس نے اس ایرانی عالم سے منطق اور طبیعیات کی تعلیم حاصل کی اور فارسی سیکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ اس پر استاد نے کہا کہ فارسی آسان زبان ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ یونانی سیکھو، کیونکہ اس کے سکھانے والے شاذ و نادر دست یاب ہوتے ہیں (سانحات)۔ داؤد کی جو طبّی تصانیف موجود ہیں ان میں اس نے قدیم یونانی حکما کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے اور نباتات کے قدیم یونانی نام بھی لکھے ہیں۔ غالباً اس نے نوجوانی میں یونانی زبان سیکھی ہوگی۔

آ، لائڈن (طبع اوّل) میں براکلمان نے بتایا ہے کہ الانطاکی نے اناطولیہ کی سیاحت کے دوران میں یونانی سیکھی تھی، تاکہ طبّی کتابوں کا ان کی اصلی زبان میں مطالعہ کر سکے، لیکن براکلمان اپنی بعد کی تصنیف (*Gesch. der Arabischen Litteratur*، تکملہ لائڈن ۱۹۳۸ء، ۲: ۴۹۱) میں اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ الانطاکی نے یونانی زبان ایک ایرانی عالم سے سیکھی تھی۔ اگرچہ کتاب خُلاصة الأثر (دیکھیے اوپر) میں بہت سے مقامات کا ذکر ہے، جہاں الانطاکی گیا تھا، لیکن اس سلسلے میں اس کی سیاحتِ اناطولیہ کا کہیں ذکر نہیں۔ صرف یہ لکھا ہے کہ مصر جاتے ہوئے وہ دمشق اور بعض قریبی مقامات میں بھی گیا، جہاں بہت سے علما کے ساتھ اس کے تعلّقات تھے؛ اور (اس کی اپنی شہادت کے مطابق) جب وہ قاہرہ پہنچا تو لوگ اس کے دشمن ہو گئے۔ تمام مشرقی مآخذ متّفق ہیں کہ الانطاکی کی کتابیں ان سوالات کے جوابات سے بھری پڑی ہیں جو سائنس اور فلسفے بالخصوص علومِ طبیعی و

ریاضی کے متعلّق اس سے کیے گئے۔ تمام مآخذ میں داؤد الانطاکی کے متعلّق نہایت حیرت انگیز، غیر معمولی اور تقریباً ناقابلِ یقین واقعات درج ہیں۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ الانطاکی آزاد خیال عالم تھا۔ اس نے معراج النبی[ص] [کے ایک خاص تصوّر] سے انکار کیا، قبّ اَلْکُحْل النَّفِیْس لِجِلاء اَعْیُنِ الرئیس؛ ابن سینا: قصیدة عینیة، شرح، قاہرہ لائبریری، فہرست دوم، طبع ثانی، شمارہ ۲۵۶)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ معجزات کی تاویل کرتا تھا (ابن معصوم: سُلافة العصر، مصر ۱۳۲۴ھ، ص ۴۲۸)۔ اس کے علاوہ یوسف الہادی الدمشقی کی کتاب ذکر الحبیب میں لکھا ہے کہ الانطاکی طب اور علومِ طبیعی کے ساتھ ساتھ امام فخر الدین الرازی، شہاب الدین سُہْرَوَرْدِی کی مشہور تصانیف، اور خصوصاً رسائل اخوان الصفا کے مطالعے میں خاص شغف رکھتا تھا، جس سے ظاہر ہے کہ اپنے خیالات اور فلسفے میں وہ ایک آزاد مفکّر تھا۔ بہر حال آج کل تو داؤد الانطاکی اپنی کتاب تَذکِرةُ اُولِی الاَلْبَاب وَالْجَامِع لِلْعَجَب العُجاب کی وجہ سے علمِ طبّ ہی میں شہرت رکھتا ہے۔ ۱۰۰۸ھ/ ۱۵۹۹ء میں داؤد الانطاکی شریفِ مکّہ حسن بن ابونُمَیّ کی دعوت پر قاہرہ سے مکّے گیا اور اسی سال وہیں فوت ہو گیا [ایک بیان یہ ہے کہ اس کی وفات ۱۰۰۵ھ میں ہوئی (کشف الظنون)؛ شذرات الذھب میں ہے کہ سال وفات یقیناً ۱۰۱۱ھ ہے]۔ ایک روایت ہے کہ اس کی موت اسہال سے ہوئی اور دوسری روایت کے مطابق زہر خورانی اس کی موت کا باعث بنی۔ داؤد نہایت خوش گفتار اور ایک دل کش شخصیت کا حامل تھا۔

اگرچہ اس عثمانی عربی عالم نے تین سلاطین (سلیمان قانونی، سلیم ثانی اور مراد ثالث) کے دورانِ حکومت میں قلم روِ عثمانی کے حدود میں زندگی بسر کی لیکن اس نے استانبول یا بلادِ اناطولیا میں کام نہیں کیا، اس لیے دوسری ترکی تحریروں یا علما و محقّقین کی سوانح عمریوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔

تصانیف: [براکلمان نے اس کی نو کتابوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کی یہ فہرست مکمّل نہیں۔] طب کے متعلّق داؤد الانطاکی کی سب سے بڑی تصنیف تذکرة اولی الالباب ہے۔ یہ کتاب ترکی اور عرب ممالک میں تذکرة داؤد کے نام سے مشہور ہوئی اور ۱۲۵۴ھ اور ۱۳۲۴ھ کے درمیان مصر میں سات دفعہ چھاپی گئی۔ ایک ضمن میں مصنّف لکھتا ہے کہ اس نے اس کتاب کو ۹۷۶ھ میں لکھنا شروع کیا تھا (دیکھیے تذکرة، مصر ۱۳۰۰-۱۳۰۲ھ، ۱:۲۱)۔ ابن سینا نے القانون میں زیادہ سے زیادہ آٹھ سو مفردات کا ذکر کیا ہے لیکن انطاکی کے ہاں ان کی تعداد ایک ہزار سات سو بارہ ہے۔ اس کے بعد اس نے علم تشریح الاعضاء کا مختصر ذکر کیا ہے اور مزید تفصیلات کے لیے اپنی کتاب النُّزْھةُ فِی التَّشْرِیْح کے مطالعے کا مشورہ دیا ہے۔ حصّۂ دوم میں مختلف امراض و معالجات کو ترتیبِ تہجّی سے بیان کیا ہے۔ احکام القرآن کی فصل میں اس نے لوگوں کے امراض اور ان کے باہمی روابط پر ستاروں کی گردش کا اثر بتایا ہے۔ علمِ ہندسہ کے عنوان سے اس نے بتایا ہے کہ مکانات کی تعمیر وغیرہ کے نقشوں کی وجہ سے علمِ ہندسہ بھی طب سے تعلّق رکھتا ہے۔ بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے علمِ ہندسہ پر ایک کتاب لکھی ہے: کَشْف المُشْکِلات (بحوالۂ سابق، ۲:۱۰۶)۔

طب کے متعلّق اس کی دوسری اہم تصنیف النُّزْھَة المُبْھِجة فی تَشحِیذ الاَذھان و تعدیل الأفرِجة ہے، جو اس کے تذکرة کے ساتھ ہی چھاپی گئی ہے۔ یہ کتاب زیادہ تر اس نہج پر لکھی گئی ہے جنھیں آج کل پیتھالوجی (علم الامراض) کہتے ہیں اور فلسفیانہ اقوال کا ایک مجموعہ بھی شامل کتاب ہے۔ مصنّف فخر کرتا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے اس موضوع پر توجّہ نہیں کی (وہی کتاب، ۱:۹)۔ اس کتاب میں اس نے مختلف اعضاے جسمانی کے الگ الگ امراض کی تصریح و تقسیم بیان کی ہے۔

طب کے متعلّق اس مصنّف کی دوسری تصانیف یہ ہیں: الفِیة فی الطِّب، نُزھةُ الاذھان فی اصلاح الاَبدان، (چارلُولُوعلی پاشا کی لائبریری، شمارہ ۳۴۴)، کفایة المُحتَاج فی علم العلاج اور البَھجة و الدُرّة الُمُنْتَخَبة فی ماصَحّ من الاَدویة المُجرَّبة (خالد افندی لائبریری، شمارہ ۷۵۲)، تحفة البکریة فی اَحکِام الاستِحمام الکُلّیة و الجزئیة (صحت علی پاشا لائبریری، شمارہ ۲۰۹۳) اور طب پر فلکیات کے اطلاق کے متعلّق اَنموذَج فی علم الأفلاک [دیسلان کی فہرستِ مخطوطات میں علم الفلک تحریر ہے]۔ اس میں اس نے مشورہ دیا ہے کہ حمّاموں کی تزئین و آرائش ایسے طریق سے ہونی چاہیے کہ ان میں جا کر انبساط کی کیفیت پیدا ہو۔ اس کے علاوہ حمّاموں کے فوائد و نقصانات واضح کیے ہیں اور بتایا ہے کہ ان میں کب داخل ہونا چاہیے اور کب ان سے باہر نکلنا چاہیے۔ آخر میں ٹھنڈے پانی کے عمل کا بھی ذکر کیا ہے۔

مذکورۂ بالا تصانیف کے علاوہ اس کی ایک کتاب وہ ہے جس میں ابن سینا کی کتاب القانون کی شرح کی ہے۔ اس کتاب کا نام نظم قانونجک ہے۔ براکلمان میں ایک کتاب کا غایة المَرام فِی الطِّب نام آیا ہے (تکملہ، ۲، ۴۹۲)۔ اس کی دوسری سب کتابوں کے جداگانہ ناموں کی فہرست مرتب کرنا غیر ضروری ہے (اس فہرست کے لیے دیکھیے براکلمان: تکملہ، ۲:۴۹۲؛ کتب خانہ لالہ لی کی فہرست؛ پیرس، برلن، لائڈن اور رام پور کی لائبریریوں کی فہرستیں)۔

طب کے علاوہ دوسرے مضامین پر بھی اس کی مختلف تصانیف ہیں: مذکورۂ بالا شرح قصیدة عَینِیّة (ابن سینا)؛ غایة المَرام فی المنطِق و الکلام [سلافة العصر، ص ۴۲۸ میں قانون بوعلی سینا پر اس کی دو کتابیں مذکور ہیں: ۱- شرح نظم قانون اور ۲- مختصر القانون، قانونجک (خلاصة الدر، ۲:۱۴۶)]؛ منطق پر رسالہ؛ فی الطائر و العقاب [براکلمان میں فی الطیر]؛ ایک رسالہ پارس پتھر کے متعلّق؛ رسالة فی الھیئة، فلکیات پر؛ تزئین الاسْواق؛ بتفصیل (ترتیب) الاسواق العُشّاق موضوعِ عیش و محبت پر، جو مصر میں پانچ دفعہ چھپ چکی ہے۔ براکلمان (مقالہ، در آ، لائڈن، طبع اوّل) نے دوسرے مستشرقین کی تحقیقات کی بنا پر لکھا ہے کہ یہ تصنیف طبِّ قدیم سے تعلّق رکھتی ہے، جس میں عشق ایک مرض سمجھا

جاتا تھا۔لیکن اس کتاب (مطبوعہ مصر، بایزید پبلک لائبریری، شمارہ ۵۴۴) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے خیالات ومشاہدات پر مشتمل ہے جو عشق کے روحانی اثرات سے متعلّق ہیں۔مشہور عاشقوں اور معشوقوں کے حالاتِ زندگی اور اس موضوع پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں وہ بھی شامل کی ہیں۔اس کتاب کا طب سے کوئی تعلّق نہیں.

مزید براں الانطاکی نے بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں (مثالوں کے لیے دیکھیے: ابن معصوم: سلافة العصر، ۱: ۴۲۹، مصر ۱۳۲۴ھ)۔اس طرح واضح ہوتا ہے کہ الانطاکی صرف ایک ماہر وحاذق طبیب ہی نہ تھا بلکہ ماہر ریاضیات اور شاعر بھی تھا.

مآخذ: اس کی کتابیات کے مآخذ متن میں مذکور ہیں چونکہ دوسری تمام کتابوں میں محض اقتباسات ومنقولات پائے جاتے ہیں اس لیے ان کے مآخذ کی تحقیق ممکن نہیں۔مغربی مآخذ کے لیے دیکھیے: (۱) لکلرک (Laclerc): *Histoire de la Medicine Arabe*، ۲: ۳۰۴ ببعد (۲) وُسٹِنفِلڈ (Wüstenfeld): *Geschichte der arab Aerzte und Naturforschr*، شمارہ ۲۷۵؛ (۳) بروکلمان، ۲: ۳۶۴ اور تکملہ، ۲: ۴۹۱ ببعد؛ [(۴) کشف الظنون، ص ۳۸۶؛ (۵) شذرات الذهب، ۸: ۴۱۵ ببعد؛ (۶) الافرانی: صفوة، ص ۱۲۹؛ (۷) العیاشی: الرحلة، ۲: ۲۷؛ (۸) شوکانی: البدر، ۱: ۲۴۶؛ (۹) الاعلام، ۳: ۹، طبع دوم].

(عبدالحق عدنان)

---

* **الأنطاکی:** (ابوالفَرَج) یحییٰ بن سعید بن یحییٰ، عرب طبیب اور مؤرّخ، ملکی (Melkite) فرقے کا عیسائی، جو اسکندریہ کے سعید بن بَطْرِیق (Eutychius) [المولود ۲۶۳ھ] کا قریبی رشتے دار تھا، وہ غالباً ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اور اپنی زندگی کے ابتدائی پینتیس چالیس سال مصر میں بسر کیے۔خلیفہ الحاکم نے مہربان ہو کر ۴۰۴ھ/ ۱۰۱۳-۱۰۱۴ء میں عیسائیوں کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دے دی تو یحییٰ بن سعید نے ۴۰۵ھ/ ۱۰۱۴-۱۰۱۵ھ میں بوزنطی علاقے کے شہر انطاکیہ میں سکونت اختیار کر لی اور آخر تک وہیں رہا۔اس نے ۴۵۵ھ/ ۱۰۶۳ء میں حکیم بن بَطْلان سے وہیں ملاقات کی تھی۔الانطاکی نے لمبی عمر پائی اور وہ ۴۵۸ھ/ ۱۰۶۶ء تک زندہ تھا.

یحییٰ زیادہ تر مؤرّخ اور سعید بن بَطْرِیق کی تواریخ کے تتمہ کا مصنّف ہونے کے اعتبار سے معروف ہے، جس کا بیان ۳۲۶ھ/ ۹۳۸ء سے شروع ہوتا ہے۔اس نے اپنی یہ تصنیف ۳۹۷ھ/ ۱۰۰۶-۱۰۰۷ء میں پہلی مرتبہ شائع کی۔ بعد ازاں ۴۰۵ھ/ ۱۰۱۴-۱۰۱۵ء سے کچھ عرصہ پہلے تازہ تاریخی مآخذ کی بنا پر اس میں ترمیم کی۔انطاکیہ میں اسے نئی کتابیں مل گئیں اور پھر اس نے اپنی تاریخ پر نظر کی اور اپنے عہد کے واقعات درج کر کے اسے بتدریج پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اس مقصد کے لیے مواد حاصل کرنے کی خاطر کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔گو ہمارے پاس اس کی تصنیف کا ایسا کوئی مخطوطہ موجود نہیں جو ۴۲۵ھ/ ۱۰۳۴ء سے آگے جاتا ہو، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اس نے اپنی تاریخ اس وقت سے بعد تک جاری رکھی اور اسے ۴۵۵ھ [/ ۱۰۶۳ء] بلکہ شاید ۴۵۸ھ تک لے آیا تھا۔ یحییٰ بن سعید واقعات کو سال وار نہیں لکھتا، بلکہ اپنا مواد (پہلے عبّاسی پھر فاطمی) خلفا کے عہدوں کے مطابق اور الگ الگ ملکوں کے تحت درج کرتا ہے۔وہ مصر، شام اور بوزنطی سلطنت سے خاص دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔بغداد کے ساتھ اسے کم دلچسپی ہے اور شمالی افریقہ کا ذکر محض ابتدائی فاطمی خلفا کے سلسلے میں کرتا ہے۔تاریخ لکھتے وقت اس نے صرف مسلم مآخذ ہی سے استفادہ نہیں کیا بلکہ ان یونانی اور مقامی عیسائیوں کی کتابیں بھی پیش نظر رکھیں جن سے وہ انطاکیہ میں متعارف ہوا تھا۔اس کی تصنیف تواریخ وسنین کی معلومات سے بھری پڑی ہے، جن میں اکثر جگہ ہجری سنہ اور سلیوکسی سنہ دونوں درج ہیں۔بظاہر آخر الذکر سنہ کی تاریخیں اس نے اپنے مآخذ سے لیں اور انھیں سنہ ہجری سے خود تطبیق دی ہے۔یحییٰ کی تصنیف شام، عراق (الجزیرۃ) اور بوزنطی سلطنت کی چوتھی اور پانچویں صدی ہجری/ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی کی تاریخ کے لیے بہت اہم ہے۔یہ تصنیف فاطمی مصر نیز مسیحی حلقوں اور ان کے دینی معاملات کے باب میں بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس پیچیدہ مسئلے کو حل کرنا مشکل ہے کہ اس کے مآخذ کیا تھے اور اس کی تاریخ اور ان عرب وقائع میں باہمی تعلّق کیا تھا جو اسی زمانے میں لکھے گئے.

مآخذ: مصنّف کے بارے میں مآخذ اس حاشیے میں مل سکتے ہیں جو M. Canard نے A. Vasiliev: *Byzance et les Arabes*، ج ۲ (*La dynastie macédonienne*)، حصّۂ دوم (*Extraites des sources arabes*)، برسلز ۱۹۵۰ء، کی فرانسیسی طباعت میں لکھا اور اس حاشیے میں V. Rosen کے بنیادی مطالعے *The Emperor Basil the Bulgar-Slayer. Extracts from the Chronicle of Yaḥyā of Antioch* (روسی زبان میں)، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۳ء سے استفادہ کیا، جس کا خلاصہ A. Vasiliev: *Byzance et les Arabes*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۲ء، ۲: ۵۸-۵۹، کی روسی طباعت میں بھی درج ہے۔تنہا مکمّل طبع L. Cheikho، B. Carra de Vaux و H. Zayyat کی ہے: *CSCO*، *Script. ar.*، سلسلہ ۳، کراسہ ۷، پیرس ۱۹۰۹ء؛ Vasiliev کا مطبوعہ متن اور ترجمہ (*Petrologia Orientalis*، ج ۱۸، ۱۹۲۴ء اور ج ۲۳، ۱۹۳۲ء)، ۴۰۴ پر ختم ہو جاتا ہے؛ قب نیز G. Graf: *Gesch. der christl. arab. Litteratur*، ۲: ۴۹-۵۱.

(M. CANARD)

اَنْطاکیہ: شمالی شام کے شہر Antocheia کا معرّب نام۔یہ شہر دریائے * عاصی (Orontes) کے کنارے بحیرۂ روم کے ساحل سے چودہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔اس کی بنیاد سلیوکس (Seleucus) اوّل نے ۳۰۰ قبل مسیح میں رکھی تھی۔[رومی سپہ سالار] پومپی (Pompey) نے اس شہر پر ۶۴ قبل مسیح میں قبضہ کر لیا تھا، جس کے بعد وہ ایشیا میں رومیوں کا سب سے اہم شہر اور سلطنت روما کی ایشیائی ولایات کا صدر مقام بن گیا۔اس کے تدریجی انحطاط کی تاریخ ایران کی

ساسانی سلطنت کے قیام سے شروع ہوتی ہے، جس نے دجلہ اور فرات کی وادی میں انطاکیہ کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت بہت گھٹا دی اور اسے ایران کے پے در پے حملوں کا تختۂ مشق بنا لیا۔ شاہ پور اوّل نے اسے پہلے ۲۵۸ء میں، پھر ۲۶۰ء میں مفتوح اور تاراج کیا اور یہاں کے بہت سے باشندوں کو ولایت سُوسیانہ کے شہر جُندی شاپور [رک بآں] میں لے گیا (قب الطّبری، ۱: ۸۲۷)۔ ۲۶۶ء سے ۲۷۲ء تک انطاکیہ شہر تَدمُر (Palmyra) کی ملکہ زنوبیہ کے زیر اقتدار رہا۔ بایں ہمہ پیہم داخلی جھگڑوں اور تباہ کن زلزلوں کے باوجود (جو اس علاقے میں عموماً آتے رہتے ہیں) اس شہر کی خوش حالی قائم رہی، یہاں تک کہ ۵۴۰ء میں خسرو اوّل (انوشروان) نے اس کا محاصرہ کر کے اسے تباہ کر ڈالا اور اس کے باشندے یہاں سے دوبارہ نکال کر ایرانی مملکت میں منتقل کر دیے گئے (قب نولدیکہ (Th. Nöldeke): *Ges. d. Perser u. Araber zur Zeit der Sasaniden*، لائپزگ ۱۸۷۹ء، ص ۱۶۵، ۲۳۹؛ M. Streck: *Babylonien nach. d. arab. Geographen*، ۱۹۰۱ء، ۲: ۲۶۶ ببعد)۔ اس کے بعد قیصر روم جسٹینین (Justinian) نے انطاکیہ کو اَور محدود لیکن زیادہ مضبوط حصار میں از سرِ نو تعمیر کرایا (یہی حدود ازمنۂ وسطیٰ کے پورے دور میں قائم رہیں) لیکن ایرانی لشکروں نے اسے پھر ۶۰۲ء اور ۶۱۱ء میں تاراج کیا اور ۱۶ھ/ ۶۳۷-۸ء میں عربوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔

ابتدائی خلفاے اسلام کے عہد میں انطاکیہ کا ذکر بہت کم ملتا ہے، تاہم یہ شہر عربوں کے سرحدی فوجی نظام العَواصِم [رک بآں] کا صدر مقام تھا اور بظاہر علمی سرگرمیوں کا ایک فعّال مرکز بنا رہا۔ ۲۶۵ھ/ ۸۷۸ء میں احمد بن طُولُون [رک بآں] نے شمالی شام کے ساتھ اس شہر کو بھی اپنے حلقۂ اقتدار میں شامل کر لیا۔ ۲۸۵ھ/ ۸۹۸ء تک یہ اس کے جانشینوں کے قبضے میں رہا۔ ۳۳۳ھ/ ۹۴۴ء میں سیف الدولہ [رک بآں] آل حَمدان کے ہاتھ آ گیا۔ ۳۵۸ھ/ ۹۶۹ء میں بوزنطی سالار Michael Burtzes نے اسے فتح کر لیا اور اس پر ۴۷۷ھ/ ۱۰۸۴ء تک بوزنطی ڈیوک (امرا) حکمرانی کرتے رہے۔ پھر یہ سلجوقی سلطان سلیمان بن قُتلُمِیش کے قبضے میں آ گیا۔ موصل اور حلب کے عُقَیلی خاندان کے حکمران مسلم بن قُرَیش [رک بآں] نے اس کے لیے جدوجہد شروع کر دی مگر سلیمان نے اسے انطاکیہ کے قریب صفر ۴۷۸ھ/ جون ۱۰۸۵ء میں شکست دی اور وہ جنگ میں مارا گیا۔ اگلے سال خود سلیمان بھی اپنے رشتے دار تُتُش سے شکست کھا کر ہلاک ہو گیا۔ اس داخلی جنگ میں سلجوقی سلطان ملک شاہ کو مداخلت کرنا پڑی، جس نے یاغی سِیان نامی ایک ترک امیر کو انطاکیہ جاگیر کے طور پر دے دیا۔ صلیبیوں نے یہ شہر جمادی الاُخرٰی ۴۹۱ھ/ جون ۱۰۹۸ء کو اسی یاغی سِیان کے ہاتھ سے چھینا اور ازاں بعد انھوں نے موصل کے والی کُرْبُغا کا محاصرہ ناکام بنا کر اس پر قبضہ جمائے رکھا، یہاں تک کہ مملوک سلطان بَیبَرس بُنْدُق داری [رک بآں] نے ۴ رمضان ۶۶۶ھ/ ۱۹ مئی ۱۲۶۸ء کو یہ شہر دوبارہ سر کر کے منہدم کرا دیا۔ اس دَور میں اس پر وہ نارمن خاندان حکمرانی کرتا رہا جو بوہیمانڈ (Bohemond) کی اولاد میں سے تھا اور جس کی عمل داری صلیبی عساکر کے متبادل حالات کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور گھٹتی رہتی تھی، اگرچہ اس کے دارالریاست [انطاکیہ] کو ۵۸۴ھ/ ۱۱۸۸ء میں سلطان صلاح الدین [رک بآں] کی جانب سے کچھ عرصے کے سوا کبھی کوئی سخت خطرہ لاحق نہیں ہوا۔

اس کے بعد انطاکیہ پہلے حَلَب کی مملوک نیابت اور پھر عثمانلی پاشالق کے توابع میں شامل رہا، پہلی جنگِ عظیم کے بعد اس پر فروری ۱۹۱۹ء میں فرانسیسی افواج نے قبضہ جمایا اور اسے شام کے انتداب (mandate) میں شامل کر لیا۔ جب ۱۹۳۸ء میں اسکندرونہ کی سنجاق کے لیے الگ حکومتی نظام قائم کیا گیا (جس کا نام بعد میں جمہوریۂ ہتے (Hatay) قرار پایا) تو انطاکیہ اس کا صدر مقام منتخب ہوا۔ لیکن فرانس نے یہ سَنجاق ۲۳ جون ۱۹۳۹ء کو جمہوریۂ ترکی کے حوالے کر دی (دیکھیے M. Khadduri: *The Alnaudretta Dispute*، در *American Journal of International Law*، ۱۹۴۵ء، ص ۴۰۶-۴۲۵)۔

بوزنطی عہد اور قرونِ وسطیٰ کے شہر انطاکیہ کے بچے کھچے آثار نسبۃً کم ملتے ہیں کیونکہ ۱۸۷۲ء کے شدید زلزلے کے بعد شہر کے باشندوں کو اجازت مل گئی تھی کہ اپنے گھر بنانے کے لیے فصیلوں کا ملبہ استعمال کر لیں۔ انطاکیہ میں حَبِیب النجّار [رک بآں] کی ایک درگاہ کے سوا مسلمانوں کی اَور کوئی اہم یادگار عمارت باقی نہیں۔ یہ درگاہ پرانے بالاحصار کوہ سِلپِیس (Mt. Silpius) کے دامن میں واقع ہے۔ اسلامی روایات اس درگاہ کو اس مردِ مومن کا مزار بیان کرتی ہیں جس کا ذکر بغیر نام کے قرآن مجید (۳۶ [یٰسین]: ۲۰ ببعد) میں آیا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں انطاکیہ کی قضا کی آبادی ۹۹۳۴۷ تھی (ترکمان: ۳۶۵۰۰، عَلَوی: ۱۲۶۰۲، عرب: ۲۱۹۲۶، ارمن: ۸۳۱۹)۔

مآخذ: بوزنطی عہد کے متعلّق بہت وسیع لٹریچر پایا جاتا ہے؛ دیکھیے (۱) Pauly-Wissowa: بذیلِ مادّہ Antiocheia؛ (۲) *Antioch on -the-Orontes*، جلد ۱-۴، پرنسٹن ۱۹۳۴-۱۹۴۰ء؛ اس شہر کے کلیسائی پہلو کے متعلّق: (۳) R. Devresse: *La Patriarchat d' Antioche... Jusqu'à la conquête arabe*، پیرس ۱۹۴۵ء؛ اسلامی عہد کے بارے میں (۴) عرب جغرافیہ نویسوں کی دی ہوئی معلومات، مرتبۂ لی سٹرینج (G. Le Strange): *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء؛ (۵) یحییٰ بن سعید الانطاکی: نظم الجواھر، در *Corpus scr. chr. or.*، سلسلہ ۲، ج ۲ و ۷ (۱۹۰۶-۱۹۱۰ء) وذیل، در *Patr. or.*، ۱۸: ۵ و ۲۳: ۳ (۱۹۲۴، ۱۹۳۱ء)؛ (۶) A. von Kremer: *Denkschriften d. Wiener Akad. d. Wissensch-aften*، ۱۸۵۲ء؛ (۷) المسعودی: مروج، ۲: ۲۲۶ ببعد، ۲۸۲ ببعد و ۳: ۴۰۶-۴۱۰ و ۴: ۵۵، ۹۱ و ۸: ۶۸-۷۰؛ (۸) نامعلوم مصنّف کی عربی تصنیف (cod. vat. arab.، ص ۲۸۶)، طبع و ترجمہ از I. Guidi، در *Rendiconti ... Lencei*، روما ۱۸۹۷ء (تصحیح از D. S. Margoliouth، در *JRAS*، ۱۸۹۸ء، ص ۱۵۷-۱۶۹)۔ اس کتاب کو حاجی خلیفہ نے بھی جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ، ص ۵۰۵ ببعد، میں استعمال کیا ہے؛ نیز دیکھیے: (۹) R. Dussaud: *Topographie hist. de la*

Syrie antique et médiévale، پیرس ۱۹۲۷ء، بہ امداد اشاریہ؛ (ب) تاریخ: (۱۰) ان مادّوں کے مآخذ جن کا حوالہ اس مقالے میں دیا گیا ہے؛ (۱۱) A. A. Vasiliev: *Byzance et les Arabes*، فرانسیسی طبع از H. Grégoire وغیرہ، ج ۱-۳، برسلز ۱۹۳۵ء؛ (۱۲) E. S. Bouchier: *A Short history of Antioch*، اوکسفرڈ ۱۹۲۱ء؛ (۱۳) C. Cahen: *La Syrie du Nord à l'époque des Croisades*، پیرس ۱۹۴۰ء؛ (۱۴) Gaudefroy-Demombynes: *La Syrie à l' époque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء؛ (ج) سفرنامے: (۱۵) R. Pacocke: *A Description of the East* etc.، لنڈن ۱۷۴۳-۱۷۴۵ء، ۲: ۱۸۸-۱۹۳؛ (۱۶) C. Niebuhr: *Reisebeschreibung nach Arbien*، ایمسٹرڈم ۱۷۷۴ء، ۳: ۱۵-۱۸؛ (۱۷) J. Russegger: *Reisen in Europa, Asien u. Afrika*، شٹٹ گارٹ ۱۸۴۱ء، ۱: ۳۶۳-۳۷۳؛ (۱۸) T. Chesney: *Expedition ... to the rivers Euphrates and Tigris*، لنڈن ۱۸۵۰ء، ۱: ۴۲۵ ببعد؛ (۱۹) H. Petermann: *Reisen im Orient*، لائپزگ ۱۸۶۷ء، ۲: ۳۶۶ ببعد؛ (۲۰) E. Sachau: *Reise in Syrien u. Mesopotamien*، لائپزگ ۱۸۸۳ء، ص ۴۶۲ ببعد؛ نیز دیکھیے (۲۱) V. Cuinet: *La Turuqie d' Asie*، پیرس ۱۸۹۲ء، ۲: ۱۹۳-۱۹۷؛ (۲۲) P. Jacquot: *Antioche , Cantre de Tourisme*، بیروت ۱۹۳۱ء، ج ۲؛ (۲۳) J. Weulersse: *Antioche, Essai de géographie urbaine*، در *B. E. O.*، ۱۹۳۴ء، ص ۲۷-۷۹.

(H. A. R. GIBB و M. STRECK)

⊗ **اَنطالیہ**: (ادالیہ) اناطولیا کے جنوب میں بحیرۂ روم کے ساحل پر اسی نام کی خلیج کے شمال مغربی گوشے میں ایک شہر۔ اس کا نام جو قدیم کتابوں میں اَتالیا (Attaleia, Attalia؛ Peutinger کی جدول میں اَتالیہ Atalia)، نئی یورپی زبانوں میں Adalia اور اکثر ترکی کتابوں میں ادالیہ کی شکل میں ملتا ہے، برگمہ (Bergama) کے حکمران اتالوس ثانی (Attalos II) (۱۵۹-۱۳۸ ق م) کے نام سے ماخوذ ہے، جو اس کے شہر کا پہلا بانی سمجھا جاتا ہے۔ جہان نما، از کاتب چلبی (ص ۶۳۸)، میں اس کا عربی املا ''اوہ طولس'' تحریر ہے۔ اس کا امکان ہے کہ اس شہر کی تعمیر سے پہلے بھی یہاں کوئی بستی موجود ہو (لیکن اس کے باوجود Hirachfeld کے علی الرغم Lanekoronski اس بیان کو کوئی اہمیّت نہیں دیتا کہ یہاں ایک پرانی بستی کوری کوس (Korykos) کے نام سے موجود تھی).

انطالیہ کی جائے وقوع میں بعض ایسے طبعی حالات جاذبِ توجّہ ہیں جن سے یہاں زمانۂ قدیم میں ایک بندرگاہی شہر کا تعمیر کرنا آسان ہو گیا ہوگا۔ اوّل تو اس کا محلِّ وقوع ایک ایسی خلیج کے سرے پر تھا جو خشکی میں دور تک اندر چلی گئی تھی؛ لہٰذا یہ بحیرۂ روم سے اناطولیا کے اندر جانے کے لیے بہت موزوں تھی۔ جنوبی اناطولیا کے پہاڑ، جو علی العموم ساحل سے بہت قریب اور متوازی چلے جاتے ہیں، یہاں سیدھے اندرونِ ملک کی طرف رخ کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کے درمیان خلیج کے سرے پر ایک وسیع سرسبز میدان نکل آتا ہے۔ یہ میدان دور تک پہاڑوں میں پھیلتا چلا گیا ہے، لہٰذا ساحل سے جھیلوں کے علاقے تک اور وہاں سے فریگیا (Phrygia)، یعنی اندرونی اناطولیا کے مغربی حصّے تک ایک قدرتی راستے سے پہنچ جانا نسبۃً آسان ہے۔ اس عمومی منظر کے اندر انطالیہ کے عین محلِّ وقوع میں مختلف سازگار حالات نظر آتے ہیں، مثلاً سمندر کے کنارے بیس بیس تیس تیس میٹر بلند پہاڑیاں ہیں، جنھیں بسہولت قلعہ بند کیا جا سکتا تھا؛ ان پہاڑیوں کے درمیان ایک قدرتی بندرگاہ ہے، جس کے اندر عہدِ قدیم یا ازمنۂ وسطیٰ کے جہازوں کا اچھا خاصا بیڑا سما سکتا ہے اور جو ہر قسم کی آندھیوں اور ریت سے اٹ جانے کی مصیبت سے محفوظ ہے؛ چنانچہ بالآخر سمندری پشتوں (break-waters) کی تعمیر سے یہ ''ایک بند بندرگاہ'' بن گئی۔ اس کے نواح کے دوسرے قصبوں میں ایسے سازگار حالات موجود نہ تھے، چنانچہ ان میں اتالوس (Attalos) کا بنایا ہوا یہ شہر بہت جلد ترقی کر کے سب سے بازی لے گیا۔ لیکن ابھی زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ خاندان اتالوس کے علاقوں کو سلطنت روما نے اپنی قلم رو میں شامل کر لیا اور یہ شہر (آس پاس کے تمام سواحل کی طرح) سمندری ڈاکوؤں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۷۹ ق م میں مشہور قونصل سرویلیوس (P. Servilius) (المعروف بہ ایسوریکس Isaurekus) نے ان ڈاکوؤں کا استیصال کر دیا اور روما کی حکومت کا عملاً آغاز ہوا۔ فصیلوں کی توسیع کر کے انھیں مضبوط کیا گیا۔ بوزنطی زمانے میں انطالیہ کی اہمیت روز افزوں ہوتی گئی اور وہ بحیرۂ روم کی ایک مصروف تجارتی بندرگاہ بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی کشور کشائی کے ابتدائی زمانے میں یہ شہر وقتاً فوقتاً مسلم بحری حملوں کی آماج گاہ رہا اور ۲۴۶ھ/۸۶۰ء میں خلیفہ المُتوکّل کے ترکی النسل امیر البحر فضل بن قارِن نے سمندر کی طرف سے حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد گیارھویں صدی کے نصف آخر میں جب ترکوں نے پورا اناطولیا فتح کیا تو شہر انطالیہ بھی ان کے قبضے میں آ گیا۔ لیکن ۱۱۰۳ء میں بادشاہ Alexis Komnene کی فوجوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ کچھ مدّت بعد ترکوں نے اسے پھر فتح کر لیا اور ۱۱۲۰ء میں بادشاہ John Komnene نے پھر ترکوں سے چھین لیا۔ ۱۱۸۱ء میں سلطان قلیج آرسلان ثانی نے اس شہر کا محاصرہ کیا، لیکن اسے فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لاطینیوں کے قسطنطینیہ کو فتح کر لینے اور بوزنطی سلطنت کی تقسیم کے بعد قلم رو انطالیہ ایک فرنگی مسمی الدوبر اندِن (Aldobrandin) کے قبضے میں آ گیا۔ ۶۰۳ھ/۱۲۰۷ء میں سلطان غیاث الدّین کیخسرو اوّل نے اس کا محاصرہ کیا اور اگرچہ شاہ قبرص کا والی Gautier de Montbéliard فرنگیوں کی ایک جمعیّت ساتھ لے کر مدد کو آیا لیکن انطالیہ پر سلطان کا قبضہ ہو گیا (اس فتح کے بعد سے سلجوقیوں اور اہلِ وینس کے درمیان روابط شروع ہوئے اور اہلِ وینس کو بعض تجارتی مراعات دی گئیں)۔ لیکن Gautier نے، جو شکست کھا کر گرفتار ہو گیا تھا اور بعد ازاں رہا کر دیا گیا، ۱۲۱۵ء میں پھر قبرص سے آ کر انطالیہ پر قبضہ کر لیا اور ترکوں کو تہِ تیغ کیا۔ اناطولیا کے سلطان عزّ الدین کیکاؤس اوّل نے دوبارہ اس شہر پر قبضہ کر لیا اور تمام فرنگی، جن میں Gautier بھی شامل تھا، تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ترکوں نے شہر

پناہ کی مرمّت کی، بندرگاہ کی پرانی گودی اور پشتوں کو نئے سرے سے تعمیر کیا اور جہاز سازی کا ایک کارخانہ بھی قائم کر دیا.

انطالیہ اناطولیا کے سلجوقیوں کے اس بیڑے کا مرکز بن گیا جو بحیرۂ روم میں متعیّن تھا۔ یہاں کے ترک حاکموں کا لقب ملک السّواحل یا امیر السّواحل ہوتا تھا، جسے ترک ''ساحل بے'' کہا کرتے تھے؛ یونانیوں کے ہاں یہ لفظ ''Salbeg'' (سال بیگ) کی شکل میں پہنچا.

ایک زمانے تک انطالیہ (علائیہ کے ساتھ) سلجوقی حکمرانوں کی سرمائی قیام گاہ رہا۔ جب سلجوقی سلطنت کا زوال ہوا تو یہ علاقہ حمید اوغلو خاندان کے ہاتھ آ گیا۔ تیرھویں صدی کے آخر میں الیاس بے کا بیٹا دُندار بے، جس نے جھیلوں کے علاقے میں ایک ریاست قائم کر لی تھی، انطالیہ پر قابض ہو گیا اور اس کی حکومت اپنے بھائی یونس بے کے حوالے کر دی۔ دُندار نے خود اِیلخانیوں کی سیادت تسلیم کر لی تھی، جو اس وقت اناطولیا پر قبضہ و اختیار رکھتے تھے، لیکن ۷۲۴ھ میں اسے اناطولیا کے ایلخانی حاکم دِمرطاش کے حکم سے انطالیہ میں قتل کر دیا گیا۔ تین سال بعد، یعنی ۷۲۷ھ میں اس کے بیٹے اسحٰق بے نے مصر کے اقتدارِ خسروی کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے اپنے باپ کے علاقوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ ادھر انطالیہ میں دُندار کے بھائی یونس بے کے بیٹوں نے بھی حکومت سنبھال لی۔ بعض مؤرّخین حمید اوغوللر قبیلے کی اس دوسری شاخ کو تکہ اوغللری کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سلجوقیوں نے انطالیہ فتح کرنے کے بعد وہاں تکہ ترکوں کو آباد کر دیا تھا، اور اس کا امکان ہے کہ حمید اوغللری کا بھی انھیں میں سے ظہور ہوا ہو۔ بہرحال انطالیہ میں جن لوگوں کی حکومت تھی وہ حمید اوغللری ہی کی ایک شاخ تھے۔ ۱۳۶۱ء میں قبرص کے بادشاہ پیئر (Pierre) نے انطالیہ پر قبضہ کر لیا اور حمید اوغللری مجبور ہو کر شمال کی طرف پسپا ہو گئے، لیکن ۱۳۷۳ء میں یونس بے کے پوتے محمد بے ابن محمود بے نے پھر اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ آخر الذکر کے بیٹے عثمان بے کے زمانے میں انطالیہ ترکان آلِ عثمان کے زیرِ نگین ہو گیا۔ جنگ انقرہ (۱۴۰۲ء) کے بعد اگرچہ عثمان بے نے قرہ مان (Karaman) رئیسوں سے مدد مانگ کر اس شہر پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن انطالیہ کے عثمانلی والی حمزہ بے نے اسے شکست دی اور قتل کر دیا (۱۴۲۲-۱۴۲۳ء)۔ دورِ عثمانی میں یہ شہر تکہ کی سنجاق کا صدر مقام رہا (اگرچہ تکہ کے پاشا وقتاً فوقتاً آلمالی میں بھی رہتے تھے)۔ اولیا چلبی نے، جو ۱۰۸۲ھ/۱۶۷۱-۱۶۷۲ء میں اس شہر میں آیا تھا، انطالیہ کے حالات پوری تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ اس شہر کے گرد ایک فصیل تھی جو ۴۴۰۰ قدم طویل تھی اور جس میں اسّی برج بنے ہوئے تھے۔ اس قلعہ بند شہر کے اندر کم از کم تین ہزار پرانے مکانات تھے، جن کی چھتیں کھپریل کی تھیں۔ یہ مکانات چار محلوں میں منقسم تھے، جن میں تنگ گلیاں تھیں۔ فصیل کے باہر شمال کی طرف بیس ترکی اور چار یونانی محلّے تھے۔ یہ شہر تین اطراف میں باغوں سے گھرا ہوا تھا۔ شہر کی منڈی فصیل کے باہر تھی۔ بندرگاہ، جس کے مدخل پر دو برج بنے ہوئے تھے، کم از کم دو سو جہازوں کے لیے ایک مکمّل اور محفوظ جائے پناہ مہیّا کرتی تھی۔ اس شہر میں گیارہ بڑی مسجدیں (جن میں سے بہترین قویوجی مراد پاشا کی بنائی ہوئی تھی)، سات بڑے مدرسے، بہت سی خانقاہیں، سرائیں اور حمّام تھے۔ انطالیہ میں کئی مختلف زمانوں کی عمارات موجود تھیں، مثلاً جو فصیلیں بندرگاہ کے گرد شہر کے قدیم مرکز کو گھیرے ہوئے ہیں اور اسے اندر کی طرف ذیلی حصّوں میں تقسیم کرتی ہیں، وہ بنیادی طور پر ازمنۂ قدیمہ کی باقیات میں سے ہیں گو ازمنۂ وسطیٰ میں اور زمانۂ حاضر میں بھی بارہا ان کی مرمّت اور استحکامات کی تجدید کی گئی ہے۔ خود ترکوں نے بھی انطالیہ کے استحکامات میں بہت سے اضافے اور ترمیمیں کی ہیں۔ بے اندازہ عمارتی ملبہ بعد کی تعمیرات میں دوبارہ استعمال کیا گیا۔ سلجوقی زمانے میں انطالیہ کو جو اہمیت حاصل تھی وہ اس کے باقی ماندہ آثارِ قدیمہ سے ظاہر ہے، لیکن ان میں سے اکثر بعد کے زمانے میں بالکل ہی کھنڈر ہو گئے۔ اولو (=بڑی) مسجد اب متروک ہو چکی ہے۔ قرہ تای مسجد کا صرف ایک دروازہ، جو نہایت عمدہ نقش و نگار سے مزیّن ہے اور ایک محراب باقی رہ گئی ہے۔ ییولی مسجد میں، جو ۷۷۴ھ/۱۳۷۳ء میں تعمیر کی گئی تھی، ایک خوب صورت خشتی مینار موجود ہے۔ عہدِ سلاجقہ کے دوسرے آثار میں ایک لنگر خانہ، ایک منہدم خانقاہ اور بہت سی تربتیں (مقبرے) موجود ہیں۔ عہدِ عثمانی کی مساجد (مثلاً قویوجی مراد پاشا جامع اور محمد پاشا جامع) بھی قابلِ ذکر ہیں.

موجودہ انطالیہ سمندر سے سیدھی بلند ہوتی ہوئی چٹانوں کے درمیان ایک ہموار میدان میں واقع ہے۔ اگر اسے سمندر میں سے دیکھیں تو قطار در قطار سرخ ٹائلوں کے سفید مکان، مکانوں کے اردگرد ہرے بھرے باغیچے اور پس منظر میں واقع پہاڑ بہت خوش نما نظارہ پیش کرتے ہیں۔ ساحلی چٹانوں کے اوپر سے سمندر میں گرنے والے آبشار اس منظر میں اَور بھی جان ڈال دیتے ہیں۔ ان آبشاروں کا پانی دریائے دوْدِن (Katarraktes) سے آتا ہے، جو شمالی پہاڑوں سے نکلتا ہے، میدانِ انطالیہ کی چونے کی تہوں کے اندر بارہا غائب ہو جاتا ہے اور پھر سطحِ زمین پر نمودار ہو کر شہر کے قریب متعدد ندیوں میں بٹ گیا ہے۔ یہ بے شمار ندیاں شہر کے تمام بیرونی بلکہ اندرونی باغوں کو بھی سیراب کرتی ہیں۔ انطالیہ کی آب و ہوا میں بحیرۂ روم کی آب و ہوا کی امتیازی خصوصیات نمایاں ہیں۔ یہ میدان تین اطراف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے، لہٰذا موسم گرما میں بہت گرم ہوتا ہے (جولائی میں اوسط درجۂ حرارت ۲۸ درجہ سنٹی گریڈ)۔ دوپہر کے وقت گرمی ۴۰ درجے تک پہنچ جاتی ہے اور صرف اس وقت کم ہوتی ہے جب سمندر کی طرف سے ہوا چلنا شروع ہو جائے، چونکہ ہوا میں نمی کی کثرت سے یہ گرمی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے اس لیے آبادی کا ایک بڑا حصّہ موسمِ گرما بسر کرنے کے لیے آس پاس کی پہاڑی چراگاہوں اور گردوپیش کے باغوں میں چلا جاتا ہے۔ اس موسم میں یہاں بارش بھی نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے موسمِ سرما خوش گوار اور معتدل ہوتا ہے (جنوری کا اوسط درجۂ حرارت دس درجے)۔ جاڑے میں کہرا شاذ و نادر پڑتا ہے اور برف باری بھی بہت کم ہوتی ہے۔ زور کی بارش (سال بھر میں ایک میٹر سے زیادہ)

موسمِ خزاں میں شروع ہوکر وسط بہار تک جاری رہتی ہے۔

اس آب وہوا کی وجہ سے اس علاقے میں معتدل درجۂ حرارت کی اور منطقۂ حارّہ کی بہت سی فصلیں اگائی جاسکتی ہیں۔ انطالیہ کے نواح میں بہت سے غلّوں اور سبزیوں کے علاوہ ہر قسم کے پھل خصوصًا نارنگی اور لیموں بلکہ کیلے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں یہاں ایک زراعتی مرکز قائم کیا گیا ہے جس میں منطقۂ حارّہ کی بہت سی فصلوں کے اگانے کے تجربے کیے جارہے ہیں۔ امید ہے کہ رسل ورسائل میں جس قدر ترقی ہوگی اسی قدر یہ علاقہ بالخصوص جلد پیدا ہونے والے پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار کے لحاظ سے اہمیت حاصل کرلے گا۔ اب تک انطالیہ کا بیرونی دنیا کے ساتھ رابطہ زیادہ تر سمندر کے راستے ہی قائم ہے۔ آج کل بڑے جہاز پرانی بندرگاہ کے باہر بآسانی لنگرانداز ہوسکتے ہیں۔ استانبول کے ساتھ ڈاک کے دخانی جہازوں کی آمد و رفت باقاعدہ قائم ہے، اور غیر ملکی جہازوں کے ذریعے انطالیہ کا رابطہ زیادہ تر ایطالیہ، مصر اور شام کی بندرگاہوں سے قائم ہے۔ یہاں سے پھل، لکڑی (سوختنی اور عمارتی)، اناج، کچی دھاتیں وغیرہ برآمد کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف پچھلے دنوں تک خشکی کے ذرائع رسل و رسائل زیادہ تر نذرِ تغافل رہے ہیں؛ چنانچہ اِزمِیر اور مرسین کی طرح انطالیہ اندرونِ ملک سے بالکل منقطع رہا، حالانکہ اس وسیع عقبی علاقے سے اس کی تجارتی سرگرمیاں بہت بڑھ سکتی تھیں۔ اَفیون ـہ۔ انطالیہ ریلوے کی تعمیر سے صورتِ حال بدل جائے گی اور اندرونی اناطولیا کی تجارت کا ایک حصّہ بندرگاہ انطالیہ کی طرف کھنچ آئے گا۔ دریں اثنا انطالیہ اور بُرُدُور کے درمیان ایک اچھی سڑک موجود ہے، جو انقرہ اور استانبول کے ساتھ سریع رسل ورسائل کی ضامن ہے۔

جب تک پچھلے دنوں باقاعدہ سرشماریاں نہیں ہوئیں انطالیہ کی آبادی کے متعلّق کوئی صحیح تصوّر قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ تقریبًا ایک صدی پیشتر Ch. Texier کا اندازہ تھا کہ اس شہر کی آبادی پندرہ اور اٹھارہ ہزار کے درمیان ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں جو تخمینے لگائے گئے ان کی رُو سے تیرہ اور پچیس ہزار کے درمیان آبادی بتائی گئی۔ پہلی جنگِ عظیم سے ایک سال پہلے آبادی پچیس اور تیس ہزار کے درمیان تھی۔ اس کل آبادی میں تین چوتھائی مسلمان اور ایک چوتھائی کلیسائے قدیم (آرتھوڈوکس چرچ) کے پیرو تھے۔ جب آخرالذّکر مسیحی مبادلۂ آبادی کے تحت یونان بھیج دیے گئے تو پورا انطالیہ ترک شہر بن گیا اور اب تک بدستور ہے۔ ۱۹۲۷ء میں اس کی آبادی ۱۷۳۵۶ تھی اور ۱۹۳۵ء میں ۲۲۹۹۳ ہوگئی۔ ان اعداد میں غیر مسلموں اور ان لوگوں کی جن کی مادری زبان ترکی نہیں کل تعداد ایک سو بھی نہیں تھی۔ ۱۹۴۰ء میں شہر کی آبادی بڑھ کر ۲۵۰۷۵ [اور ۱۹۶۰ء میں ۴۱۶۱۳۰] تک پہنچ گئی۔

ولایتِ انطالیہ (جو شروع میں ولایتِ قونیہ سے وابستہ تکۂ سنجاق کی ذیلی ولایت کا صدر مقام تھا) کا رقبہ ۱۹۴۷۹ مربّع کیلومیٹر اور آبادی ۲۴۲۶۰۹ ہے۔ انطالیہ کی قضا کا رقبہ ۲۹۸۹ مربع کیلومیٹر اور آبادی ۴۷۶۹۷ ہے۔ اس اَمر کے باوجود کہ گزشتہ صدیوں میں اس کے بے شمار درخت برباد کردیے گئے اب بھی ولایت انطالیہ کا وہ علاقہ جو جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے ملک بھر میں سب سے بڑا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں ''تختہ جی'' (لکڑہارے)، جو درخت کاٹنے پر زندگی بسر کرتے ہیں اور خانہ بدوش رہتے ہیں، گرمیوں میں اپنے گلّوں اور ریوڑوں کو لے کر گرمائی چراگاہوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس ولایت کی زرعی پیداوار اور جنگلوں کے علاوہ اس میں دولت کے بعض زیرِ زمین وسائل بھی موجود ہیں، جن میں سب سے اہم کروم کی کانیں ہیں (ان سے اب تک صرف جزوی طور پر کام لیا گیا ہے)۔ ان تمام وجوہ سے ولایت انطالیہ ترکی کے ان علاقوں میں سے ہے جن میں آگے چل کر بہت کچھ ترقّی کے امکانات ہیں۔

مآخذ: ان پرانے مشرقی مآخذ میں سے جن میں انطالیہ کے متعلّق معلومات موجود ہیں: (۱) کاتب چلبی: جہان نما، ص ۶۳۸؛ (۲) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۹: ۲۸۵-۲۹۰، قابلِ ذکر ہیں؛ ان کے علاوہ دیکھیے (۳) ابن بطّوطہ: سیاحت نامہ، ج ۱؛ (۴) Strabon: *Géographie*، ۱۴: ۶۶۷.

اس کے علاوہ گزشتہ صدی کی سیاحت وجغرافیے کی بعض کتابوں میں انطالیہ سے متعلّق کچھ تصاویر ملتی ہیں، ان میں سے دیکھیے: (۵) C. Texier: *Asia Mineure*، ص ۷۰۵ ببعد؛ (۶) T. Spratt و E. Forbes: *Travels in Lycia*، ۱: ۲۱۱؛ (۷) رِٹّر (K. Ritter): *Erdkunde*، ۱۹: ۶۲۴ببعد، ۶۴۰ ببعد؛ (۸) E. Reclus: *Nouvelle Géographie Universelle*، ۹: ۶۵۰؛ (۹) W. Ruge: Petermann's *Beiträge zur Géographie von Kleinasian* Mitteilungen، ۱۸۰۲ء)؛ (۱۰) V. Cuinet: *La Turquie d Asiae*، ۱: ۸۵۳-۸۶۳؛ زیادہ حال کی تصانیف کے لیے دیکھیے: (۱۱) Banse: *Die Turkei*، ص ۱۶۰؛ (۱۲) M. Gemal: *Anadolu*، ص ۶۷ ببعد؛ (۱۳) G. Huart: *Epigraphie arabe d asie Mineure* (در *Révue Semitique*، ۱۹۰۵ء)، ص ۶۱؛ از منۂ قدیمہ کے متعلّق کتابیں: (۱۴) Lanckronsky: *Städte Pamphyliens und Pisidie* (وی انا ۱۸۹۰ء)، ص ۱۷-۳۲؛ [انطالیہ کے بارے میں تاریخی کتب وعمارات سے متعلّق ایک مختصر سے نوٹ میں A. Gabriel لکھتا ہے کہ انطالیہ کے بارے میں قطعی طور پر ابھی تک تحقیق وتدقیق عمل میں نہیں آئی، اور زمانۂ قدیم سے متعلّق کتابوں میں Lanckronsky کی مذکورہ بالا تصنیف (فرانسیسی ترجمہ: *Vielles de Pamphylie et de Pisidie*، پیرس ۱۸۹۰ء) کے علاوہ انطالیہ کے مسیحی دور سے متعلّق عمارات کے لیے (۱۵) Hans Ratt: *Kleinasiatische Denkmäler* (لائپزگ ۱۹۰۵ء)، ص ۳۲-۴۶ کے مطالعے کی سفارش کرتا ہے۔] اسلامی عہد کی عمارتوں کے متعلّق اس چھوٹی سی تصویر کے لیے جو R. M. Riefstahl، نے تیار کی تھی دیکھیے: (۱۶) *Turkish architecture in south-western Anatolia*، کیمبرج ۱۹۳۱ء، ص ۴۱-۵۳؛ کتبے از P. Wittek اسی کتاب میں، ص ۷۸-۹۰)؛ انطالیہ کی تاریخ کے متعلّق دیکھیے: (۱۷) حقّی: اَنْدِیلِکْلِرِی، ص ۱۵-۱۸؛ انطالیہ کی تاریخ کے بارے میں اہم مآخذ: (۱۸) الطّبری، مصر ۱۳۲۶ھ، ۲: ۶۰؛ (۱۹) ابن الأثیر: الکامل (بولاق ۱۲۹۰ھ)، ۱۲: ۱۰۵؛ (۲۰) ابن بی بی: مختصر سلجوق نامہ، (شائع کردۂ ہوتسما Houtsma) لائڈن ۱۹۰۲ء، ص ۳۳ ببعد، ۵۱ ببعد، ۹۷، ۱۰۳ ببعد، ۱۱۲ ببعد، ۱۲۳، ۱۲۷ ببعد، ۱۴۲، ۱۴۷، ۱۵۳، ۱۸۲، ۱۹۹، ۲۱۲، ۲۷۳، ۲۸۴، ۲۸۷ ببعد، ۲۹۶؛ (۲۱) Chalandon: *Les Comménes*، پیرس ۱۹۰۰ء، ۱: ۱۹۷-۲۳۴ و ۲ (پیرس ۱۹۱۲ء): ۳۸، ۴۸، ۱۱۳، ۱۸۱ ببعد، ۱۹۸؛ (۲۲) de Mas Latri:

Hist. de l lle de Chypre (پیرس ۱۸۶۱ء) ۱: ۱۷۴؛ ۲: ۱۳ ببعد، ۲۶۵ ببعد؛ (۲۳) محمد عارف، احمد توحید و علی: مختلف مقالات قسمۃ انطالیہ (در *TOEM* و *TTEM*)؛ (۲۴) سلیمان فکری: انطالیہ لواسی تاریخی، استانبول ۱۳۳۹ - ۱۳۴۰ھ؛ (۲۵) گِنِل نور فوس صایمی [مردم شماری عمومی،] ۱۹۳۵ء، ۶: ۷۵.

(BASIM DARKOT)

---

* **اَنْظُرْ طُوْس:** رک بہ طَرْطُوس.

---

* **اَنْطُون فَرَح:** رک بہ فَرَح.

⊗ **اَلْاَنعام:** قرآن مجید کی چھٹی سورت کا نام۔ یہ سورت ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ اس میں بیس رکوع اور ایک سو پینسٹھ آیات ہیں۔ پوری کی پوری سورت اکھٹی ہی نازل ہوئی تھی (البحر المحیط)۔

اس سورت میں بعض دوسرے موضوعات کے علاوہ توحیدِ الٰہی کا مضمون بیان کیا گیا ہے اور اس تعلق میں نور و ظلمت کے پجاریوں یعنی مجوس کی موحّدانہ حالت (آیت ۱، ۶۳) اور ان مشرکانہ رسوم کا ذکر کیا ہے جو چوپایوں سے متعلّق دنیا کی بعض اقوام میں پائی جاتی ہیں (آیت ۱۳۷)۔ اسی طرح کواکب پرستی کا ابطال کیا گیا ہے (آیت ۷۷) اور اسی ضمن میں رسالت کا ذکر اس تعلّق سے آیا ہے کہ توحید کا قیام و احیا اسی سے وابستہ ہے اور اسی تعلق سے توحید کے دو زبردست علم بردار نبیوں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے علاوہ سترہ دوسرے انبیاؑ کا ذکر کیا گیا ہے (آیت ۸۵ ببعد)۔ پچھلی سورت کا اختتام عقیدۂ تثلیث کے ابطال سے ہوا تھا اس کا آغاز شرک فی الذات کے عقیدۂ ثنویہ سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ خدا دو ہیں، ایک خالق شر و ظلمت اور دوسرا خالق خیر و نور [یہ اس سورت کی پہلی ہی آیت سے واضح ہے]۔ یہ آتش پرستوں کا عقیدہ ہے۔ ابوعبداللہ الرازی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ظلمت اور تاریکی کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ تاریکی نور کے فقدان کا نام ہے (البحر المحیط)۔ خالق ایک ہی ہے۔ یہی وہ باریک حکمت ہے جس کی وجہ سے پہلی ہی آیت میں زمین و آسمان کی تخلیق کے لیے تو "خَلَقَ" کا لفظ استعمال کیا ہے اور ظلمت و نور کے ساتھ "جَعَلَ" کا اور اس طرح بتایا کہ خالقِ شر کوئی الگ وجود نہیں۔ یہ سب کچھ اس مسبّب الاسباب خدا کی قدرتوں کا پرتو ہے اور اس کی ذات میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ زمخشری نے لکھا ہے: خلق کے لفظ میں تقدیری معنی پائے جاتے ہیں اور جعل میں تصییری (کشاف)، اور اسماء اللہ میں سے اس کا اسم ذات اللہ استعمال کیا ہے (آیت ۳۰)، جس کا کبھی کوئی شریک نہیں ہوا نہ یہ نام کبھی کسی دوسرے معبود کے لیے استعمال ہوا۔ پھر اس آیت میں اس کے علمِ کامل کا ذکر کیا ہے، جو اس کی مخلوق میں ظاہر ہوا اور بتایا ہے کہ اس میں بھی کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس کے بعد اس طرف توجہ دلائی ہے کہ زمان اور مکان دونوں لحاظ سے سب کچھ اسی ذاتِ واحد کا ہے۔ وہی فاطر (آیت ۱۴) یعنی سب کی ابتدا اور اختراع کرنے والا ہے (لسان، تحت ف ط ر) اور ہر قسم کی احتیاج سے پاک اور رزّاق اور قاہر اور رَحِیم ہے اور عبادت اسی کی ہو سکتی ہے۔ فطرت سلیم کی شہادت بھی توحید کے حق میں ہے؛ پھر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے عہد کا ذکر کر کے بتایا کہ عنقریب وہ وقت آئے گا کہ یہ ظالم مشرک شرک سے اپنی بے زاری کا اظہار کریں گے۔ یہ ظالم ہیں اور ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتے (آیت ۲۱ ببعد، ۴۵)۔

پانچویں رکوع میں ظالموں کی ہلاکت کے ذکر کے بعد فرمایا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن یعنی لوگوں کے لیے مصیبتوں اور عذابوں کا آنا بلکہ قوموں کا استیصال بھی دراصل ربوبیت کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا کے معًا بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن کے الفاظ استعمال کیے ہیں یعنی قوموں کا استیصال محامد الٰہیہ کے منافی نہیں ہے۔ اور اس طرح ثنویت کی تردید کی ہے۔ چھٹے رکوع میں توحید پرستوں پر انعامات و احسانات کا ذکر ہے۔ توحید کے علم بردارِ اعظم محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح آپؐ شرک اور بت پرستی سے محفوظ اور فطرت کے راستے پر گامزن رہے اور بڑے زور سے یہ اعلان کیا: اِنِّیْ نُھِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (آیت ۵۶) اور کہا: اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ۔ اس میں توحید کو "بَیِّنَہ" کا نام دیا ہے، جس کی طرف فطرت، عقل اور وحی نے راہ بری کی ہے۔ آٹھویں رکوع میں حفاظتِ کائنات کے قانون کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان مخالفتوں کا ذکر کیا ہے جو توحیدِ الٰہی کو دنیا میں پھیلنے سے روکنے کے لیے کی جاتی ہیں اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے سامان پیدا فرماتا رہتا ہے کہ مخالف طاقتیں کمزور ہوتی رہتی ہیں۔ اس ضمن میں توحید کی حفاظت کے لیے موحّدین کو کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔ پھر توحید کے حق میں چند دلائل بیان کرنے کے لیے مشرکوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک مناظرے کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ امن و اطمینان کا حصول توحید ہی کے ذریعے ممکن ہے اور مختلف قسم کے انسانی کمالات اور مختلف نیکیاں توحید کے مختلف پہلوؤں ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ توحید کو دنیا میں ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے ایک ایسی کامل کتاب یعنی قرآن مجید کے نزول کا ذکر کیا ہے جس کی خیر کبھی منقطع نہیں ہوگی اور وہ اپنے دعاوی کی سچائی کے لیے اپنے سے باہر کسی چیز کی محتاج نہیں۔ بارھویں رکوع میں قدرت کاملہ کے بعض مظاہر کی طرف توجّہ دلا کر توحید کا سبق دیا ہے اور ساتھ ہی بتایا ہے کہ توحید کا جو پیغام محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم لائے ہیں اس کی مثال دانے کی ہے جو نشوونما پا کر آخر دنیا پر چھا جائے گا اور ایک ہی ترکیب لفظی سے ان دونوں مضامین کو کمال بلاغت سے بیان کیا ہے۔ تیرھویں رکوع میں شرک کے سب سے زیادہ فتنہ انگیز پہلو کا ذکر کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں قرار دینا۔ اس صورت میں شرک کا مختلف پہلوؤں سے ابطال کیا گیا ہے۔ اس سے ایک غلط روی کے پیدا ہونے کا بھی ڈر تھا اس لیے اس طرف توجہ دلائی کہ بے شک شرک حد درجہ فاسد عقیدہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم معبودان باطلہ کو سب و شتم سے یاد کرنے لگو۔ اس طرح

مذہبی منافرت سے بچایا ہے۔ لوگ عموماً اس اصول کو نظر انداز کر کے محض مذہب کی خاطر ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مذہب تو صلح، امن، آشتی اور باہم حسن سلوک کا علم بردار ہے۔

چودھویں رکوع کے آخر میں ابطال شرک کا مضمون نہایت ہی لطیف ہو گیا ہے اور بتایا ہے کہ عقائد اور خیالات کا تعلّق انسان کی غذا کے ساتھ بھی بہت گہرا ہے، اس لیے ان غذاؤں سے سے بھی مجتنب رہنا چاہیے جن کا تعلق شرک کے ساتھ ہے۔

مشرکانہ رسوم جب کسی قوم کی روزمرّہ زندگی کا حِصّہ بن جاتی اور خون میں رچ جاتی ہیں تو انھیں دور کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے اثباتِ توحید اور ابطالِ شرک پر دلائل و براہین پیش کرنے کے بعد آخر میں ان مشرکانہ رسوم سے بحث کی ہے اور ان کا بڑے زور سے ابطال کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالٰی کے لیے خود اس کی بنائی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں ہی سے ایک حصّہ مقرر کیا ہے اور بزعم خود شارع بن کر کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کے لیے ہے اور یہ ان کے لیے جنھیں ہم نے اللہ کا شریک ٹھیرایا ہے۔ پھر جو حصّہ ان کے ٹھیرائے ہوے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا، مگر جو کچھ اللہ کے لیے مقرّر کیا ہوتا ہے وہ ان کے ٹھیرائے ہوے معبودانِ باطلہ کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ لوگ کیسے برے فیصلے کرتے ہیں اور دیکھو اسی طرح بہت سے مشرک ہیں کہ ان کی نظر میں ان معبودانِ باطلہ نے قتلِ اولاد ایسا وحشیانہ فعل بھی خوش نما کر دکھایا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ (اخلاقی، قومی اور نوعی) ہلاکت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور بعض جانوروں اور کھیتیوں کے متعلّق کہتے ہیں کہ انھیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا چاہیں حالانکہ ان کی پابندی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں کہ ذبح کرتے ہوے ان پر اللہ تعالٰی کا نام نہیں لیا جاتا۔ یہ سب کچھ انھوں نے اللہ تعالٰی پر افترا کیا ہے۔ عنقریب اللہ تعالٰی انھیں ان کی افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا۔ یہ کہتے ہیں کہ ان چوپایوں کے پیٹ میں سے جو زندہ بچہ پیدا ہو وہ مَردوں کے لیے تو حلال ہے لیکن عورتوں کے لیے حرام۔ اور اگر مُردہ ہو تو پھر اس کے کھانے میں مرد و عورت سب شریک ہیں۔ یہ باتیں جو انھوں نے گھڑی ہیں ان کا بدلہ اللہ تعالٰی انھیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ لوگ زیاں کار ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیے ہوے رزق کو اللہ پر افترا کر کے حرام ٹھیرا لیا۔ اس کے بعد بعثتِ اسلام سے قبل عربوں کے بعض توہّمات کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ایک ہی جانور کا نر حلال اور مادّہ حرام یا مادّہ حلال اور نر حرام کر لیے گئے ہیں یا جانور خود حلال ہے مگر اس کا بچہ حرام۔ غرض ایسی تمام لغویات کا ابطال کیا ہے (آیت ۱۱۷-۱۴۴) اور بتایا ہے کہ یہ سب فضول رسمیں ہیں۔ صحت مند معاشرہ ایسی لغو اور بے اصل باتوں کی پیروی سے قائم نہیں ہوتا بلکہ اس کے قیام کی دوسری راہیں ہیں؛ چنانچہ اٹھارھویں رکوع میں بطورِ مثال قوموں کی ترقی کے لیے بعض احکام دیے ہیں اور اس طرح بتایا ہے کہ قرآن مجید نے توحید کی تلقین کسی ذہنی تفریح کے لیے نہیں کی کہ محض چند بڑے بڑے عالی دماغ لوگوں کے لیے بلند و بالا نظریوں کی دعوت کا سامان مہیّا ہو جائے بلکہ افراد کی زندگیوں پر توحید کا عملی اثر ڈالنا مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کا نام بھی ایسا تجویز کیا ہے جس کا تعلق عموماً لوگوں کی گھریلو زندگی سے ہے اور ان رسوم کا ذکر کیا ہے جو لوگوں کی عملی زندگی میں رچ بس گئی تھیں۔

یہ سورت ترتیبِ نزول کے لحاظ سے مقدّم الذّکر چار سورتوں سے بہت پہلے کی ہے مگر ترتیبِ تلاوت کے لحاظ سے اسے بعد میں رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے حکم خداوندی کے ماتحت سورتوں کو ان کی نزولی ترتیب کے مطابق نہیں بلکہ مضامین کی طبعی ترتیب کے مطابق رکھا ہے۔ پچھلی سورت میں ربوبیت اور عقیدۂ تثلیث کا ابطال کیا گیا تھا اس سورت میں توحید کے مضمون کو مکمّل کرنے کے لیے دو خداؤں کے عقیدے اور شرک کے دوسرے پہلوؤں کی تردید کی گئی ہے۔ پچھلی سورت میں توحید پر عیسائیوں سے سیّد الانبیاءؐ کے ایک مباحثے کا ذکر تھا۔ اس سورت میں دوسرے مشرکوں کے ساتھ توحید پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک مباحثے کا بیان ہے، جس میں آپؑ نے کمال ایقان سے کواکب پرستی کا مدلّل ابطال کیا ہے۔ ابن حیّان اور علامہ طنطاوی نے پچھلی سورت المائدہ کے اختتام سے اس سورت کے آغاز کے ربط پر لطیف بحث کی ہے۔ اَنعام، یعنی چوپایوں کے بارے میں عربوں کے رسوم کے لیے دیکھیے بلوغ الارب از محی الدین العطار، عبیہ (لبنان) ۱۳۱۹ھ۔

(ادارہ)

اِنْف: (Enif)، الانْف = ''ناک''، دوسرے سے تیسرے درجے [یا مقدار Magnitude] کا ستارہ، جو شکل فلکی الفَرَس (Pagasus) میں واقع ہے، جسے عرب ''الفَرَسُ الاعظم'' کہتے ہیں، قزوینی اور الغ بیگ نے اس ستارے کو فَمُ الفَرَس (گھوڑے کا منہ) لکھا ہے، مؤخّر الذّکر اسے جَحْفَلَۃُ الفرس (گھوڑے کا ہونٹ) بھی کہتا ہے، البتّانی نے اس کا کوئی خاص نام نہیں بتایا، بلکہ وہ اسے ''وہ ستارہ'' کہتا ہے جو گھوڑے کے منہ میں ہے، تاہم لفظ اِنف غالباً مغرب کے عرب ہیئت دانوں کی تصانیف کے ذریعے قرونِ وسطٰی کے لاطینی ترجموں میں داخل ہوا۔

مآخذ: (۱) البتّانی: *Opus astronomieum* (طبع نالینو Nallino)، ۲: ۱۵۴، ۳: ۲۵۴؛ (۲) القزوینی: *Kosmographie* (طبع وسٹنفلڈ Wüstenfeld)، ۱: ۳۴-۳۵؛ (۳) L. Indeler: *Untersuchungen über den Ursprung u. die Bedeutung der starnnamen*، (برلن ۱۸۰۹ء)، ص ۱۱۷۔ [نیز دیکھیے آر، لائڈن، طبع ثانی، ۲: ۶۹۸]۔

(H. SUTER)

اَنْفا: کاسابلانکا (Casablanca) کا قدیم نام (عربی: الدّار البیضاء، عوامی تلفّظ: ضارلْبَیضا)؛ پرتگالی تواریخ میں اکثر اوقات Anafe لکھا گیا ہے۔ E. Laoust (در *REI*، ۱۹۳۹ء) کے بیان کے مطابق یہ بربری لفظ افَا (afa) کی بدلی ہوئی صورت ہے، جس کا مفہوم پہاڑ کی چوٹی یا چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ خیال ہے کہ اس

کا ابتدائی محلِّ وقوع اس پہاڑی پر ہوگا جہاں اس وقت آبادی ہے جسے ''بالائی انفا'' کہتے ہیں۔ مارمول (Marmol) اس کی بنا کو قرطاجنیوں (Carthaginians) کی طرف اور لیو (Leo) رومیوں کی طرف منسوب کرتا ہے، لیکن ان میں سے کسی نظریے کے ثبوت میں کوئی تحریر ملتی ہے نہ عمارتی آثار سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ الزّیانی اس کی تعمیر امرائے زَناتہ کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس کی تاریخ پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے اواخر کی بتاتا ہے، لیکن اپنے مآخذ کا ذکر نہیں کرتا۔ الاِدریسی اس بندرگاہ کے ذکر میں کہتا ہے کہ اس کے زمانے میں یہاں غلّوں کی برآمدی تجارت خوب ہوتی تھی۔ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ اس شہر نے بَرْغَواطا [رک بآں، بربری قبائل کا ایک وفاق] کے واقعے میں کیا حصّہ لیا۔ مرینیوں کے عہدِ حکومت میں اَنْفا کا نام صوبۂ نامُسْنا کے دارالحکومت کے طور پر آتا ہے؛ اس میں ایک مستحکم شہر پناہ تھی اور ایک والی اور قاضی تھا؛ ابوالحسن نے یہاں ایک مدرسہ بھی بنایا تھا۔ خاندانِ مذکور کے زوال کے ساتھ یہاں فوضویّت کا جو دور دورہ ہوا اس میں یہ شہر عملاً آزاد ہوگیا اور... [پرتگیزوں نے اسے تباہ و برباد کیا اور یہ اسی حالت میں رہا] یہاں تک کہ سلطان سیدی محمد عبداللہ نے اسے اٹھارھویں صدی میں ازسرِنَو تعمیر کیا۔ اس وقت سے اس کا نام دارالبَیْضاء [رک بآں] پڑ گیا۔

مآخذ: (۱) الاِدریسی: *Descr. de l'Afr. et de l' Esp.*، فرانسیسی میں ڈوزی (Dozy) اور ڈخویہ (de Goeje) نے ترجمہ کر کے شائع کیا، ۱۸۶۶ء، ص ۸۴؛ (۲) Mormol: *L. Afrique*، فرانسیسی ترجمہ از Perrot d' Ablancourt، ۱۶۶۷ء، ۲، ۱۴۰؛ (۳) Leo Africanus: *Descr. de l' Afrique*، طبع شیفر (Scheffer)، ۱۸۹۷ء، ۲: ۹-۱۳؛ (۴) *Une description géographique du maroc d' Az-Zyâny*، ترجمہ فرانسیسی از Coufourier، در *AM*، ۱۹۰۶ء، ص ۴۵۲؛ (۵) لیوی پروونسال (E. Lévi Provençal): *Un nouveau texte de histoire mérinide: le Musnad d' Ibn Marzūḳ Hesp.*، ۱۹۲۵ء، ص ۶۹؛ (۶) David Lopes، در *Historia de Portugal*، طبع Damião Peres، ۱۹۳۲ء، ۳: ۵۳۶-۵۳۷؛ (۷) Robert Ricard: *Sources inédites de l' histoire du Maroc*، سلسلۂ اوّل، Dynastic Sa' dienne، پرتگال ۱۹۳۳ء، ۵: xv-xvi.

(A. ADAM)

---

* **اَلْاَنْفال:** قرآن مجید کی آٹھویں سورت کا نام۔ یہ سورت جنگ بدر کے بعد ۲ھ میں نازل ہوئی (اتقان؛ تفسیر المنار)۔ اس میں دس رکوع اور بسم اللہ کے علاوہ پچھتر آیتیں ہیں۔ انفال کے معنی ہیں دشمن کا وہ مال (غنیمت) جو باقاعدہ جنگ میں ہاتھ آئے اور فدیے کی رقوم بھی اس میں شامل ہیں۔ لغت کے بعض ماہروں کے نزدیک نَفَل اور غنیمت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور ان میں صرف اعتباری فرق ہے، اس جہت سے کہ وہ فتح کے بعد اور مظفّر و منصور ہو کر ملتا ہے اسے غنیمت کہا جاتا ہے اور اس جہت سے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے اور اس پر اس کا عطا کرنا لازم نہیں نفل ہے (مفردات، بذیلِ مادّہ)؛ بعض کے نزدیک ان میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے، یعنی غنیمت عام ہے اور ہر اس مال کو کہتے ہیں جو دشمن سے حاصل ہو، خواہ اس کے حصول میں مشقّت کی گئی ہو یا بلا مشقّت ہوا ہو، فتح سے قبل ملا ہو یا بعد میں اور استحقاق سے حاصل ہو یا بغیر استحقاق کے اور نفل خاص ہے اور اس مال کو کہتے ہیں جو غنیمت سے قبل از تقسیم حاصل ہوا ہو۔ بعض کے نزدیک نفل وہ مال ہے جو جنگ و جدل کے بغیر حاصل ہو اور بعض نے کہا ہے کہ جو مال تقسیمِ غنائم کے بعد بانٹا جائے اسے نفل کہا جاتا ہے (مفردات)۔ فَیْئ اور نَفَل میں یہ فرق ہے کہ فَیْئ کے لیے ضروری ہے کہ جنگ کی تیّاری ہو چکی ہو اور پھر دشمن نے ہتھیار ڈال دیے ہوں لیکن نفل کے لیے یہ ضروری نہیں۔ بہرحال اَنْفال نفل کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں جس قدر واجب ہو اس پر اضافہ اور زیادتی اور اسے 'نافلۃ' بھی کہا جاتا ہے۔ اسی معنی میں نفلی نماز ہے۔ النّوفل کے معنی ہیں عطائے کثیر (دیکھیے مفردات ولسان العرب، تحت نفل)۔

اس سورت کا مرکزی مضمون جنگِ بدر (رمضان ۲ھ، ابن ہشام، ۲: ۲۶۶، طبع عبدالحمید) اور اس سے متعلقہ واقعات ہیں، جس میں مسلمانوں کو مالِ غنیمت بھی ملا اور انھوں نے جنگی قیدی بھی بنائے۔ اس لیے پہلی ہی آیت میں اَنفال کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ انفال اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہے (قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُولِ) یعنی جنگ میں دشمن کا مال یوں جائز ہے کہ قومی مفاد کے لیے بیت المال میں پہنچا دینا چاہیے نہ یہ کہ جو مال جس کے ہاتھ لگے وہی اس کا مالک ہو جائے، بلکہ ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ ہو۔ اسلامی جنگوں کی اصل غرض مال کا حاصل کرنا اور غنیمتوں کا لوٹنا نہیں اسی لیے انفال کے ذکر کے فوراً ہی بعد زندگی کے اصل مقصد اور حقیقت ایمان کی طرف توجہ دلائی ہے (فَاتَّقُوا اللّٰهَ ... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا، آیت ۱-۴) اور معاشرتی اصلاح، خدا و رسول کی اطاعت اور اعمالِ صالحہ بجا لانے کی تلقین کی ہے اور جنگ کے لیے تیار کرتے ہوئے قیامِ نماز اور انفاق فی سبیل اللہ، تکبّر سے اجتناب اور خوفِ خدا کی ہدایت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کی جنگیں (تکبّر سے) پاک تھیں اور بڑی بڑی فتوحات کے وقت بھی انھوں نے دشمن کے ساتھ کمال عفو و درگزر سے کام لیا ہے اور بلا وجہ خون ریزی نہیں کی۔ پھر اصل مضمون جنگِ بدر کا ذکر کیا ہے (كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ ... الخ) اور بتایا ہے کہ اس جنگ کی اصل غرض احقاقِ حق ہے اور یہ کہ دشمنوں کی کمر توڑ دی جائے تاکہ صداقت کی جس آواز کو وہ دبانا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کے استیصال کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ان کوششوں پر کاری ضرب لگے اور دین کا بول بالا ہو۔ اس لیے جنگِ بدر کا ذکر ''كَمَا'' (= جس طرح) کے لفظ سے کیا ہے۔ اس میں اشارہ اس سے پہلی آیات کے مضمون کی طرف ہے۔ یعنی مومن کا اصل کام تو وہی ہے جو اوپر کی آیات میں بیان ہوا ہے، یعنی تقوٰی، صلح و آشتی، خداخوفی، ایمانی منازل کو بڑھ چڑھ کر طے کرنا، نمازوں کا قیام اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی طاقتوں اور اموال کا خرچ کرنا، رزقِ حلال و طیب وغیرہ۔ انھیں اغراض کے لیے مسلمانوں کو جنگِ بدر کے لیے نکلنا پڑا (اس جگہ کما کے لفظ کے

استعمال کی وجوہ کے لیے دیکھیے: ابن جریر، کشاف، تفسیر المنار)۔ یہ جنگ کن حالات میں لڑی گئی: اوّل یہ ہے کہ آنحضرتؐ اپنی خواہش یا لوگوں کے کہنے سے نہیں نکلے تھے بلکہ حکمِ الٰہی کے ماتحت انھیں یہ اقدام کرنا پڑا (کَمَآ اَخْرَجَکَ رَبُّکَ ...) اور اس اقدام میں وہ حق پر تھے، یعنی یہ اقدام اس کے مطابق تھا جو واجب تھا (بِالْحَقِّ)، اسی انداز سے تھا جو واجب تھا اور اس وقت میں ہوا جو واجب تھا (مفردات، بذیل مادّۂ حق)۔ دوسری جگہ قرآن نے جنگِ بدر کو جہاد قرار دیا ہے اور اس میں حصّہ لینے والوں کو "مجاہدین" کہا ہے وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ ...(۴[النساء]: ۹۵) اور مسلمانوں کے ایک حصّے کے لیے یہ اقدام بڑا ہی شاق اور مشکلات کا موجب تھا (وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ، آیت ۵)۔ وہ خوشی سے اور کسی لوٹ کھسوٹ اور غنائم کے لیے اپنے گھروں سے نہیں نکلے تھے بلکہ ان کا یہ حال تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔ واقعات یہ تھے کہ مہاجرین بے سروسامان، انصار ابھی ناآزمودہ، یہود برسرِ مخالفت، منافقوں کی ریشہ دوانیاں مستزاد، گردوپیش کے عرب قبائل قریشِ مکّہ سے مرعوب اور مذہبًا ان کے ہمدرد۔ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ (آیت ۶) میں بتایا ہے کہ جنگ کی ضرورت صاف صاف ظاہر ہو چکی تھی۔ اور اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (۲۲[الحج]: ۳۹)، اور قٰتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقٰتِلُوْنَكُمْ (۲[البقرۃ]: ۱۹۰) میں بتایا ہے کہ یہ مظلوم تھے اور مجبور ہوے کہ حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے میدان میں نکلیں۔ مسلمان ابھی مدینے سے روانہ بھی نہ ہوے تھے کہ کفّار کی زبردست فوج ابوجہل کی کمان میں مکّے سے روانہ ہو چکی تھی اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اس کی اطلاع مل چکی تھی (احمد بن حنبل: مسند، ۱: ۱۱۷)۔ عین اس وقت ایک تجارتی قافلہ شام سے ابوسفیان کی سرکردگی میں مکّے کو واپس ہو رہا تھا اور اس کی اطلاع بھی مسلمانوں کو تھی (مسلم، باب غزوۂ بدر)۔ مذکورۂ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ابوجہل کی مسلّح فوج سے مقابلے کے لیے نکلے تھے نہ کہ ابوسفیان کے قافلے کو لوٹنے کے لیے۔

احادیث کے مطالعے سے بھی یہی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے صحابہ کرامؓ کے سامنے اس معاملے کو رکھ کر ساری صورتِ حال واضح کر دی تو مہاجرین میں مقداد بن عمروؓ (جن کا دوسرا نام مقداد بن الاسود بھی ہے) نے اٹھ کر کہا: یارسول اللہؐ جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے اس طرف چلیے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵[المائدۃ]: ۲۴= جا! تو اور تیرا رب دونوں (مخالفوں سے) جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں) بلکہ ہم تو آپؐ کے ساتھ جانیں لڑا دیں گے اور آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے جب تک ہم میں سے کسی ایک کی آنکھ بھی گردش کر رہی ہے (البخاری: کتاب المغازی؛ ابن الاثیر: تأریخ، ۲: ۵۶ ببعد)۔ اس کے بعد انصار میں سے سعدؓ بن معاذ نے کہا: یا رسول اللہؐ جو کچھ آپؐ نے ارادہ فرمایا ہے اسے کر گزریے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق و حکمت کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپؐ ہمیں لے کر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم آپؐ کے ساتھ کود پڑیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ ہمیں یہ ہرگز ناگوار نہیں کہ آپؐ ہمیں لے کر کل دشمن سے نبرد آزما ہوں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے اور مقابلے میں سچی جاں نثاری دکھائیں گے (مسلم، اور کتاب المغازی؛ ابن ہشام، ۲: ۲۵۴، طبع عبدالحمید)۔ یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ اور اکابر صحابہؓ قافلے کو لوٹنے کے لیے نہیں بلکہ ابوجہل کی ساز و سامان سے لیس فوج کے مقابلے کے لیے نکلے تھے جو عمرو بن حضرمی کے قتل کا بدلہ لینے (ابن الاثیر: تأریخ، ۲: ۵۴، مصر ۱۳۰۱ھ) اور اس بہانے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے مدینے کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جب ابوجہل سے کہا گیا کہ ابوسفیان کا قافلہ بچ کر مکّے کی طرف جا چکا ہے پھر بھی اس نے واپس ہونے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں کی طرف بڑھا (بحوالہ سابق)۔ بدر مدینے سے قریب اور مکّے سے دور تھا لیکن کفّار مقامِ بدر پر مسلمانوں سے پہلے پہنچے تھے (ابن ہشام)۔ بعض روایات کی رُو سے مسلمان پہلے پہنچے تھے، تاہم یہ ثابت ہے کہ ان لوگوں کی مکّے سے روانگی کی اطلاع کے بعد آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم مدینے سے روانہ ہوے تھے۔ حضور علیہ السلام نے جنوب مغرب کی راہ لی یہ وہ راستہ تھا جدھر سے قریش کا لشکر آ رہا تھا، حالانکہ اگر قافلے کو لوٹنا مدِّنظر ہوتا تو شمال مغرب کی راہ لی جاتی جو شام سے مکّے جانے کے لیے کاروانِ تجارت کا راستہ تھا۔

بعض مسلمان جو کم زوری کی حالت میں تھے، چاہتے تھے کہ جنوب سے آنے والی ابوجہل کی فوج سے مٹھ بھیڑ کے بجاے شمال سے آنے والا ابوسفیان کا قافلہ انھیں مل جائے (غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ) لیکن اللہ تعالٰی اور اس کے رسولؐ کا منشا یہ نہ تھا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی فتح کی پیشگوئیوں کے پورا ہونے اور کفّار کی طاقت کچلنے کا وقت آ چکا تھا۔ نویں آیت (اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ ...) میں بتایا کہ مسلمان جنگوں میں اپنی طاقت پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ دست بدعا ہوتے ہیں تب فرشتے ان کی مدد کرتے ہیں، تاکہ دشمن مرعوب ہوں اور مومنوں کو طمانینت عطا کرتے ہیں (جنگ بدر کے متعلّق مزید دیکھیے مادّۂ بدر، العطار: بلوغ الارب، مطبوعہ عربیہ (لبنان) ۱۳۱۹ھ، ص ۴۳ ببعد)۔ جنگِ بدر کے ابتدائی مراحل بیان کرنے کے بعد دوسرے رکوع میں میدانِ جنگ کی کیفیت بیان کی ہے اور عین حالتِ جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور بتایا ہے کہ مسلمان کا یہ کام نہیں کہ دشمن کو پیٹھ دکھائے اور اسے یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسان کے اعمال و افکار میں حکمتِ الٰہیّہ کا ایک خاص قانون کام کر رہا ہے اس لیے مسلمانوں کو اپنے دل کی نگرانی سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اس جنگ کے نتائج پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اس جنگ کے نتیجے میں گو کفّار کی حقیقی طاقت ٹوٹ جائے گی لیکن ان کی طرف سے جنگیں جاری رہیں گی اور وہ موجودہ تعداد سے زیادہ کی فوج لے کر

حملہ آور ہوں گے لیکن ان کا جتھا اور ان کی فوجی تیاریاں ان کے کسی کام نہیں آئیں گی۔ اللہ تعالیٰ کی مدد مومنوں ہی کے شامل حال ہوگی اور کُفّار کی حالتِ عناد آخر انھیں برباد کر کے رکھ دے گی۔ حقیقی زندگی اس رسولؐ کی متابعت میں ہے اور اس میں حقیقی ترقّی کا راز ہے۔ چوتھے رکوع میں اور اس کے بعد کُفّار کی آئندہ سرگرمیوں اور اس عذاب کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگِ بدر کے بعد کُفّار ابھی اَور لڑائیاں بھی لڑیں گے اور فوجی تیاریوں پر ان کا روپیہ صرف ہوگا لیکن آخر مغلوب ہوں گے اور پیشگوئی کی ہے کہ آئندہ مسلمان ہی خانۂ کعبہ کے متولّی رہیں گے اور کافروں اور مسلمانوں میں کھلا امتیاز قائم ہو جائے گا۔ پس جنگِ بدر میں مسلمانوں کا کُفّار کے مقابلے کے لیے نکلنا محض اس مصلحت ایزدی سے تھا ورنہ مسلمانوں میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ اتنی بڑی جمعیت سے مقابلے کے لیے نکلتے۔ جنگِ بدر کو 'فرقان' قرار دیا ہے اور اس کی وجہ بتائی ہے۔ پھر جنگوں میں ثابت قدمی اور توکّل کی نصیحت کی ہے۔ کفّار کی بدعہدیوں کا ذکر کیا ہے۔ آٹھویں رکوع میں دشمن کے مقابلے کی تیاری کی طرف توجّہ دلائی ہے لیکن صلح کو ہمیشہ مقدّم رکھا ہے؛ اور ساتھ ہی مسلمانوں میں باہمی الفت پیدا کرنے کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کی زیادہ تعداد سے کبھی نہ گھبراؤ۔ نویں رکوع میں مسئلۂ غلامی کو حل کیا ہے اور بتایا ہے کہ شدید جنگ اور اس میں غلبے کے بغیر جنگی قیدی نہیں بنائے جا سکتے اور ترک موالات کے اصول بتائے ہیں اور بتایا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں پر ایک دوسرے کی مدد فرض ہے۔

اس سے پچھلی سورت میں ضرورتِ نبوّت پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ جن لوگوں نے صداقت کو مٹانے کی کوشش کی ان کا کیسا برا انجام ہوا۔ اس سورت میں صداقت کے سب سے بڑے علم بردار حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مخالفوں کی ناکامی کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ یہ معاملہ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آیا ہے جس طرح فرعونیوں اور ان سے پہلے مخالفینِ حق کے دشمنوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے، آخر اللہ تعالیٰ نے ان پر گرفت کی۔ اسی گرفت کا سب سے پہلا ظہور جنگِ بدر میں ہوا۔ اسی لیے اس کا ذکر کیا ہے۔ جنگِ بدر کو تاریخ اسلام میں یہ اہمیت حاصل ہے کہ یہ اسلام کی پہلی جنگ ہے اور اس میں مسلمانوں کی حد درجہ کم زور حالت کے باوجود کفّارِ مکّہ کی طاقت کچل ڈالی گئی۔ اکثر صنادید قریش مارے گئے (تفصیل کے لیے دیکھیے ابن قتیبہ: المعارف؛ ابن ہشام: السیرۃ؛ انساب الاشراف؛ جوامع السیرۃ)۔ اس غزوے نے مذہبی اور ملکی حالات پر گوناگوں اثرات پیدا کیے اور اسلام کی ترقّی کا راستہ کھول دیا (سورۂ اَلْاَعْراف کے ساتھ اس سورت کے تعلق کے لیے دیکھیے البحر المحیط؛ تفسیر المنار)۔

سورۃ اَلْاَنْفال اور سورۃ التوبہ (البراءۃ) ایک دوسرے کے مضمون کی تکمیل کرتی ہیں بلکہ دراصل یہ ایک ہی سورت کے دو حصّے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان بسم اللہ الرّحمٰن الرحیم نہیں لکھی گئی، اور بسم اللہ کا نزول سورت التوبۃ کے آغاز میں نہیں ہوا۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں میں سے صرف سورت التوبۃ ہی ایسی سورۃ ہے جو اس خصوصیّت کی حامل ہے۔

(ادارہ)

اَلْاِنْفِطار: قرآن مجید کی بیاسیویں سورت کا نام، جو ابتدائی مکّی زمانے کی سورت ہے۔ اس میں ایک رکوع اور بسم اللہ کی آیت کے علاوہ انیس آیتیں ہیں۔ انفطار کا مادّہ ف ط ر ہے۔ فطر کے معنی ہیں کسی چیز کو پہلی مرتبہ طول میں پھاڑنا (مفردات)۔ یہ پھاڑنا کبھی کسی چیز کو بگاڑنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی مبنی بر مصلحت۔ اسی لیے فطور کے معنی خلل اور شگاف کے بھی ہیں، جیسے فرمایا هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷[الملک]:۳) اور امام راغب کے نزدیک فَطَرَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کے معنی ہیں (ایجاد الشیٔ وابداعه علی هَيْئَةٍ مترشحة لفعل من الافعال) اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ اس میں کچھ کرنے کی استعداد موجود ہے اور اس میں اس الٰہی معرفت کی طرف اشارہ ہے جو تخلیقی طور پر انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے، اسی لیے فطرۃ اللہ سے معرفتِ الٰہی کی استعداد مراد ہے، جو انسان کی جبلّت میں موجود ہے۔ اَلسَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ کے معنی میں امام راغب نے کہا ہے: یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر فیضان ہوگا وہ اسے قبول کر لے گا (دیکھیے مفردات، تحت مادۂ ف ط ر)۔

اس سورت میں بڑی بلاغت کے ساتھ قیامت اور قُربِ قیامت کی علامات و کیفیات کا ذکر ہے۔ قیامت کی علامات میں بتایا کہ اس وقت آسمان پھٹ جائے گا۔ ستارے ٹوٹ کر منتشر ہو جائیں گے۔ دریا بہہ پڑیں گے۔ قبریں اکھاڑ دی جائیں گی اور ہر شخص اپنے اگلے اور پچھلے اعمال کو جان لے گا (اور پوچھا جائے گا کہ) اے انسان تجھے جو ذاتی اور نسبتی کمال کی حالت میں پیدا کیا تھا پھر تو نے صداقتوں کا انکار کر کے اپنے تئیں ذلیل کیوں کر لیا۔ دراصل آخرت کا انکار انسان کو اس راہ پر ڈال دیتا ہے، حالانکہ انسانی اعمال ضائع نہیں جاتے فرمایا: اے (غافل) انسان کس چیز نے تجھے اپنے ربِّ کریم سے سرکش بنا دیا ہے، جس نے تجھے پیدا کیا پھر ٹھیک ٹھیک درست کر دیا، پھر تیرے ظاہری اور باطنی قویٰ میں اعتدال و تناسب ملحوظ رکھا، پھر جس صورت میں چاہا تجھے ترتیب دے دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ تم جزا وسزا کو جھٹلاتے ہو حالانکہ اس کی طرف سے تم پر ایسے زبردست نگرانِ کار مقرّر ہیں جو تمھارے اعمال کا ہر آن محاسبہ کرتے رہتے ہیں اور تمھارا کوئی بھی فعل ان کی نظروں سے مخفی نہیں۔ آخرت میں اس کا کامل ظہور ہوگا۔ اور سب اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوگا۔

(ادارہ)

اَلنَّقرہ: ترکی کا مرکزِ حکومت، شہر انقرہ اندرون اناطولیہ میں شمال مغرب کی جانب اس میدان کے مشرقی کنارے پر واقع ہے جس میں دریائے سقاریا کا دایاں معاون انگورو چای (=انقرہ صوپو) بہتا ہے۔ نواح شہر میں اس میدان کی کم

ازکم بلندی سطحِ بحر سے آٹھ سو پینتیس (ریلوے سٹیشن پر آٹھ سو اکاون) میٹر ہے۔ وہ پہاڑی جس پر قلعۂ انقرہ واقع ہے (بلندی ۹۷۸ میٹر) میدان سے ایک سو بیس میٹر سے زیادہ بلند ہے۔ حیدر پاشا (استانبول) سے یہ شہر ریلوے کے ذریعے ۵۷۸ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور خط مستقیم میں بحیرۂ اسود کے قریب ترین ساحل سے اس کا فاصلہ ۱۸۵ کیلومیٹر کے قریب ہے۔

تاریخ: انقرہ اَنڈرُلو کے ان قدیم شہروں میں سے ہے جن کی تاسیس کا قطعی زمانہ متعیّن نہیں کیا جاسکتا اور جن کی ابتدائی تاریخ پردۂ ماضی میں مستور ہے۔ حال کے چند سال میں زمانۂ ماقبل تاریخ کے جو آثار دست یاب ہوے ہیں وہ اس کی قدامتِ بنا پر شاہد ہیں۔ یہ حقیقت قابلِ ذکر ہے کہ اس خطّے کے لوگوں نے اپنی قیام گاہ کو جو نام دیا تھا اور جو تاریخ میں ملتا ہے وہ خفیف سی تبدیلی کے ساتھ ہمارے زمانے تک باقی رہا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دوسرے قدیم شہروں کی طرح انقرہ کی ابتدا کے ساتھ بھی کئی افسانے وابستہ ہو گئے ہیں، جو اس کا صحیح نام عام اشتقاقات کی مدد سے معیّن کرنے کی راہ میں حائل ہیں۔

ان افسانوں میں ایک کی رُو سے گورڈیس (Gordius) کے بیٹے مائیڈاس (Midas) حاکم فریگیہ (فریجیا) نے اس شہر کی بنیاد اس مقام پر رکھی تھی جہاں اسے ایک جہاز کا لنگر ملا تھا۔ یونانی مؤرّخ Pausanias کہتا ہے کہ یہ لنگر اس کے زمانے (دوسری صدی عیسوی) تک جوپیٹر (Jupiter) کے ایک معبد میں محفوظ تھا (۱/ ۴: ۳۴)۔ دوسری طرف شہر کے نام کو اسی طرح لنگر کے ساتھ مربوط کرنے کی غرض سے بوزنطی ایتین (Etienne) قریالی، مؤرّخ اپولونیس (Apollonius) کے حوالے سے یہ روایت بیان کرتا ہے کہ جب گولیالی (غلائی، Gauls) ایشیا میں داخل ہوے (تقریباً تیسری صدی قبل مسیح) تو ایک طرف ان کی جنگ ایرانیوں اور ان کے حلیفوں اور دوسری طرف مصریوں سے ہوئی۔ مصری جہازوں کے جو لنگر ان کے ہاتھ لگے انھیں مالِ غنیمت کے طور پر وہ اپنے ساتھ لے آئے اور اپنے معبدوں میں رکھ دیا، شہر کا نام بھی اسی واقعے کی مناسبت سے رکھا گیا۔ افسانے اور حقیقت کا باہمی تعلّق جو بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ حکومت روما کے زمانے میں بھی جہاز کا لنگر شہر انقرہ میں مخصوص نشان کے طور پر استعمال ہوتا تھا بلکہ یہ نشان اس عہد کے بعض سکّوں اور تمغوں پر بھی نقش ہے۔ اس کے خلاف زمانۂ قریب کے بعض اسلامی۔ ترکی اسناد میں شہر کا نام ''انگورو'' فارسی لفظ ''انگور'' سے منسوب بتایا گیا ہے، بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قلعے کی تعمیر ''انگاریہ'' (بیگار) سے ہوئی تھی، اس لیے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ یورپی مصنّفین میں بعض ایسے بھی ہوے ہیں جنھوں نے شہر کے نام کو یونانی لفظ aghuriddha (کچے انگور)، anguri (کھیرے ککڑی) اور، Kicpert کی طرح، ارمن لفظ ankur (مختل، ناہموار سطح کے معنوں میں) سے منسوب کرنا چاہا ہے۔ پیرو (Perrot) کے قول کے مطابق شہر کے اس نام اور سنسکرت کے لفظ انکس کے درمیان، جو فرض کیا جاتا ہے کہ فریگیہ کی زبان سے مشتق ہے اور ''ٹیڑھے'' ''گڑبڑ'' کے معنی میں آتا ہے، زیادہ معقول مناسبت پائی جاتی ہے۔ یہ آخر الذّکر لفظ یونانی لفظ ἀγχος کے ساتھ ''سنگلاخ وادی'' اور ''تنگ درّ'' کے معنوں میں آسکتا ہے، اس طرح شہر کا نام حصار کے قریب کی وادی کی شکل سے ماخوذ ہوسکتا ہے۔ زمانۂ حال میں یہ امر زیرِ غور رہا ہے کہ انقرہ اور حتّیوں کے (جو بیسویں سے آٹھویں صدی قبل مسیح تک اندلو کے ایک بڑے حصّے پر حکمران رہے) شہر انکوا (Ankuwa) میں باہمی تعلّق کیا ہے، اور نیچے اس ضمن میں جو تحقیقات درج ہے اس کی روشنی میں یہ غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ شہر اسی حتّی شہر کی جاے وقوع پر بنایا گیا ہو۔ اس شہر کی تاریخ میں جتنے بھی نام آئے ہیں (Ankyra، Ankyre، Αγχο,α، Αγγυο,α، اَنگریہ، اَنگورو، اَنگورہ، اَنگورہ، اور موجودہ نام انقرہ، جو اب بین الاقوامی سطح پر اس شہر کا رسمی نام قرار پا گیا ہے) سب کے سب ایک دوسرے سے بہت کم مختلف ہیں۔

شہر انقرہ کی وجہِ تسمیہ خواہ کچھ ہو یہ ظاہر ہے کہ اندلو کی شاہ راہوں پر اس کی عمومی حیثیت اور جاے وقوع کے مقامی جغرافیائی حالات دونوں اس امر کے متقاضی تھے کہ یہاں ایک ایسا شہر تعمیر ہو جو اہم مرکز کا کردار ادا کر سکے۔ انقرہ نے ضرور اوّلاً اپنے مقامی جغرافیائی حالات کی بنا پر گرد و پیش کی اقوام کو اپنی طرف متوجّہ کیا ہوگا اور انھیں یہاں سکونت اختیار کرنے کا شوق دلایا ہوگا۔ اس طرح جو شہر بنا اس کے جوہر سے آخر کار ایک ایسا شہر معرضِ ظہور میں آگیا جو اہم شاہ راہوں پر ایک منزل و مرحلے کا کام دیتا تھا اور اس کی قدر و قیمت بہت نمایاں تھی۔

انقرہ کے گرد و پیش وہ تمام مشترک احوال و ظروف موجود ہیں جو اندرونِ اناطولیہ کے تمام شہروں کی بنا رکھتے وقت پیشِ نظر تھے؛ یعنی ایک تو اس وسیع منطقے میں زیادہ تر شہر میدانوں کے کنارے بنے، پھر یہ بھی ضروری تھا کہ وہ میدانوں کو گھیرے ہوے پہاڑوں کے نزدیک بنائے جائیں، جن سے پانی مہیّا ہوتا رہے؛ چنانچہ انقرہ بھی ایک ایسے میدان میں ہے جہاں انگورو چای (انگورو اوزو) بہتا ہے اور اس دریا کے تین معاون (جن کے موجودہ نام بِنت درہ سی یا خطیب یا کیاش صو پو، ایتجہ صو اور چُبُق صُو ہیں) اس میدان میں انقرہ کے قریب ہی اس میں آملتے ہیں۔ اگرچہ یہ میدان بہت سے ان میدانوں کے مقابلے میں جن میں اندلو کے بعض اَور اہمّ شہر آباد ہیں ذرا تنگ ہے تاہم یہاں ایسے ممکنات موجود ہیں کہ ایک مخصوص وضع و قطع کا چھوٹا سا شہر پروان چڑھ سکے۔ انقرہ کے مقامی جغرافیے میں بالخصوص قدیم اور متوسّط زمانوں کی ضرورتوں کے لیے ایسے سازگار حالات نظر آتے ہیں جنھوں نے اسے ایک اہمّ مرکز کی حیثیت دے دی ہوگی۔ طبعی ماحول میں حفاظت و استحکام کا بڑا عنصر وہ چٹانیں ہیں جو کم و بیش ایک ہزار سے بارہ سو کیلو میٹر تک بلند ہیں اور جن کے اطراف میں گہرے نشیب ہیں۔ ان کے اوپر مزید چند سو میٹر بلند مسطّح بلندیاں (ridges) اور چوٹیاں ہیں اور ان کے بیچ میں بھی جا بجا کشادہ میدان پائے جاتے ہیں۔ بِنت درہ کی تنگ وادی، قلعۂ انقرہ جس قدیم لاوائی چوٹی پر واقع ہے اس کا اس کنارے سے جدا ہونا جو گرمائی قیام گاہ کے میدان کے اوپر ہے، اس چوٹی کا ایسا ہونا کہ جہاں سے دشمن کو بہت دور سے دیکھا

جا سکتا ہے اور جسے بآسانی مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ ان سب وجوہ سے یہ بڑی عسکری اہمیّت کا حامل شہر بن جاتا ہے۔ جس طرح اس کا امکان ہے کہ حِتّی دور کا شہر اسی پہاڑی پر آباد تھا اسی طرح غالباً فریگیوں کا شہر اور گلتیوں کے مستحکم قلعوں (appidos) میں سے بھی ایک یہاں واقع تھا اور اس کے ذرا بعد یونانی ۔ رومی شہر کا (جو میدان کی جانب پھیلا ہوا تھا) قلعہ (acropel) بھی اسی پر بنایا گیا تھا؛ نیز سلجوقی اور عثمانی دور کا حصار بھی یہیں سر بلند تھا۔ گزشتہ دنوں انقرہ میں جو قدیم آثار دریافت ہوے تھے ان سے پتا چلتا ہے کہ پورا مستحکم شہر قلعہ نما تھا۔ اس کی عسکری اہمیّت عرصے سے زائل ہو چکی ہے۔ تاہم آج بھی انقرہ کے عمومی منظر کے انتہائی مستحکم خط و خال ایک پہاڑی جزیرے کی طرح، میدان کی سطح سے بلند ہوتی ہوئی سرخ ۔ سرمئی رنگ کی ننگی چٹانوں کے اوپر واقع ایک پُرہیبت قلعے کی تشکیل کرتے ہیں۔

جاے وقوع کی اہمیّت و استحکام سے قطع نظر قدیم انقرہ کی طرزِ زندگی کے ابتدائی بنیادی اختلافات کا تعلّق اس سے بھی تھا کہ یہ شہر اس بڑی شاہ راہ پر واقع تھا جو اندلو کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک قطع کرتی ہے اور گرد و پیش کے بنجر علاقوں سے بچتی ہوئی کنارے کے پہاڑوں کے اندر نیچے نیچے چلی گئی ہے۔ اس طرح اس نے مرورِ زمانہ سے ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے انقرہ کا کردار قدرتی طور پر ایک طرف تو ان سلطنتوں کی قدرت و قوّت کے درجے پر منحصر تھا جو اس گزرگاہ پر حکمران تھیں، دوسری طرف انقرہ کی حدود کے قریب یا خود اس پر قابض ہونے پر موقوف تھا۔ حوادث تاریخی کی رفتار کے مطابق انقرہ کبھی تو ایسا شہر نظر آتا ہے جو امن و سکون کی زندگی بسر کرتا تھا، جس کی عبادت گاہیں آراستہ و پیراستہ تھیں اور جو بڑی شاہ راہ پر اہمّ تجارتی مرکز تھا، اور کبھی مستحکم چھاؤنی بن جاتا تھا، جس پر بسا اوقات حملے ہوتے رہتے تھے اور دشمن قابض ہو کر اسے خراب و برباد کر دیتے تھے۔ اگرچہ اپنی لمبی زندگی کے دوران میں اسے گاہے گاہے بعض بڑے موانع سے سابقہ پڑتا رہا تاہم شہر کی مذکورہ ترقّی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدا میں تو صدیوں تک وہ حسبِ معمول اس پہاڑی پر جہاں وہ آباد تھا جما رہا، لیکن اس کے بعد اس پہاڑی کے دامن کی طرف بڑھنا شروع ہوا اور میدان تک پھیل گیا، یہاں تک کہ آخری برسوں میں انقرہ کی نواحی بستیاں ان ڈھلانوں تک جا پہنچیں جو اس میدان کے بالمقابل ہیں۔

زمانۂ ماقبل تاریخ سے متعلّق آثار: انقرہ کے نزدیک قدیم حجری (پیلیولتھک) اور متأخر حجری (نیولتھک) انسانی آثار متعدّد بار مل چکے ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں R. Campbell Thompson کو اوزاغیل کے مقام پر، بعد ازاں ۱۹۳۱ء میں K. Bittel کو گیس کے کارخانے کے قریب چقماق پتھر سے ساختہ (mousterien) آلاتِ جرّاحی ملے۔ ۱۹۳۷ء میں ش۔ عزیز قانصوہ نے چوبُوق کی وادی میں تقریباً اسی زمانے کے، یعنی وسطی قدیم حجری (پیلیولتھک) عہد کی مصنوعات دریافت کیں (دیکھیے انقرہ و جوارینک پری هسٹور یاشندہ یکی بولوشلر، دوسری ترک تاریخی کانگرس، ۱۹۳۷ء)۔ اس کے بعد اَور چیزیں دریافت ہوتی رہیں۔ وہ دستی بیلچے (بالطہ) جو Leuchs کو شہر کے مغرب میں اور مان کے مزروعہ میدان کے قریب ملا قدیم حجری (پیلیولتھک) (Chelléan) زمانے سے منسوب سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف ۱۹۳۳ء میں انقرہ کے جنوب میں اَخلات لِبل میں حامد زبیر نے تانبے کے عہد سے متعلّق آثارِ قدیمہ کے ایک سٹیشن میں کھدائیاں کیں۔ حال کی کھدائیوں میں پتا چل گیا ہے کہ انقرہ کے مقام پر انسانی بود و باش کی جڑ بہت گہری گئی ہے۔

حِتّی دور: قدیم اندلو کی تاریخ میں حِتّیوں نے جو کردار ادا کیا وہ زمانۂ حال میں دریافت ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ابتدا ہی میں انقرہ کے قرب و جوار میں ان سے منسوب کئی آثار کا علم ہو چکا تھا (مثلاً شیر کا وہ مجسّمہ جو G. Perrot کو قلاّ بہ نامی گاؤں میں ایک چشمے پر ملا)۔ ۱۹۰۵ء میں بوغوز کوئی (حطُّوشاش) میں (انقرہ سے ایک سو ساٹھ کیلومیٹر مشرق کی سمت) H. Winckler و T. Makridi نے جو منظّم کھدائیاں کیں اور پھر بعد میں بھی متعدّد دفعہ ہوتی رہیں ان کی بدولت حِتّی تاریخ کے نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیّت کے آثار دریافت ہوے ہیں۔ وہ الواح جو بوغوز کوری میں ملیں اور پڑھی جا سکی ہیں ان میں شہروں کے جو نام ملتے ہیں جن میں سے بعض اندلو کے موجودہ شہروں کے ناموں سے بہت کم مختلف ہیں۔ ان میں اَنکُلّہ اور اَنکُوہ کے سے نام بھی شامل ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اَنکُوہ، جس کا نام کئی بار آتا ہے اور جو حِتّی مملکت کے ایک ضلع کا صدر مقام تھا، پاے تخت حِتّوشاش سے تین دن کی مسافت پر تھا: ''بادشاہ نے پہلی رات شہر اِمرالّہ میں بسر کی، دوسری شب ہُوبِی گسّا (Hobigassa) میں گزاری اور تیسرے روز اَنکُوہ پہنچ گیا'' (متن، ص ۲۶۲۶)۔ یہاں بادشاہ کی سرمائی قیام گاہ تھی۔ مؤرّخ E. Cavaignac تسلیم کرتا ہے کہ شہر (انقرہ) کا قدیم نام اَنقِرہ (Ankyra) اسی اَنکُوہ سے مشتق ہے (*Revue hittite et asianique*، ۱۹۳۰ء، ۱:۱۰۱)۔ اگر حِتّی شہروں حَبَب (Habab)، میتِلاس (Metilas) اور مراس (Maras) کے ناموں میں موجودہ شہروں حَلَب ملطیہ اور مَرعش کے ناموں کی بنیاد مل سکتی ہے تو کیا اَنقُرہ کے نام کا اَنکُوہ سے اشتقاق قابلِ قبول نہیں ہو سکتا؟ مذکورۂ بالا متن سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جس طرح موجودہ انقرہ کی جاے وقوع پر اَنکُوہ کا آباد ہونا ممکن ہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی اَور جگہ، مثلاً ہِشیل ۔ ایرماق کے طاس میں، واقع ہو۔ E. Farrer پہلے قیاس کو کلیۃً تو قبول نہیں کرتا لیکن وہ اسے غیر ممکن بھی نہیں سمجھتا۔ مختصر یہ کہ یہ مسئلہ جس طرح ابھی تک حل نہیں ہو سکا اسی طرح اس لفظ (انقرہ) کا مفہوم بھی واضح نہیں ہوا۔ دوسری طرف اگرچہ انقرہ میں مذکورۂ بالا مجسّمے اور دیگر ہیکلوں کے علاوہ حِتّی دور کی بعض اَور چیزیں بھی ملی ہیں تاہم ممکن ہے کہ وہ حِتّی قلعہ جو اسی پہاڑی پر واقع تھا جہاں آج کل کا قلعہ ہے ۔ بوغوز کوئی، عَوَر قلعہ (انقرہ سے ساٹھ کیلومیٹر جنوب مغرب میں) وغیرہ کی سی عمارتوں کی طرح ۔ بہت بڑے پیمانے پر ایسی دیواروں سے تعمیر کیا گیا تھا جو ہموار اور بڑے بڑے پتھروں کی بنیاد پر کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ چونکہ عین اسی جگہ بعد کے زمانے میں اَور عمارتیں بنتی رہیں اس لیے

یہ قدرتی بات ہے کہ اس قلعے کے استحکامات میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی.

فریگیا اور گالو۔ رومن دور: یہ معلوم ہے کہ حتّی سلطنت کے خاتمے کے بعد (آٹھویں صدی ق۔م) اس جگہ وسطی اور بالائی سقاریہ کے گرد ونواح میں فریگی آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کی گزراوقات زراعت اور بھیڑ بکری چرانے پر تھی۔ زیادہ تر شہر میدانوں میں اور مصنوعی نیچی نیچی پہاڑیوں پر بنائے گئے تھے۔ ان پہاڑیوں میں سے چند کی پائے تخت گورڈین (Gordion) کے نواح میں کُھدائی ہوئی تھی (Koerte، ص ۱۹۰۰)۔ انقرہ کے قرب وجوار میں بھی ان پہاڑیوں میں سے جو ان سے منسوب تھیں بعض موجود تھیں اور ان میں کھدائی کی گئی تھی (Makridi، ۱۹۲۵ء، حامدز بیر، ۱۹۳۳ء)۔ فریگیوں کا انقرہ لازمی طور پر بعینہٖ اسی جگہ تعمیر ہوا ہو گا جہاں کسی زمانے میں حتّیوں کا قلعہ تھا۔ ساتویں صدی [قبل مسیح] میں ان علاقوں میں سے جن میں فریگی آباد تھے بعض لیڈیا (Lydia) کے بادشاہوں کے زیرِنگیں ہو گئے۔ اسی اثنا میں ایک دفعہ وہاں کِمّروں کا غلبہ ہو گیا، جو مغرب سے آئے تھے، اور پھر چھٹی صدی [قبل مسیح (؟)] کے وسط میں یہ علاقے ایرانیوں کی حکومت میں آ گئے۔ ۳۳۴ قبل مسیح میں جب سکندر مشرق کو فتح کرنے نکلا تو گورڈین سے یہاں آیا اور یہیں اس نے پافلاگونیا کے ایلچیوں کو بار دیا۔ اس کی موت کے بعد اگرچہ یہ شہر نصف صدی تک سلوکیوں کے حصّے میں رہا تاہم انقرہ کے حقیقی مالک غلاطی زیادہ تر تیسری صدی قبل مسیح کے پہلے ربع میں جزیرہ نمائے بلقان سے آئے اور اس صدی کے آخر تک یہاں آباد رہے۔ فریگیوں اور ان کے شہروں میں ایسے یونانی موجود تھے جو مستعمرین کی حیثیت سے مقیم تھے۔ اس طرح اس علاقے نے بتدریج ایک گالو۔گریک (Gallo-Greek) صورت اختیار کر لی۔ غلاطیوں کی تین بڑی جماعتیں تھیں۔ ان میں سے انقرہ تِک تُوساگ (Tectosag) جماعت کا مرکز بن گیا۔ غلاطی، جیسا کہ مغربی یورپ میں بھی نظر آتا ہے، اپنے مستحکم شہروں کو، جن کے سرے سیدھی ڈھلانوں تک پھیلے ہوئے تھے، پہاڑیوں اور چٹانی چھجّوں پر بناتے تھے اور انھیں بڑے بڑے کھردرے پتھروں سے بنی ہوئی گول یا بیضوی فصیل (oppidum) سے محصور کر دیتے تھے۔ قدیم انقرہ کا قلعہ بھی اسی نمونے کا تھا اور بالآخر اس کی جگہ رومیوں کا قلعہ اور فصیلیں بن گئیں.

رومی گالو۔گریک لوگوں کے خلاف، جنھوں نے ان کے دشمنوں سے ساز باز کر لی تھی، اپنی مہم کے دوران میں قنصل مانیلیوس کے زیرِ قیادت دوسری صدی ق۔م میں ان علاقوں میں وارد ہوئے اور انقرہ میں داخل ہو گئے (۱۸۹ق۔م)، لیکن چونکہ ان کے دشمنوں نے صلح قبول کر لی اس لیے انھوں نے ملک کی آزادی کو ختم نہیں کیا۔ کچھ عرصے بعد (۱۸۶ق۔م) جب یہاں پرگمہ کے بادشاہوں کا غلبہ ہو گیا تو یہ لوگ رومی حکومت سے مجبوراً برگشتہ ہو گئے۔ پہلی صدی ق۔م میں ملک پر پونٹُس (Pontus) کے بادشاہ مِثری دات (Mitridat) کا تصرّف ہو گیا۔ (۸۸-۸۴ق۔م)، لیکن روم کے سردار پومپی (Pompei) نے اسے انقرہ کے قریب شکست دی۔ اس نے غلاطیہ کی حکومت Dejotar کے سپرد کر دی، جس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کی وفات پر اس کی جگہ اس کا کاتب Amintas برسرِحکومت ہوا، جس کے انتقال پر انقرہ، مع پورے غلاطیہ کے، روم کی سلطنت سے ملحق کر دیا گیا اور لیکونیا سمیت ایک فوجی والی کی حکومت میں رکھ دیا گیا.

رومیوں کے انقرہ میں مصلحانہ داخلے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوا کہ وہ دَور جو عملاً غلاطی حکمرانوں کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا بدستور جاری رہا، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے غلاطی اپنی جگہوں پر قائم رہے اور اس تمدّن کی پیروی کرتے رہے جو ان تک بحرِ ابیض (بحیرۂ روم) کے ساحلوں سے پہنچا تھا۔ وہ یونانی بولتے تھے اور اپنی سب تحریریں یونانی یا رومی حروف میں لکھتے تھے۔ غلاطی حکمرانوں کے شایانِ شان شہر میں زراعت اور جانوروں کی پرورش کے محاصل سے بڑی بڑی آمدنیاں تھیں، جن کی بدولت وہ رئیسانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ رومی بادشاہ بھی اکثر اس شہر پر مہربان رہتے تھے۔ شہر کا لقب آغوسٹس کے اعزاز میں سبَسْت (Sebast) ہو گیا تھا۔ آغوسٹس نے یہاں اپنے نام پر ایک معبد (Augusteum) بھی بنوایا تھا۔ اس روم وآغوسٹس معبد کے اندر، جسے آخری غلاطی حکمران Amintas کے بیٹے Pylacménes نے دسویں صدی عیسوی میں مکمّل کیا تھا، آغوسٹس کا مشہور وصیت نامہ، یا زیادہ صحیح طور پر اس کے ان احکام میں سے جو اس نے اپنی زبان سے ارشاد کیے تھے ایک کی نقل کندہ کی گئی تھی؛ چنانچہ Monumentum Aneyranum، جو ہمارے زمانے تک باقی ہے، یہی (معبد) ہے۔ نیرو (Nero) نے یہاں بڑا شہر (metropol) اور Carcalla کی فصیلیں بنوا کر اس کا نام Antoniana رکھا۔ رومی دَور میں یہاں بہت سے معبد، ایک ہِپّوڈروم (hippodrome) (آت میدان)، حمّام اور بادشاہوں کے قیام کے لیے مخصوص محلّ تعمیر کیے گئے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ان دنوں انقرہ تین رومی عساکر (legions) کی قرارگاہ اور اہمّ فوجی مرکز تھا، لیکن اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ شہر کے ایک لاکھ باشندے کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ شہر، جس کا میدان کی جانب پھیلنے کا میلان غلاطی عہد ہی میں ظاہر ہو گیا تھا، اس زمانے میں بالخصوص شمال مغرب اور شمال کی سمت میں جہاں رومی معابد میں سے بیشتر تعمیر ہوئے تھے پھیلنا شروع ہوا اور ممکن ہے کہ (دریائے) بِنْت درہ کے بازو کے اندر بھی، جو اس کے لیے ایک قدرتی خندق کا کام دیتا تھا۔ یہ نئے رومی محلّے ایک بیرونی فصیل سے گھرے ہوئے تھے۔ اندرونی قلعے اور اس فصیل کی دیواریں اب موجود نہیں ہیں۔ مختلف ادوار میں انھیں جس تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا اس کے بعد انھیں کے ملبے سے نئی عمارتیں بنالی گئیں اور اسی جگہ یا اس سے ذرا فاصلے پر وہ فصیلیں کھڑی ہو گئیں جو بوزنطی اور سلجوقی دور میں تعمیر ہوئیں۔ رومی دَور میں انقرہ اَنَڈلُو کے متمدّن ترین شہروں میں سے تھا۔ ان باقی ماندہ آثار کے بارے میں جنھیں وہ یورپی سیاح جو انقرہ سے گزرے، بہت غور وتوجّہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ Ch. Texier، جس نے ۱۸۳۴ء میں یہ مقامات دیکھے تھے، کہتا ہے: ''جہاں تہاں بکھرے ہوئے ان آثار کی شان وشوکت سرسری نظر سے روم کی عمارتوں سے کم نہیں۔ ان عمارتوں

کی وہ یونانی صنعت کاریاں جنھیں حملہ آوروں نے منہدم کر دیا جس باریکی و نفاست سے مزیّن ہیں وہ روم کی معابد میں بھی نظر نہیں آتیں''۔ کتبات میں جن مراسم اور جشنوں کا ذکر بالتفصیل موجود ہے وہ اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ایک طاقتور سلطنت کے زیرِ سایہ یہ دشمنوں کے غلبے سے محفوظ تھا اور خوش حالی کی زندگی بسر کرتا تھا، لیکن اس کے باوجود رومی دَور میں بھی اس شہر کو وقتاً فوقتاً، بالخصوص قوطوں اور ایرانیوں کی طرف سے، حملے کا خطرہ لاحق رہتا تھا اور قلعے کی مسلسل تعمیر واستحکام کا اس خطرے سے ضرور تعلّق رہا ہوگا۔

انقرہ قرونِ وسطیٰ میں: اس زمانے میں یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ انقرہ طویل اور پُرسکون ادوار میں زندگی گزارتا رہا۔ شروع میں سات سو برس سے زائد (۳۳۴-۱۰۷۳ء) عرصے تک اس کی قسمت مشرقی رومی سلطنت کے اقبال و ادبار سے وابستہ رہی۔ اس سلطنت کے قوی ادوار میں یہ شہر نئی نئی عمارتوں سے مزیّن ہوا۔ دوسری طرف وہ اَنْدَلُو کے سرکردہ عیسائی مرکزوں میں سے ایک بن گیا۔ اس کا رقبہ تھوڑا اَور بڑھ گیا اور اس کی فصیلیں مختلف زمانوں میں، اور بالخصوص ساتویں صدی سے جب کہ اسے عربوں کے حملے کا سامنا کرنا پڑا، از سرِ نو تعمیر ہوتی رہیں۔

عربوں کی انقرہ سے واقفیت یقیناً بہت پرانی ہوگی۔ یاقوت: (مُعْجَم، طبع وُسٹِنْفِلْڈ، ۱: ۳۹۰) انقرہ سے مخصوص ایک فصل میں زمانۂ جاہلیت کے عرب شاعر امرؤالقیس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ شاعر جنوبی عرب کے ایک حکمران [حُجْر] کا بیٹا تھا اور تخت حاصل کرنے کے لیے قیصر جستینیانوس (Justinian) سے امداد طلب کرنے کی غرض سے بازنطیوم گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر، (گویا ۵۴۰ء میں)، اسے انقرہ میں زہر دے دیا گیا اور مرنے سے پہلے اس نے انقرہ کے بارے میں اپنے تأثرات جن آخری اشعار میں بیان کیے ہیں وہ اس نے یہیں کہے تھے (لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ قبر جو شہر کے قریب تیمور کی پہاڑی پر واقع ہے اور جسے بعض لوگ خود تیمور کی قبر بتاتے ہیں دراصل امرؤالقیس ہی کی ہے) [رک بہ امرؤالقیس]۔

ساتویں صدی میں پہلا بڑا حملہ ایران کی سمت سے ہوا اور انقرہ پر قبضہ کر کے پہلے شاپور اور بعد ازاں خسرو پرویز نے اسے تباہ و برباد کیا (۶۲۰ء)، لیکن قیصر ہرقل (Heraclius) نے ایرانیوں کو فیصلہ کُن شکست دی۔ عرب ۶۴۶ء میں عمّوریہ (Amorium) کے سامنے نمودار ہوے اور ۶۵۴ء میں انھوں نے انقرہ کو فتح کر لیا لیکن وہاں رکے نہیں۔ ۷۰۸ء میں، پھر دس سال بعد، عربوں کی یورشیں دوبارہ شروع ہوئیں۔ ایسوریہ کے قیصر لیون (Leon) ثالث نے شہر کی فصیلوں کی مرمّت کی۔ ۷۹۹ء (بلکہ ۸۰۶ء) میں عبّاسی خلیفہ ہارون الرشید کی فوجوں نے انقرہ پر از سرِ نو قبضہ کر لیا، اس کے بعد ۸۳۹ء میں یہ اُلمُعْتَصِم کے تصرّف میں آیا، جیسا کہ ایک عرب شاعر حسین ابن ضحّاک کے ایک مصرع میں اشارہ کیا گیا ہے، یہ شہر سرتاسر برباد ہو گیا [قب ابوتمّام:

جَرَی لَها الفأْلُ بَرْحًا یومَ اَنْقِرَةٍ
اِذْ غُوْدِرَتْ وَحْشَةَ السّاحاتِ وَ الرَّحَبِ

(فتح عموریہ کے ذکر میں دیکھیے یاقوت: معجم البلدان، بذیل مادّۂ انقرہ)۔ بوزنطی اسناد میں اس مہم کے بارے میں معلومات مفقود ہیں۔ ۸۵۹ء میں میخائیل ثالث نے فصیلوں کو دوبارہ تعمیر کیا، زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ پاؤلِکیوں (Pauliciens) نے اس شہر پر قبضہ جما لیا، جو بالائی فرات اور دیور کی (Tephrice) کے نواح میں مجتمع تھے۔ ان کے مذہبی عقائد مشکوک تھے اور وہ کبھی تو عربوں کے موافق اور کبھی ان کے مخالف نظر آتے تھے۔ قُدامہ (۸۸۰ء میں) ان کا ذکر البیالقہ کے نام سے کرتا ہے۔ انھوں نے کچھ عرصے کے لیے ۸۷۱ء میں شہر کو Chrysocheir کی حکومت میں شامل کر دیا (بقول P. Wittek)۔ ارمن مآخذ سے استفادہ کرتے ہوے Çamçiyan نے ایک کتاب کا پتا چلایا ہے جس میں لکھا ہے کہ یہ Chrysocheir قور شہر نامی ایک مسلمان تھا۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ انقرہ نے دو صدیوں تک امن وسکون کی زندگی گزاری۔ اب شہر صرف ۹۳۱ء میں طُرسُوس سے، جو اس زمانے میں مجاہدین اسلام کے اجتماع کا مرکز تھا، آنے والے عربوں کے حملے کا نشانہ بنا، لیکن ۹۵۶ء میں خود طُرسُوس کو نیکوفورس فوکاس ثانی نے بوزنطی سلطنت میں شامل کر لیا اور اس طرح آئندہ حملوں کا سدّباب ہو گیا۔ مشرقی بوزنطی سلطنت کے علاقے کی مشرق اور جنوب مشرق کی جانب توسیع سے انقرہ اپنی حدود سے دور دور تک ایک پُرامن وسکون شہر بن گیا۔ اس اثنا میں ان اداری تقسیمات کی رو سے جو بوزنطیوں کی جانب سے اَنْدَلُو میں عمل میں آئیں یہ شہر Bukellarion تیما (Tema) کا صدر مقام رہا۔

گیارھویں صدی کے وسط میں انقرہ کی قسمت نے ایک نئی سمت میں پلٹا کھایا۔ ۱۰۷۱ء میں ملاذگرد (مَنَاذِکِرد Mantzikert) کے مقام پر سلجوقی سلطان آلپ آرسلان کے ہاتھوں بوزنطی عساکر کو جو شکست ہوئی اس سے پورا اَنْدَلُو ترکی اقتدار کے لیے کھل گیا۔ بوزنطی سلطنت، جس نے ایک طاقتور دشمن سے کاری ضرب کھائی تھی اور ساتھ ہی اندرونی اختلافات سے کم زور ہو چکی تھی، اس ترکی یورش کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکی۔ اس زمانے میں جب ترکی فوجیں بحیرۂ ابیجہ کے کناروں تک پھیل رہی تھیں اس کا امکان تو ضرور تھا کہ ملک میں کہیں کہیں بعض ایسی جگہیں ہوں جہاں انھیں مقامی مقاومت کا سامنا کرنا پڑے لیکن صورتِ حال کے زیادہ روشن ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ملاذگرد کی شکست کے بعد بھی دو سال تک ترک انقرہ کے اردگرد منڈلاتے رہے۔ اگرچہ وہ اس کے بہت قریب تک پہنچ گئے تھے Gerphanion: (*Mélange d' archéologie anatolienne*، ص ۲۱۵)، لیکن اس کے کچھ ہی عرصے بعد شہر نے ترکوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ معلوم نہیں کہ شہر پر پہلی بار قبضہ کرنے والا ترک سپہ سالار کون تھا۔ ممکن ہے وہ خود کوئی سلجوقی حکمران یا اس کا کوئی سپہ سالار یا کسی آزاد ریاست (دانشمندیہ؟) کا سردار ہو۔ بہر حال یہ دَور انقرہ کی اور بالعموم اَنْدَلُو کی تاریخ میں ایک ایسا زمانہ ہے جو پردۂ ظلمت میں مستور ہے۔

۱۱۰۱ء میں صلیبی فوجوں کے سپہ سالار ریمنڈ ڈی طولوس (Raymand

de Toulouse) نے، جو بوزنطیم کے راستے آیا تھا، انقرہ پر قبضہ کر کے قلعہ نشین فوج کو تہ تیغ کر دیا، جو تقریباً دو سو ترکوں پر مشتمل تھی؛ لیکن وہ یہاں رکا نہیں بلکہ انطاکیہ کے حکمران بوہیمنڈ (Bohémond) کو، جسے ایک سال قبل ترکوں نے گرفتار کر لیا تھا، چھڑانے کی نیت سے مشرق کی سمت بڑھا اور شہر بوزنطی حکومت کو واپس کر دیا۔ ۱۱۰۲ء میں کونٹ دی نیورے (Counte de Nevres) کے زیر کمان صلیبی مجاہد یہاں سے گزرے۔ یہ دونوں مہمّیں صلیبیوں کی شکست و ہزیمت پر ختم ہوئیں۔ اس دوران میں انقرہ ترکی مملکت میں داخل رہتے ہوئے ایک مستحکم بوزنطی شہر بن گیا تھا اور کچھ عرصہ اس طرح رہنے کے بعد پھر سلجوقیوں کے ہاتھ آیا۔ صحیح طور پر صرف یہ معلوم ہے کہ ۱۱۲۷ء میں یہ شہر سلجوقیوں میں سے دانشمندی حکمران امیر غازی کے قبضے میں آ گیا۔ اس کے بیٹے محمد غازی کی وفات کے بعد انقرہ پر قُونیہ کے سلجوقی حاکم مسعود اوّل کا قبضہ ہو گیا (تقریباً ۱۱۴۳ء میں) اور مؤخّر الذکر کی وفات (۱۱۵۵ء) پر چانکری سمیت اس کے ایک بیٹے بادشاہ کو مل گیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس پر اس کے بڑے بھائی قِلِیچ آرسلان ثانی، سلطانِ قُونیہ، نے قبضہ کر لیا۔ مدّت دراز تک حکومت کرنے کے بعد جب قِلِیچ آرسلان کی سلطنت اس کے گیارہ بیٹوں میں تقسیم ہوئی تو انقرہ ان میں سے محی الدین مسعود کے حصّے میں آیا۔ لیکن اس کے بھائی اور تو قاد کے حاکم رکن الدین سلیمان نے، جو قُونیہ پر بھی قابض ہو چکا تھا، اسے دو سال تک انقرہ کے قلعے میں محصور رکھا اور آخر کار اسے مع اس کے دو بیٹوں کے قتل کر دیا (۶۰۰ھ/ ۱۲۰۴ء)۔ اس کے کچھ دنوں بعد (۱۲۱۰ء میں) علاء الدین کیقباد نے انقرہ میں اپنے بھائی عزّ الدین کیکاؤس اوّل کے خلاف بغاوت کی، لیکن دو سال کے مقابلے کے بعد اطاعت قبول کر لی اور اسے مَلَطیہ کے قلعے میں محبوس کر دیا گیا۔ بھائی کی وفات پر وہ سلجوقی تخت کا مالک ہو گیا۔ علاء الدین کیقباد اوّل کا دَورِ حکومت (۱۲۱۹-۳۷ء) سلجوقی سلطنت کا سب سے درخشاں دَور تھا۔ اس زمانے میں انقرہ ایک سرحدی شہر نہ تھا۔ قِزِل بے نے، جو اس وقت یہاں کا والی تھا، انگورو صوبہ پر آق کو پرو (نامی پل) بنوایا (۶۱۹ھ/ ۱۲۲۲ء)، جو اب تک باقی ہے۔ اس کے بعد سلجوقی سلطنت بہت جلد زوال پذیر ہو گئی۔ اگرچہ غیاث الدین کیخسرو مغل حملہ آوروں کے خلاف کچھ عرصے کے لیے انقرہ کے قلعے میں بند ہو کر بیٹھا رہا تاہم ۱۲۴۳ء میں سلطنت کا ایک حصّہ مغلوں کے اثر و نفوذ میں آ گیا۔ ۱۲۴۹-۱۲۵۰ء میں کیکاؤس ثانی نے پھر ایک بار انقرہ کی فصیلوں کی مرمّت کی، لیکن پورے اَنْدُلُو میں سلجوقی اقتدار یکسر زائل ہو چکا تھا۔ اگرچہ سلاطین نے برائے نام اپنی حکومت برقرار رکھی تاہم حقیقی اقتدار رؤسا کے ہاتھ میں تھا اور یہ مغل حکمرانوں کے تابع فرمان تھے۔ انقرہ شہر میں اس نوعیت کی حکومت طریقۂ اَخی [رک بآں] کے رؤسا کے ہاتھوں میں تھی اور اَنْدُلُو میں گرمیان خاندان کے حاکم شمال مشرق سے آئے تھے اور بعد ازاں کوتاہیہ پر حکمران رہے۔ ان کی گڑبڑ کا یہ دور ۱۳۰۸ء میں اَنْدُلُو کے ایلخانی حکومت میں آ جانے تک جاری رہا۔

سلجوقی سلاطین انقرہ کی فوجی اہمیّت سے واقف تھے اور اسی لیے وہ اس کی فصیلوں کے استحکام میں سعی و اہتمام کرتے رہے۔ اس کے برخلاف سلجوقی معابد کے نقطۂ نظر سے انقرہ اندرون اَنْدُلُو کے بعض اَور شہروں مثلاً قُونیہ، سِیْواس، قَیْصَرِی وغیرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ P. Wittek نے علاء الدین کیقباد کے عہد کی صرف ایک مسجد کا ذکر کیا ہے، جو قلعے کے اندر تھی۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی سے پہلے انقرہ میں اسلامی طرزِ زندگی نے زیادہ رواج نہ پایا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے ادوار میں بھی سلاطین نے یہاں خود مسجدوں یا مدرسوں کی قسم کی کوئی مذہبی یا ثقافتی عمارتیں نہیں بنائیں بلکہ ان کی تعمیر مختلف والیوں اور رؤسائے طریقت کے انفرادی اقدامات پر چھوڑ دی۔ چونکہ انقرہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا رہا اور ایک سرحدی شہر سمجھا جاتا تھا اس لیے [یہ امر آسانی سے] سمجھ میں آ سکتا ہے کہ یہ سلاطین اسے زیادہ تر محض فوجی اہمیّت ہی کیوں دیتے رہے۔

یہ معلوم ہے کہ انقرہ زیادہ سے زیادہ ۷۰۳ھ/ ۱۳۰۴ء میں ایلخانیوں کی عمل داری میں آ چکا تھا۔ اس تاریخ سے لے کر ۱۳۴۳ء تک کے بعض ایسے سکّے موجود ہیں جن پر ایلخانی حکمرانوں کے نام عربی اور اویغور حروف میں کندہ ہیں۔ حصار کے دروازے پر ۷۲۹ھ/ ۱۳۳۰ء [کذا؟ ۱۳۲۹ء] کا ایک فارسی کتبہ ہے، جس میں محاصل وصول کرنے کے بارے میں ہدایات درج ہیں (P. Wittek: اَنْقَرَہ دَر اِیْلْخانی کِتابہ سِی، در تُرک حُقُوق و اِقْتِصاد مجموعہ سِی، استانبول ۱۹۳۱ء، ۱: ۱۶۱-۱۶۶)۔ ایلخانی اَنْدُلُو پر وسیع قابلیت و صلاحیت کے والیوں کی وساطت سے حکومت کرتے رہے۔ مغلوں کی حکومت انقرہ سے سِیْوَرِی شہر تک تھی اور یہ صورتِ حال نہ صرف العُمَری کے بیانات (۱۳۳۳ء) بلکہ حَمْد اللہ المُسْتَوفِی کی نُزھۃ القُلُوب سے بھی واضح ہوتی ہے، جو ۱۳۴۰ء میں تالیف ہوئی تھی۔ ۱۳۲۸ء میں ایلخانی والی حسن جَلایری نے ایران جاتے وقت جب اَنْدُلُو کو چھوڑا تو اپنی جگہ حکومت علاء الدین اِرْتِنَہ کو سونپ دی، جو ان دنوں سِیْواس میں مقیم تھا۔ یہ معلوم ہے کہ اِرْتِنَہ کے دورِ حکومت میں ۱۳۴۳ء تک انقرہ میں سکّے ایلخانیوں کے نام پر مضروب ہوتے رہے۔ ۱۳۳۵ء میں ابوسعید خاں کی وفات کے بعد اِرْتِنَہ نے، جو رفتہ رفتہ خود مختار ہوتا گیا تھا، ۱۳۴۱ء میں سلطان کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا محمد اس کا جانشین ہوا۔ اس وقت سے انقرہ کی حکومت ان والیوں کے ہاتھ میں رہی جنھیں اِرْتِنَہ اور اس کے اخلاف نام زد کرتے تھے، اگرچہ یہ معلوم ہے کہ اِرْتِنَہ نے اَنْدُلُو کے مختلف شہروں میں ۱۳۴۱ء کے بعد سے اپنے نام کے سکّے جاری کیے تھے۔

یہ صورت حال کب تک جاری رہی؟ اس کی صحیح تعیین مشکل ہے، لیکن Cantacuzène (بون، ۳: ۲۸۴) کی رُو سے، جو ایک بہت قابلِ اعتماد ماخذ ہے، پتا چلتا ہے کہ ۱۳۵۴ء میں بعہد اورخان غازی اس کے بیٹے سلیمان پاشا نے انقرہ کو عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ اس زمانے میں انقرہ کا آخری (ایلخانی) والی ملک ناصر تھا۔

اس مسئلے پر خاصی بحث و تمحیص ہوتی رہی ہے کہ انقرہ میں سلجوقی اور عثمانی

ادوار کے مابین دورِ اَخی جمہوریت کا دور تھا یا نہیں۔ قدیم عثمانی اسناد میں، جو بنیادی طور پر بہت ناقص ہیں، کہا گیا ہے کہ انقرہ کو اخیوں کے ہاتھ سے چھینا گیا تھا اور یہی تصوّر نئی تصنیفات (مثلاً Hammer) میں بھی دہرایا گیا ہے۔ موجودہ تصوّر کے مطابق اَخی، جو بہت بڑے علاقے کے مالک تھے، انقرہ کے حقیقی حکمران بھی تھے۔ Wittek کہتا ہے کہ یہ تو محقّق ہے کہ ان لوگوں نے اَنْدْلُو میں ایک اہم کردار ادا کیا، لیکن ایلخانی حکومت کے دوران میں اصل اقتدار و اختیار امیر یا عامل کے ہاتھ میں تھا اور اخیوں کے ذمّے محض شہری معاملات تھے؛ نیز موجودہ اسناد کے نہایت ناقص ہونے کا ذکر کرتے ہوے وہ یہ خیال بھی ظاہر کرتا ہے کہ جو علاقہ چاروں طرف سے جنگ و جدال میں محصور تھا اس کے کسی ایک شہر میں جمہوریت کا قیام قابلِ قبول نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اخیوں نے، جن کی ابتدا ''فُتُوّۃ'' کے اس طریقے سے ہوئی جو ایک زمانے میں بغداد میں پیدا ہوا تھا، اَنْدْلُو میں آنے کے بعد صنعتی اور تجارتی کردار ادا کیا ہو اور اس طرح ان کے مقامی سرداروں نے بعض اوقات [حکومت میں] بہت اثر و رسوخ حاصل کر لیا ہو۔ اَنْقَرہ کے اَخی سرداروں میں سب سے زیادہ مشہور اخی حسام الدّین (م ۱۲۹۶ء) اور اس کا بیٹا شرف الدّین (م ۱۳۵۰ء) تھے۔ شرف الدّین کی لوح مزار پر ''سلطان اھل الفُتُوّۃ والمروءۃ اَخی معظّم'' کندہ ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انقرہ کی تاریخ میں یہاں یہ ذکر بھی کر دیا جائے کہ دنیاے اسلام نے اس شہر کو کیا نام دیا اور اسے زمانے کے ساتھ ساتھ کن تغیّرات سے سابقہ پڑا۔ قدیم عرب جغرافیہ نگاروں نے اس شہر کا نام عام طور پر اَنْقَرہ دیا ہے، جو مذکورہ بالا (Αγχυοα) کے بالکل مطابق ہے۔ لیکن تیرھویں صدی کے شروع ہی میں، یعنی مغلوں کے اِستیلا سے پہلے، یاقُوت اور ابن الاثیر میں اَنْقَرہ کے ساتھ ساتھ اَنْگُورِیہ بھی نظر آنے لگتا ہے، جس کی ترکی شکل اِنْگُورو بتدریج عام طور پر مستعمل ہونے لگی۔ سلجوقی کتبوں اور اَنْقَرہ میں ضرب شدہ سکّوں میں اس کا نام ہمیشہ اَنْقَرہ اور ایلخانیوں کے کتبوں اور سکّوں میں اِنْگُوریہ لکھا جاتا تھا۔ یہ موخّر الذکر شکل ابن بِی بِی (تیرھویں صدی کا آخر) میں، ابوالفداء (م ۱۳۳۰ء) کی تالیفات میں اور عزیز اَسْتَرَ آبادی (بِزْم و رزْم، چودھویں صدی کا آخر) میں بھی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس حمد اللہ المُسْتَوفی (نُزْھَۃ القُلُوب، ۱۳۴۰ء) کے ہاں اِنْگُورِی یا اَنْگُورِہ کے پہلو بہ پہلو انقرہ بھی ملتا ہے۔ زیادہ قریب کے زمانے کی عثمانی اسناد (اولیا چلبی: سیاحت نامہ و جہانِ نُما) میں ایک موقع پر اَنْقَرہ اور اِنْگُورو دونوں شکلوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ بظاہر ان میں سے پہلی شکل تو رسمی تحریروں میں مستعمل تھی اور عام لوگوں میں اس کی جگہ شکل اِنْگُورو رائج ہو گئی تھی۔ قدیم شہر کے لیے اَنْقیرہ (Ancyre) کے علاوہ اَور شکلیں بھی استعمال ہوتی رہی ہیں؛ چنانچہ صلیبی مہمّوں کے وقائع نویسوں میں سے Albertus Aqunsis شہر کا نام Ancras لکھتا ہے۔ زیادہ قریب کے دور میں Tournefort اس کے لیے Angori اور Angora کی شکلیں استعمال کرتا ہے۔ یہی آخر الذکر شکل یورپ کی جدید مطبوعات میں رائج ہو گئی تھی۔ ۱۹۲۳ء سے شکل اَنْقَرہ رسمی طور پر قبول کر لی گئی اور شکل اِنْگُورو قطعی طور پر متروک ہو گئی۔

قرونِ وُسطیٰ کی عرب اسناد میں بعض دفعہ اَنْقَرہ کو ذات السَّلاسِل یا محض سَلاسِل کہا گیا ہے۔ اس سے غالباً اشارہ شہر کے ''پہاڑی سلسلوں سے گھرے ہوے'' ہونے کی طرف اتنا نہیں جتنا کہ اس کے کئی فصیلوں سے بنے ہوے قلعے کے استحکام کی طرف ہے۔ یہ نام شُکر اللہ (طبع Th. Seif، در MOG، ۲:۸۸)، قَرَہ مانی محمد پاشا (تاریخ آل عثمان، مترجمۂ مُنْکِر مِین خلیل، در TTEM، ۱۴:۹۱)، Haniwaldanus (Löwenklau: Muslim Hist.، ۱۵۹۵ء، ص ۱۳۱) اور عالی (کُنْہ الاخبار، ۵:۶۶) میں اور آخر میں اولیا چلبی (سیاحت نامہ، طبع احمد جودِت، ۲:۴۲۷) کے ہاں ملتا ہے۔

عُثمانی دور: اَنْقَرہ کو، جس کے بارے میں خیال ہے کہ اسے ۱۳۵۶ء میں اُورخان بے نے عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا تھا، مراد اوّل نے ۱۳۶۰ء میں دوبارہ فتح کیا۔ یہ واقعہ، جس کی طرف احمدی [مصنّفِ سکندر نامہ] کے اشعار میں اشارہ موجود ہے، عالی کی کُنہ الاخبار میں بھی مذکور ہے اور نشری، اِدْرِیس (Gaubert: Soc. de Géogr. de Paris، ج ۵، ۱۸۳۵ء و ج ۶، ۱۸۴۲ء) اور سَعْد الدین (تاج التواریخ، ۱:۶۷ ببعد) نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ یہ غیر ممکن نہیں کہ اُورخان کی وفات پر شہر کے سرکردہ لوگوں نے عثمانی حکومت سے گلوخلاصی کا موقع تلاش کیا ہو اور چونکہ ان کے مفاد بہ نسبت بروسہ کے قَیْصری اور قونیہ سے زیادہ وابستہ تھے لہٰذا انھوں نے سابقہ سلجوقی سلطنت کے وارث حکمرانوں سے ایکا کر لیا ہو۔ تاہم وِٹِک (Wittek) کے نزدیک اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اَنْقَرہ نے اَنْدْلُو کی کسی ایسی باغیانہ تحریک سے اشتراک کیا تھا، لیکن ساتھ ہی اس کا بھی امکان ہے کہ کچھ اَور نہیں تو انقرہ نے عثمانی حکومت کے شروع زمانے میں نسبۃً خود مختاری حاصل کر لی ہو۔

پندرھویں صدی میں جب اَنْدْلُو کو تیموری حملے کا ہَدَف بننا پڑا تو انقرہ کا والی یعقوب بے تھا۔ جب تیمور کو یہ خبر ملی کہ بایزید یِلْدِرِم تُوقاد کے قریب پہنچ گیا ہے تو اس نے اسے انقرہ کی طرف کھینچنے کی غرض سے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ بایزید یِلْدِرِم نے آ کر محاصرہ اٹھوایا اور اپنی فوجوں کو شہر کے شمال میں چُوبُوق اُووَہ سینا کے مقام پر مجتمع کیا۔ یہیں ۱۹ ذوالحجّہ ۸۰۴ھ/ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء کو وہ بڑی جنگ ہوئی جس کا ذکر تاریخ میں جنگِ انقرہ کے نام سے آتا ہے۔ کمکی فوجوں کی غدّاری، پانی کی قلّت اور دشمنوں کی عددی فوقیت جیسے عوامل کی موجودگی کے باعث بایزید کو شکست ہوئی۔ وہ اپنے بیٹوں موسیٰ اور مصطفیٰ کے ساتھ تیمور کے ہاتھوں میں قید ہو گیا اور آق شہر میں منتقل کیے جانے سے پہلے کچھ عرصے تک انقرہ کے قلعے میں نظر بند رہا۔ جب تیمور اَنْدْلُو سے واپس ہوا تو انقرہ بایزید یِلْدِرِم کے بیٹے محمد چلبی کے ہاتھ میں تھا، جس کی تخت نشینی کا اعلان اَمَاسِیہ میں ہو چکا تھا۔ ۱۴۰۴ء میں عیسیٰ چلبی نے اس کا محاصرہ کیا، لیکن سلیمان چلبی کی فوجوں نے ۱۴۰۶ء میں تھوڑے عرصے کے لیے

اس پر قبضہ جما لیا۔ یعقوب بے نے محمد چلبی کے خلاف جو بغاوت کی اسے محض اس حکمران کے خلاف مقاومت نہ کر سکنے پر محمول کیا جاتا ہے۔ ۱۴۸۲ء میں بایزید ثانی اور جم سلطان کی باہمی مخاصمت کے دوران میں انقرہ کے والی نے جم کی طرف داری کی اور بایزید نے اُسے سرزنش کی۔ جم کی بیوی اور اس کے بچے یہاں بایزید کے ہاتھ پڑ گئے، جس نے انھیں استانبول میں منتقل کر دیا۔ جس زمانے میں عثمانی سلطنت کی صوبہ بندی ہو رہی تھی انقرہ اَنَدلُو بڑی اِیالت کا صدر مقام مقرّر ہوا۔ بعد میں صدر مقام کوتاہیہ میں منتقل ہو گیا اور انقرہ صرف ایک سَنجاق کا مرکز رہ گیا۔ جہان نُما سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سَنجاق عَمّوریہ بھی کہلاتی تھی۔ کچھ اَور عرصے بعد انقرہ اَنَدلُو کی اِیالت سے علیحدہ ایک اِیالت کا صدر مقام ہو گیا، جو آخر کار قیرِ شہر، یُوزغات، چُورَوم اور قَیصِری کی سنجاقوں پر مشتمل ولایت میں شامل ہو گئی تھی۔

سترھویں صدی میں انقرہ جَلالی مکر و فریب کی بڑی آماج گاہوں میں سے ایک بن گیا۔ جلالیوں میں سے انقرہ کے قلندر اوغلو محمد پاشا نے سَنجاق کی بِیلِک [امارت] حاصل کرنے کی نیّت سے اس شہر کا محاصرہ کر لیا اور انجام کار ۱۶۰۷ء میں اس پر متصرّف ہو گیا، لیکن اگلے ہی سال قُویُوجی مراد پاشا نے اسے مغلوب کر لیا۔ اس حادثے کے بعد کے برسوں میں انقرہ کی تاریخ میں اس کے سوا کسی اہمّ واقعے کا ذکر نہیں کیا گیا کہ کبھی کبھی شہر میں باہمی رقابتیں نمودار ہوتی رہیں اور گاہ بگاہ اسے حکومتِ استانبول سے نافرمانی کرنے والے عُمّال اور مقامی رؤسا کے ہاتھوں مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی ایک مثال ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء کے جاڑے میں صدرِ اعظم ہزار پارہ احمد پاشا کے خلاف دفتردار زادہ محمد پاشا اور وَرْدَر علی پاشا کی بغاوت کے واقعات ہیں۔ اس سے یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ باوجود حدودِ شہر کے اِدھر اُدھر پھیل جانے کے ہمیشہ قلعے کو صحیح و سالم رکھنے کی کوشش کیوں کی جاتی رہی۔ انقرہ پر تھوڑے عرصے کے لیے مصر کے والی محمد علی پاشا کی فوجوں نے بھی قبضہ کر لیا تھا۔ محمد علی نے سلطان محمود ثانی کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا تھا۔

سولھویں سے اٹھارھویں صدی تک انقرہ قدیم حصار کے گرد و جوانب میں، بالخصوص شمال مغرب، مغرب اور جنوب کی طرف میدان کی جانب پھیلتا گیا۔ جنوب کی سمت خاص طور پر یہ رومی۔ بوزنطی شہر کی حدود سے تجاوز کر گیا تھا اور اس نے ایک اہمّ مرکزی شہر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ۹۲۹ھ/ ۱۵۲۲ء کی سرشماری (انقرہ لِواسِی تَحریر دِفتِری، باش وِکالت ارشیوی، شمارہ ۱۱۷) کی تفصیلات کے مطابق سولھویں صدی کے ربع اوّل کے آخر میں انقرہ شہر میں دو ہزار سے زائد مسلمان، ایک سو بیس کے قریب عیسائی اور تقریباً تیس یہودی گھر تھے، جس میں سے ایک سواسّی قلعے کے اندر تھے۔ چونکہ ان اندراجات میں عورتوں اور بچوں کی تعداد درج نہیں اس لیے مجموعی آبادی کی تعداد معیّن کرنا ممکن نہیں، لیکن اس کا اندازہ دس سے بارہ ہزار تک کیا جا سکتا ہے۔ اسی تحریر کی رو سے بادشاہ کا صرفِ خاص انقرہ کے محاصل میں سے پانچ لاکھ اٹھاسی ہزار چھے سو چھیاسٹھ آقچہ تھا۔ اس کا ایک تہائی سے زیادہ حصّہ (دو لاکھ آقچہ) شہر میں مسکرات بنانے اور فروخت کرنے، تقریباً ایک چوتھائی بازار اور ترازووں (Kapanlar) کے ٹیکسوں، تخمیناً اتنا ہی چھاپنے اور مہر لگانے کی فیسوں، باقی میں سے (۵۲۳۳۳ آقچہ) انقرہ کی رنگریزی کی دکانوں، ۴۵۰۰۰ آقچہ صرّافے اور شہر کے اندر کے کھیتوں اور گیہوں کی منڈی کے محاصل پر مشتمل تھا۔ میر لِوا کا صرفِ خاص ایک لاکھ نوّے ہزار آقچہ تک پہنچا تھا اور اس کا بیشتر حصّہ احتساب، نائب وِ عَسَس باشی (کوتوال)، بیت المال، مالِ غنیمت وغیرہ کے محاصل سے وصول شدہ رقموں، نیز باغ، باغیچوں، چارے اور چراگاہوں کی آمدنی سے حاصل ہوتا تھا۔ ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء میں اِولیا چلبی انقرہ آیا۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے دفترِ خاقانی (سرکاری رجسٹر) کے اندراجات کا مطالعہ کیا۔ اس نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کے رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں شہر بہت بڑھ گیا تھا؛ چنانچہ وہ میر لِوا کی آمدنی ۲۶۳۴۰۰ آقچہ تک بتاتا ہے اور شہر کے بارے میں قسم قسم کی معلومات دیتا ہے: ''شہر کی اندرونی فصیل سفید پتھروں سے بنائی گئی تھی؛ اس کے ایک دوسرے سے بلند چار طبقے تھے اور اس کے چار ہزار قدم کے محیط کے اندر تقریباً چھے سو بغیر باغیچوں کے گھر تھے۔ پائینِ شہر کی اطراف کو بھی جَلالی حملوں کے خوف سے حصار بند کر دیا گیا تھا۔ یہاں تقریباً ستر باغ اور باغیچوں والی بڑی بڑی عمارتیں اور چھے ہزار سے زائد آباد گھر تھے۔ گھروں کے اوپر چونے یا گچ کا پلستر نہیں تھا بلکہ عام طور پر وہ انقرہ کی مشہور کچّی اینٹوں سے بنائے گئے تھے، جو پختہ اینٹوں کی طرح سخت اور مضبوط ہوتی تھیں۔ بازار اور بِزِستان [بدستان = مسقّف بازار] شہر کے بالائی حصّے میں تھے۔ جہان نما میں مذکور ہے کہ انقرہ کے زیادہ تر باشندے ترکمان تھے۔ اِولیا چلبی لکھتا ہے کہ باشندوں میں رومی کم اور ان کے مقابلے میں یہودی اور اَرْمَن زیادہ تھے۔ اس زمانے میں انقرہ کے قرب و جوار کے میدانوں میں عمدہ قسم کے اناج اور پھل پیدا ہوتے تھے۔ چراگاہوں میں اچھی نسل کے جانور (بھیڑ، بکری، گھوڑ) پرورش پاتے تھے اور ایسی خام پیداوار سے جو بآسانی دست یاب ہو جاتی تھی ساختہ مصنوعات بھی ترقی کر چکی تھیں (کھالیں، منسوجات، نمکین گوشت، شراب، خشک میوے)۔ اس کے علاوہ انقرہ کے نام سے موسوم بکریاں [Angora goats]، جو دنیا بھر میں مشہور ہیں اور مخصوص نوعیت کی ہوتی ہیں، بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ انقرہ کی بکریوں کی اون کو، جس کی تعریف میں مقامی مصنّفوں نے کہا ہے کہ وہ ''دودھ کی طرح سفید''، ''ریشم کی مانند نرم'' اور ''ہیرے کی مثل چمک دار'' ہوتی ہے، انقرہ میں اور اس کے قصبات میں کات کر تاگے کی شکل میں تیار کیا جاتا تھا اور اس تاگے سے کپڑے بُنے جاتے تھے، جنھیں صُوف اور شالی کہتے ہیں۔ انقرہ کے باشندوں کا بڑا ذریعۂ معاش یہی تھا۔ انقرہ کے کپڑوں میں سے بہترین محلِّ سلطانی میں اور کم تر درجے کے کاروانوں کے ذریعے استانبول اور اِزْمِیر بھیجے جاتے تھے۔ سلطنت کے اندر ان کی بہت مانگ تھی اور مصر اور یورپ کو بھی برآمد ہوتے تھے۔ انقرہ کے کپڑے یورپ کے بازاروں میں cimatile یا camelot کے نام سے معروف تھے۔ اِولیاء چلبی کہتا ہے کہ فرنگی جو

پشم دار بکریاں یورپ بھیجتے تھے وہ تھوڑے دنوں بعد معمولی بکریاں بن جاتی تھیں بلکہ اس تاگے سے جو انقرہ سے حاصل کیا جاتا تھا دوسری جگہوں میں صوف نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اس کا اپنا خیال یہ ہے کہ اس کا اصل راز انقرہ کی آب وہوا اور اس کی جائے وقوع کی خوبی میں مضمر ہے۔ یہ شہرت غالبًا انیسویں صدی کے شروع تک قائم رہی۔ ۱۸۱۲ء تک بھی کپڑا بننے کے تقریبًا ایک ہزار کارخانے چل رہے تھے اور ان میں دس ہزار جلاہے مشغول کار تھے۔ ایک مقامی تصنیف میں مندرج بیان کے مطابق انقرہ میں سال بھر میں ایک ہزار قِرش (پیاسٹر) کی مالیت کے چُغے اور اعلیٰ قسم کے صوف بُنے جاتے تھے۔ رنگ ریزی کے کارخانوں میں شالی پر رنگ کیا جاتا تھا اور اون سے عمدہ قسم کی جانمازیں (سجّادے) بنائی جاتی تھیں۔ اٹھارھویں صدی کے شروع میں جب Pournefort انقرہ آیا تو یہاں بہت سے فرانسیسی اور ولندیزی تاجر موجود تھے۔ اُون بھی بڑی مقدار میں (ایک اُوقہ تیس تھالر (Thaler) تک) برآمد کی جاتی تھی۔ لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں انقرہ کی اونی صنعت زوال پذیر ہوگئی۔ خود ملک کے اندر اُونی کپڑوں کی مانگ تقریبًا غائب ہوگئی اور بیرونی ممالک میں کشمیر اور ایران کے بنے ہوئے کپڑوں سے مقابلے کا اثر بھی پڑا۔ علاوہ ازیں یورپ میں جو بڑا صنعتی انقلاب رونما ہوا اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ انقرہ کے کارخانے بہت ہی کم ہوگئے۔ اسی کے ساتھ وہاں کی مقامی رنگ (جِہرِہ=rhamus tinctoris) کی صنعت کو، جو بہت مقبول تھی، یورپ کے ارزاں معدنی و کیمیائی رنگوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور وہ رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔ اون پہلے کی طرح کپڑے بنانے کے کام نہیں آتی تھی بلکہ زیادہ تر باہر بھیجی جانے لگی۔ Tschischatscheff، Ainsworth اور Mordtmann کا تخمینہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواسط میں جو اُون انقرہ میں تیّار کر کے باہر بھیجی جاتی تھی اس کی مقدار تقریبًا پانچ لاکھ اُوقہ تک تھی۔ انگریز انقرہ کی جو بکریاں جنوبی افریقہ میں لے گئے تھے اور جن کی پرورش ایک مساعد طبعی ماحول میں مکمّل ضروری شرائط کے ساتھ عمل میں آئی، ان کی اون نے اس صدی کے اواخر میں منڈیوں میں خاصی اہمیّت حاصل کر لی۔ کچھ عرصے بعد یہی تجربہ بہت کامیابی کے ساتھ ریاست ہائے متحدۂ امریکہ میں بھی دہرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقابلے کے زمانے میں انقرہ کی اون کی قیمت سونے کے نصف لیرا سے گھٹ کر بیسویں صدی کے شروع میں صرف دس قِرش رہ گئی۔ بے توجہی کے باعث انقرہ کی بکریاں بڑی تعداد میں تلف ہوگئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں اَنقرہ اور اس کے گرد ونواح (بالخصوص زِیر = قصبۂ اِستانوس Istanos) میں کپڑے کے ایک دو کارخانے رہ گئے تھے۔ اس سے بآسانی یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ اَنقرہ، جس کی زندگی کا دارومدار اون کی صنعت اور تجارت پر تھا، ان حالات میں کس حد تک ماند پڑ گیا ہوگا اور کیوں انیسویں صدی کے دوران میں غریب ومفلس رہ گیا۔ J. Deny کے تحریر کردہ ایک مقالے میں (دیکھیے تکملہ آ فرانسیسی، طبع اوّل) اشارۃً ان مختلف تأثّرات کا ذکر کیا گیا ہے جو اس زمانے میں انقرہ آنے والے سیّاحوں نے لکھے ہیں: Poujoulat کی نظر میں اَنڈلُو کے ان شہروں میں جو اس نے دیکھے تھے انقرہ ''مفلس ترین'' شہر تھا۔ لیکن بقول Perrot انقرہ ان میں ''سب سے بڑا'' تھا۔ Texier کہتا ہے کہ ''ان تمام مصائب کے باوجود جو انقرہ کو دیکھنے پڑے یہ شہر اَنڈلُو کے آباد ترین شہروں میں سے ایک تھا''۔ چونکہ عمارتی پتھر کی موجودگی کے باوجود اس کی عمارتیں کچّی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں اس لیے اس کے مکان نہ پائدار ہوتے تھے اور نہ ان پر باہر کے رخ کوئی آرائش کی جاتی تھی؛ اس لیے انقرہ کی ظاہری شکل وصورت سے شہر کی بدحالی کا احساس ہوتا تھا، جو نسبۃً نئے شہروں میں نظر نہ آتی تھی، اور اس کا گنجان آباد ہونا اس کی جائے وقوع کی خوبی، ایک صحت افزا مقام ہونے، اس کی زرخیز زمین اور بالخصوص بے شمار بکریوں کے ریوڑوں کی موجودگی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے دوران میں شہر کی وسعت اور اس کے باشندوں کی تعداد کے بارے میں جو معلومات دی گئی ہیں وہ ایک دوسرے سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتیں۔ Tournefart اٹھارھویں صدی کے شروع میں لکھتا ہے کہ شہر میں چالیس ہزار ترک تھے اور مجموعی آبادی پینتالیس ہزار تھی۔ جغرافیے کی ایک ترکی کتاب میں، جو اس صدی کے آخر میں مرتّب ہوئی، انقرہ کو ایک بڑا شہر بتایا گیا ہے، جس میں اٹھارہ ہزار گھر تھے۔ Ch. Texier کا بیان ہے کہ شہر کی آبادی کا ایک تہائی حصّہ عیسائی تھا (جس میں ارمن اور رومی بالخصوص قابلِ ذکر ہیں) اور مجموعی آبادی (۱۸۳۰ء میں) اٹھائیس ہزار تھی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انقرہ شہر کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں اس سے بہت زیادہ باشندے سما سکتے تھے اور انقرہ کی ایالت میں، اون کی بدولت، موجودہ آبادی سے دُگنی آبادی آرام وآسائش سے گزر کر سکتی تھی۔ A. D. Mordtmann نے ۱۸۵۹ء میں شہر کے گھروں کی جو تعداد دی ہے (بارہ ہزار، جن میں سے آٹھ ہزار دو سو بیس ترکی، دو ہزار چھ سو ارمن۔ کیتھولک، تین سو ارمن، آٹھ سو رومی اور اسّی یہودی گھرانے تھے) اگر وہ صحیح ہے تو آبادی کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہوگی۔ Perrot نے ۱۸۶۰ء میں آبادی کا تخمینہ پینتالیس ہزار تک کیا تھا۔ بعد کے زمانے کے تخمینے بالعموم اس سے بہت کم ہیں؛ چنانچہ ہومان (Humann) کے قول کے مطابق ۱۸۸۲ء میں انقرہ کے چار ہزار ترکوں کے اور ارمن۔ کیتھولکوں کے سترہ ہزار گھروں میں بتّیس ہزار نفوس رہتے تھے۔ Naumann ان کی تعداد ۱۸۹۰ء میں پچیس سے تیس ہزار تک بتاتا ہے اور Cuinet ستائیس ہزار آٹھ سو پچپن۔ ان [ترکی] ''سالناموں'' میں جو بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں شائع ہوئے باشندگان شہر کی تعداد کے بارے میں معیّن معلومات نہیں ملتیں لیکن کہا گیا ہے کہ شہر میں چھ ہزار پانسو گھر، تقریبًا دو ہزار دو سو دکانیں اور چوالیس بڑی اور چھوٹی مسجدیں تھیں۔ غیر ملکی اسناد میں تقریبًا ایک چوتھائی عیسائی، بالخصوص ارمن۔ کیتھولک، دکھائے گئے ہیں۔ یہ [عیسائی] باشندے ان محلّوں میں رہتے تھے جو پہاڑی کی مغربی ڈھلان پر واقع تھے اور شہر کی تجارت کا ایک بڑا حصّہ ان کے ہاتھ میں تھا، یہاں تک کہ ان میں سے بعض کا استانبول میں بھی بڑا کاروبار تھا۔ ارمنوں کی ایک خانقاہ (monastery)

مغربی اور وسطی اَنَدْلُو کی ارمن خانقاہوں میں سب سے قدیم سمجھی جاتی تھی۔ دوسری طرف انقرہ ایک یونانی اُسقُفی (metropolitic) مرکز بھی تھا۔ اَنَدْلُو کے اَور بہت سے مقامات کی طرح یہاں کے راسخ العقیدہ عیسائی بھی ترکی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ دیہاتی پادری تو ان دعاؤں کے معنی بھی نہیں سمجھتے تھے جنھیں وہ برے بھلے طریقے پر پڑھا کرتے تھے۔ ہوار (Cl. Huart) کہتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں انقرہ کے ایک اُسقف نے کچھ مذہبی کتابیں لکھی تھیں جو رومی حروف لیکن ترکی زبان میں تھیں (*Trois ouvrages en Turc d' Angora*، در *JA*، ۱۹۰۰ء، ج ۱۵، سلسلہ ۹: ص ۴۵۹ ببعد)...

انقرہ ترکیہ کا دارالحکومت: چونکہ جنگ بلقان کے بعد روم ایلی کے صوبے ترکی کے ہاتھ سے نکل گئے اور اس طرح نئی سرحدیں استانبول سے صرف دوسو کیلومیٹر کے فاصلے پر رہ گئیں، نیز اسی زمانے میں یہ امر بھی مشکوک نظر آنے لگا تھا کہ یہ بندرگاہ (استانبول) بحری سلطنتوں کے کسی حملے کا مقابلہ کر سکے گی، لہٰذا مختلف طریقوں پر یہ تجویز زیرِ غور رہی کہ عثمانی سلطنت کے مرکز کو وسطی اَنَدْلُو میں کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے جو بیرونی تعرّضات سے محفوظ ہو (یہ تجویز فان ڈر گولٹز (Von der Goltz) پاشا کی طرف سے بھی ایک نوٹ میں پیش کی گئی تھی، جو عرصے تک ترکی فوج میں ملازم رہا تھا)، لیکن استانبول کے سامنے اَنَدْلُو کے سب شہر ماند تھے اور ترکی حکومت کے اربابِ حلّ وعقد کے لیے اس میں بڑی جاذبیت تھی، اس لیے وہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہ کر سکے۔ ۱۹۱۵ء کے آغاز موسمِ بہار میں انگریزی اور فرانسیسی بیڑے نے چناق قلعہ کے درّے میں زبردستی راستہ پیدا کر لیا اور بعد ازاں اس پورے عرصے میں جب تک جنگ کا خطرہ باقی رہا یہ سوچا جاتا رہا کہ پاے تخت کو اَنَدْلُو میں منتقل کر دیا جائے اور اس ضمن میں اِسْکی شِہر، قدیم سلطنت گِرمیان کا دارالحکومت کوتاہیہ، اور پرانے سلجوقی پاے تخت قُونیہ میں بعض تیاریاں بھی کی گئیں؛ لیکن انقرہ کا خیال کسی کو نہ آیا، جو ان شہروں کے مقابلے میں بہت بے حقیقت تھا، حتّٰی کہ کچھ عرصے بعد جب ۱۹۲۰ء میں استانبول پر فتح مند سلطنتوں کا قبضہ ہو گیا اور تشکیلاتِ ملّی کے لیے کوئی اداری مرکز تلاش کیا جا رہا تھا تو کچھ لوگ ایسے تھے جو چاہتے تھے کہ سِیْواس کو ترک نہ کیا جائے، جہاں عارضی طور پر روم ایلی و اَنَدْلُو مدافعۂ حقوقِ جمعیتی کی کانگرس قائم کی گئی تھی۔ بعض ایسے تھے جو سلطنت کا مرکز بنانے کے لیے اِسْکی شِہر، کوتاہیہ اور قُونیہ کی سفارش کرتے تھے یا یہ سوچتے تھے کہ اَنْقَرہ سے مزید شمال کی سمت کسی کھلی جگہ میں ایک بالکل نیا پاے تخت بنایا جائے۔ بایں ہمہ کانگریس کی مجلسِ تمثیلیہ کی نظر میں انقرہ کو آئندہ بننے والی ترکی مجلسِ ملّی کے مرکز کے طور پر منتخب کرنے کے حق میں کئی اہمّ جغرافیائی اور تاریخی اسباب موجود تھے۔

تاریخ کے ابتدائی اور درمیانی ادوار میں جب اَنَدْلُو میں بڑی بڑی سیاسی تشکیلات قائم ہو رہی تھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جو جگہیں شہروں کا مرکز قرار پائیں وہ کم وبیش ایسے درمیانی کشادہ خطّوں میں واقع تھیں جن کے ایک طرف اَنَدْلُو کے وہ تمام وسطی خشک گیاہی میدان تھے جو سکونت کے لیے زیادہ مساعد نہ تھے اور دوسری طرف سرحد کے وہ ناہموار علاقے جہاں نقل وحرکت دشوار تھی اور بیرونی حملوں کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ ان خطوں میں، کنارے کے جنگلی علاقوں اور وسطی علاقے کے خشک گیاہی میدان کے درمیان، سکونت اور نقل وحرکت کے نقطۂ نظر سے آمد ورفت کی سہولتیں موجود تھیں اور وہ بڑی سڑکیں جو ملک کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک قطع کرتی تھیں یہاں ایک مسلسل حلقہ بناتی تھیں — اندرونی اَنَدْلُو میں جو مشہور اور اہم شہر مثلاً اِسْکی شِہر، اَنْقَرہ، قَیْصِرِی، نِیْگدِہ، قَرَہ مان، قُونیہ، اَفْیُون [قَرَہ حِصاری] اور کوتاہیہ، خشک گیاہی میدانوں کے کنارے آباد ہوے وہ کہیں نہ کہیں سڑکوں کے اس حلقے میں ایک منزل بناتے تھے اور اس حلقے سے اطراف کے علاقوں، یعنی مشرق میں سیواس سے مَلَطِیہ اور دیار بِکْر اور اسی طرح اِرزِ روم تک؛ شمال میں بحیرۂ اسود کے ساحل (یعنی سَمْسُون یا سینوب) تک؛ مغرب میں اِسْکی شِہر اور اَفْیُون [قَرَہ حِصاری] کے قریب سے بحیرۂ مَرْمَرا (Marmara) اور ایجین کے ساحلوں (یعنی مِلَت، بیزانس وغیرہ) تک اور جنوب میں کیلکیا قپوسی (گولک بوغاری) کے اوپر سے شام کی طرف جانے والے راستے نکلتے تھے۔ جیسا کہ H. Louis نے کہا ہے: ''اندرونی اَنَدْلُو کا سڑکوں کا یہ حلقہ اطراف کے علاقوں کو بہت مضبوطی سے اپنے ساتھ ملائے ہوے تھا''۔ اَنَدْلُو کی بڑی بڑی سیاسی تشکیلات کے مرکز سب یہیں قائم ہوے؛ چناچہ مُتَّحِدہ حِطّی سلطنت کا مرکز ہتوشاش (بوغاز کوئی) اس مقام پر تھا جہاں سے بتدریج بحیرۂ اسود کے ساحل کی طرف اترنے والا راستہ علٰیحدہ ہوتا ہے۔ فریکیہ اور غلطیہ کے زمانے میں ہمیں معلوم ہے کہ انقرہ، گورڈیوں (Gordion) اور عموریہ ہی مرکزی کردار ادا کرتے تھے۔ زیادہ زمانۂ حال میں قُونیہ سلجوقی سلطنت کا پاے تخت رہا۔ اندرونی اَنَدْلُو کی سڑکوں کے مذکورۂ بالا حلقے میں جس سمت سے حملے کا اندیشہ اکثر لاحق رہتا تھا، اس سے انقرہ مشرق کی طرف ہٹ کر ایک نسبۃً محفوظ مقام پر واقع تھا، تاہم وہ مغربی سرحدوں اور استانبول سے ریل کے ذریعے مربوط بھی تھا (اس زمانے میں ریلوے ابھی مزید مشرق کی طرف نہیں بڑھی تھی)۔ جب اس کا سلطنت کے آئندہ مرکز کے طور پر انتخاب کیا گیا تو انقرہ ایک ایسا درماندہ شہر تھا جو ہر قسم کی مدنی آسائش کے لوازمات سے محروم اور ملیریا کا گھر تھا۔ یہاں اتنا پانی بھی میسر نہ تھا کہ ایک اوسط درجے کے شہر کی ضروریات کے لیے کافی ہو سکے۔ یہاں کی آندھیاں مشہور تھیں اور اس کے گردونواح کا علاقہ کُلّی طور پر بے شجر وگیاہ تھا۔ اَتاتُرک نے اپنی اہم بڑی تقریر میں پہلے یہ ذکر کیا تھا کہ اَنَدْلُو و روم ایلی مدافعۂ حقوقِ جمعیتی کی ہیئتِ تمثیلیہ کے مرکز کو انقرہ میں منتقل کرنے کا مسئلہ ۱۹۱۹ء کے تشرینِ اوّل (اکتوبر) کے شروع میں بھی زیرِ بحث آیا تھا، پھر استانبول اور مغربی صوبوں سے اس مرکز کے قریب ہونے کی ضرورت کو، جس کی تائید بہت سے منطقی اسباب سے ہوتی تھی، واضح طریق پر بیان کیا تھا (دیکھیے غازی مصطفٰی کمال: نُطْق، ۱: ۲۴۰).

مصطفٰی کمال پاشا کی سرکردگی میں ہیئتِ تمثیلیہ ۲۷ کانونِ اوّل [دسمبر]

۱۹۱۹ء میں انقرہ آ گئی، اور چونکہ اتحادیوں نے ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو استانبول پر قبضہ کر لیا، لہٰذا اس مجلس مبعوثان کے بالمقابل، جو عملاً تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اور بعد میں باقاعدہ طور پر منسوخ ہو گئی، ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کے ایک اعلان کے ذریعے پوری مملکتِ ترکیہ کو اس فیصلے کا پابند کر دیا گیا جو انقرہ کی ''فوق العادت صلاحیت کی مالک'' مجلس کے ایک اجتماع میں کیا گیا تھا۔ ۲۳ نیسان [اپریل] ۱۹۲۰ء کو جمعے کے دن مجلس کا انقرہ میں اجتماع ہوا۔ اس طرح انقرہ ''تورکیہ بیوک ملّت مجلسی'' (مجلس ملّیۂ کبیر ترکی) کی حکومت کا حقیقی مرکز بن گیا؛ چنانچہ قومی جنگ کا اس کے تمام ادوار میں انتظام انقرہ ہی سے کیا جاتا رہا۔ ۲۰ تشرینِ اوّل [اکتوبر] ۱۹۲۱ء کو ترکیہ بیوک ملّت مجلسی اور فرانس کے مابین انقرہ کا وہ معاہدہ طے ہوا جس سے ترکی کی قومی امنگوں کی مغرب کی سلطنتوں میں سے ایک کی طرف سے تصدیق ہو گئی اور ان امنگوں کے حصول کا راستہ پیدا ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء میں طے ہونے والے معاہدۂ لوزان (Lausanne) کے نتیجے میں مملکت اجنبی تصرّف سے آزاد ہو گئی، اور تشرینِ اوّل [اکتوبر] ۱۹۲۲ء میں سلطنت کے الغا کے بعد وہ وقت آ گیا کہ ترکی حکومت کے مرکز کو ایک قانون کے ذریعے معیّن کر دیا جائے اور یہ ''بہت ضروری ہو گیا کہ حکومت کے (نئے) مرکز کو فوراً معیّن کر کے تمام داخلی و خارجی تردّدات کو ختم کر دیا جائے'' (دیکھیے نُطق، ۱: ۵۲۷)۔ بعض معترضین کے علی الرغم ۱۳ تشرینِ اوّل [اکتوبر] ۱۹۲۳ء کے ایک قانون (بعنوان ''دولت ترکیہ کا مقرِّ اِدارہ سی انقرہ شہرہے'') کی رُو سے اعلان کر دیا گیا کہ انقرہ ترکی مملکت کا مرکز ہے؛ دو ہفتے بعد (۲۹ تشرینِ اوّل، ۱۹۲۳ء) اس شہر میں جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی جو ترکیہ کی موجودہ اداری شکل ہے۔

آج کل کا انقرہ: انقرہ کو نئی ترکیہ کا مرکز بنانے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد شہر کو آباد کرنے کے لیے بہت کچھ سعی و کوشش کی ضرورت پیش آئی۔ یہ کام، جس کی داغ بیل ڈالنا شروع میں ناممکن نظر آتا تھا، سب قسم کی مشکلات کے باوجود، ان تھک عزم و مستعدی سے شروع کیا گیا۔ چونکہ انقرہ کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور شروع میں کوئی باقاعدہ لائحہ عمل پیش نظر نہ تھا، جس سے اس بڑھتی ہوئی آبادی کے حسبِ حال تشکیلاتِ عمل میں آتیں، اس لیے آبادکاری ایک حد تک غیر منظم طریقے پر ہوئی؛ تاہم اس کے ساتھ ساتھ شروع ہی سے قدیم شہر کے اندرونی رقبے میں جو خالی جگہیں تھیں وہاں عمارتیں تعمیر ہو گئیں اور اس کے باہر بالکل نئے محلے اور مضافاتی مرکز بن گئے۔ دلدلیں خشک کر دی گئیں اور انقرہ کو ملیریا کی مصیبت سے مکمّل طور پر نجات مل گئی۔ ہر طرف بہت سی سرکاری عمارتیں تعمیر ہو گئیں اور سڑکیں بن گئیں۔ آبادکاری کے کام کو ایک منظّم لائحہ عمل کے مطابق آگے بڑھانا کہیں ۱۹۲۸ء میں جا کر ممکن ہوا، جب کہ جانسن (H. Jansen) کے منصوبے کو قبول کر لیا گیا۔ اس منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ پرانے شہر کو اس کی اصلی خصوصیات سمیت باقی رکھا جائے، اس کے اندر ذرائع حمل و نقل کی اصلاح کی جائے اور تجارتی کاروبار کا کچھ حصّہ وہیں رہے۔ نئے انقرہ میں سب سے مقدّم مجلسِ ملّی کی عالی شان عمارت، اس کے علاوہ سرکاری دفاتر کا ایک محلّہ، باغیچوں والے سکنی مکان اور ایک ایسا ثقافتی محلّہ تھا جس کے اندر زیادہ تر اعلیٰ تعلیمی ادارے آ جائیں اور شہر کے صنعتی حصّے اس کے مضافات میں بنائے جائیں۔ اس تجویز میں یہ بھی شامل تھا کہ شہر کے مختلف حصّوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے لیے ایسی بڑی سڑکیں بنائی جائیں جن کے دونوں طرف درخت ہوں اور ان کے آر پار یا متوازی دوسرے درجے کی سڑکیں؛ نیز شہر کے مختلف حصّوں کو باہم مربوط کرنے کی غرض سے مضافاتی ریل گاڑیاں اور بسیں چلانے کا انتظام کیا جائے۔ ایک اہم مسئلہ یہ درپیش تھا کہ تیزی سے بڑھتے ہوئے شہر کے لیے پینے کے لیے، نیز باغوں اور باغیچوں کو سینچنے کے لیے اور صنعتی اداروں اور گھروں میں استعمال کے لیے پانی کا انتظام کیا جائے، جس کی سخت ضرورت تھی۔ رومیوں نے قدیم زمانے میں مَغابَہ (Magaba) (اِلما یا ادریس) پہاڑ سے شہر میں پانی لانے کی جو نہریں بنائی تھیں اور اسی طرح وہ نہریں جو سلجوقی اور عثمانی ادوار میں بنی تھیں، مرورِ زمانہ سے شکستہ و ناکارہ ہو چکی تھیں؛ یہاں تک کہ بقول A. D. Mordtmann، جو یہاں ۱۸۵۹ء کے موسمِ خزاں میں آیا تھا، شہر رفتہ رفتہ بے آب ہوتا جا رہا تھا اور اس میں صرف چند چشمے پائے جاتے تھے۔ بالآخر ۱۸۹۰ء میں والی عابدین پاشا کی سعی و ہمّت سے الماطاغ کی زیریں پہاڑیوں کے قدرتی چشموں سے کاریزوں کے ذریعے انقرہ تک پانی پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ لیکن یہ سب ذرائع، خواہ ان میں کتنی ہی توسیع و اصلاح کی جاتی، ایک بڑے شہر کی ضروریات پوری نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا یہ قرار پایا کہ وادی چُبُوق میں، جو انقرہ سے شمالی سمت میں بارہ کیلومیٹر کی مسافت پر ہے، ایک بڑا بند بنایا جائے۔ یہ بند، جو ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء کے مابین تعمیر ہوا، دو سو میٹر چوڑا اور اڑسٹھ میٹر بلند ہے اور اس کے عقب میں سات کیلومیٹر میدان میں ایک سو پینتیس ملین کیوبک پانی جمع رہتا ہے، جو دو لاکھ سے زائد آبادی کے کسی شہر کی ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اس بند کی بدولت انقرہ میں ہر طرف بہتا ہوا پانی موجود ہے۔ اس کے ساتھ انقرہ کے آس پاس کی پہاڑی ڈھلانوں، دامنِ قلعہ کی پرانی آتش زدہ جگہوں، سڑکوں کے کناروں اور پارکوں میں وسیع پیمانے پر درخت لگا دیے گئے ہیں اور ان کی بدولت قدرتی طور پر شہر کی شکل و صورت بہت بدل گئی ہے۔ اگرچہ انقرہ، طرح طرح کے عوارض کے نقطۂ نظر سے، اَنْدَلُو کے شمالی کنارے کے منطقے کے ساتھ اس اندرونی حصّے میں واقع ہے جہاں یہ عوارض کم ہیں، تاہم اقلیم کے نقطۂ نظر سے اس کی جائے وقوع قدرتی جنگلی علاقے اور خشک گیاہی میدانوں کے بین بین ہے۔ اقلیم انقرہ میں رصد کا کام ۱۹۲۶ء کے بعد سے باقاعدہ شروع کیا گیا ہے اور اس کے نتائج محکمۂ موسمیات کے رسائل (bulletins) میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے مطابق آخری آٹھ سال میں انقرہ کا سالانہ اوسط درجۂ حرارت بارہ درجے (سینٹی گریڈ)، سب سے زیادہ سرد مہینے کانونِ ثانی [جنوری] کا ایک درجہ آٹھ دقیقے، سب سے زیادہ گرم مہینے تمّوز [جولائی] (اور اس کے ساتھ ساتھ ویسے ہی گرم مہینے اگست کا) تینیس درجے پانچ

دقیقے تھا۔ اس عرصے میں سب سے نیچا اور سب سے اونچا درجۂ حرارت ناپا گیا تو علی الترتیب سینتیس درجے پانچ دقیقے اور چوبیس درجے دو دقیقے تھا۔ بارش کا حساب یہ ہے کہ گزشتہ تیرہ سال میں حاصل شدہ معلومات کی رُو سے بارش کی سالانہ اوسط مقدار تین سو تیس ملی میٹر (سب سے زیادہ اور سب سے کم بارش کے برسوں کے اعداد بالترتیب پانچ سو ایک اور دو سو بیس ملی میٹر تھے)۔ زیادہ تر بارش (کچھ برف کی شکل میں) جاڑے، بالخصوص شروع موسمِ بہار کے مہینوں میں ہوتی ہے۔ عام موسمی صورتِ حال کی رو سے سال میں کوئی موسم ایسا نہیں ہوتا جس میں بارش بالکل نہ ہو لیکن بالعموم سب سے کم گرمیوں کے آخر میں ہوتی ہے۔

حال میں انقرہ کی آبادی تیزی سے بڑھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شہر ترقی کر رہا ہے۔ ایک طویل دورِ انحطاط کے بعد انقرہ میں، جس کی آبادی صرف تیس ہزار سے بھی کچھ کم تھی، ۱۹۲۶ء کی پہلی سرشماری کی رُو سے ستاون ہزار آٹھ سو باشندے تھے۔ ۱۹۲۷ء کی سرشماری میں حدودِ شہر کے اندر رہنے والوں کی تعداد چوہتّر ہزار پانچ سو تر پن اور ۱۹۳۵ء کی سرشماری میں ایک لاکھ بائیس ہزار سات سو بیس ہوگئی۔ ۱۹۴۰ء کی سرشماری کے قطعی اعداد کے مطابق آبادی ایک لاکھ ستاون ہزار دو سو باون تھی۔ یہ آخری تعداد ۱۹۲۷ء کی تعداد میں ایک سو گیارہ فی صد اور ۱۹۳۵ء کی تعداد میں اٹھائیس فی صد کا اضافہ دکھاتی ہے۔ اس طرح ترکی میں، استانبول اور ازمیر کے بعد، انقرہ تیسرا بڑا شہر ہوگیا ہے۔ آبادی میں یہ اضافہ مرکزِ حکومت کے یہاں منتقل ہوجانے کے بعد مملکت کی ہر طرف سے خصوصاً استانبول سے، لوگوں کے سرکاری ملازموں، کاریگروں اور مزدوروں کی حیثیت سے بھاری تعداد میں یہاں آکر بس جانے کا نتیجہ ہے۔ اسی سبب سے بڑے شہروں کے معمولی تناسب کے بالعکس آج کل انقرہ میں مردوں کی تعداد عورتوں کی تعداد سے کم وبیش ایک چوتھائی زائد ہے (۱۹۴۰ء کی سرشماری میں نوّے ہزار نو سو تر پن مرد اور چھیاسٹھ ہزار دو سو نو اسی عورتیں)۔ تاہم تناسب کا یہ فرق آہستہ آہستہ کم ہوتا جارہا ہے (۱۹۲۷ء کی سرشماری کے مطابق انقرہ میں ایک ہزار مردوں کے مقابل پانچ سو گیارہ عورتیں تھیں، لیکن عورتوں کی یہ تعداد ۱۹۳۵ء میں چھے سو چالیس اور ۱۹۴۰ء میں سات سو چالیس ہوگئی)۔ ۱۹۳۵ء کی سرشماری میں انقرہ کی ایک لاکھ بائیس ہزار سات سو بیس کی مصدّقہ آبادی میں سے صرف انتیس ہزار (۲۳ء۵ فی صد) باشندے انقرہ کی مرکزی قضا میں اور دس ہزار (۸ فی صد) ولایت انقرہ کی دوسری قضاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کے برعکس باشندوں میں سے ستّر ہزار (۵۷ فی صد) ترکی کے دوسرے صوبوں میں پیدا ہوئے اور یہاں آکر بس گئے تھے؛ باقی ماندہ تیرہ ہزار افراد ترکی کے باہر پیدا ہوئے تھے۔ ان سب لوگوں میں وہ جن کی مادری زبان ترکی ہے ۹۷ فی صد تھے۔ مذہب کے لحاظ سے بھی تناسب تقریباً یہی تھا (۱۹۴۰ء میں مسلمان: ۱۵۲۷۰۰، یعنی ۹۷ فی صد سے زائد اور غیر مسلم ۴۵۰۰، یعنی ۳ فی صد سے کم)۔ پڑھے لکھے لوگ ۱۹۲۷ء میں مردوں میں ۴۳ء۵ فی صد اور عورتوں میں ۲۸ء۵ فی صد تھے؛ لیکن ۱۹۴۰ء میں تناسب فی صد ۶۸ اور ۴۹ ہوگیا۔ جن بچوں کے لیے تعلیم لازمی تھی ان میں یہ تناسب ۸۰ فی صد (لڑکے) اور ۷۴ فی صد (لڑکیاں) سے زیادہ تھا۔

شہر کے موجودہ رقبے (۱۶۴۰۰ ہیکٹر) میں جو باشندے آباد ہیں ان کی تعداد فی ہیکٹر نو ہے۔ یہ تناسب، جو استانبول کی اوسط گنجان آبادی سے تقریباً ۴ء۵ کم ہے، ظاہر کرتا ہے کہ جو لوگ آج کل انقرہ میں آباد ہیں وہ ایک بہت وسیع اور کشادہ رقبے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس رقبے کے اندر (مثلاً شہر کے قدیم مرکز میں) بعض حصّے ایسے بھی ہیں جہاں گنجان آبادی ۱۷۵ سے ۲۰۰ فی ہیکٹر، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

موجودہ انقرہ کے مسکونہ حصّوں کو قریب سے دیکھا جائے تو نئی عمارتوں کی بدولت گزشتہ چند سال میں قدیم ترین محلّوں کی شکل وصورت بھی کم وبیش تبدیل ہو گئی ہے۔ مکانوں کی وضع قطع، باشندوں کی گنجان آبادی اور ان کے مخصوص پیشوں کے لحاظ سے ان کی مختلف قسمیں آسانی سے ممیّز کی جاسکتی ہیں۔

(الف) قدیم انقرہ کی پہچان یہ ہے کہ اس میں اس منطقے کے اندر جس کے گرد کی فصیلوں کے باقی ماندہ آثار اب نظر بھی نہیں آتے (اگرچہ یہ رقبہ اب ہر سمت میں پھیل گیا ہے) اُن وسیع سڑکوں اور میدانوں کے علی الرغم جو زمانۂ حال میں وجود میں آئے ہیں، تنگ اور پیچیدہ راستے موجود ہیں۔ قدیم زمانے میں بیچ بیچ میں آگ لگنے سے جو خالی جگہیں پیدا ہوگئی تھیں اب یک سر پُر ہوچکی ہیں۔ اس اعتبار سے قدیم انقرہ کا آباد رقبہ مسلسل بڑھتا چلا گیا ہے۔ انقرہ کے تاریخی قدر و قیمت کے حامل آثار اسی حصّے میں ہیں اور آبادی کے لحاظ سے بھی اب تک یہ حصّہ سب سے زیادہ گنجان آباد ہے۔ انقرہ کے باشندوں میں سے تقریباً پانچ میں سے تین اسی حصّے میں رہتے ہیں اور یہاں آبادی کی گنجانی فی ہیکٹر دو سو تک پہنچ گئی ہے۔ در حقیقت قدیم انقرہ ایسے دو حصّوں پر مشتمل ہے جو خارجی منظر اور داخلی ہیئت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں: حصار بند پہاڑی کا بلند تر حصّہ (اندرونِ قلعہ) اور اس پہاڑی کی وسطی ڈھلانوں سے لے کر میدان کی طرف پھیلے ہوئے محلّے۔

قلعۂ انقرہ دو قلعوں سے بن کر بنا ہے، یعنی اندرونی قلعہ، جو پہاڑی کے بلند تر حصّے پر واقع ہے اور بیرونی قلعہ، جو اندرونی قلعے کو شمال، جنوب اور مغرب سے گھیرے ہوئے ہے۔ بیرونی قلعے کے تقریباً بیس برجوں میں سے پندرہ اور ان کے درمیان کی دیواروں کا ایک بڑا حصّہ ہمارے زمانے تک کم وبیش اچھی حالت میں باقی ہے۔ باہر کی طرف اس کے دو دروازے کھلتے ہیں، جن میں سے زیادہ اہم حصار قپی ہے، جو ساعت برج (گھنٹہ گھر) کے پہلو میں ہے۔ اندرونی قلعہ، جو پہاڑی کی چوٹی پر پچاس ہزار میٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے، تقریباً مستطیل شکل کا ہے۔ بیرونی قلعے کی دیواروں کا ایک حصّہ بیک وقت اندرونی قلعے کی شمالی حد بھی بناتا ہے۔ اندرونی قلعے کی دیواروں کے نیچے کے حصّے سب کے سب سنگ مرمر اور سنگِ اسود (basalt) کے تراشیدہ ٹکڑوں سے بنائے گئے ہیں اور ان کے اوپر

متعدّد پختہ اینٹوں کے ردّے لگائے گئے ہیں جو اوپر کو بلند ہوتے ہوے بتدریج بڑھتے گئے ہیں۔ اگرچہ اینٹوں سے بنے ہوے حصّے زیادہ تر خراب ہو گئے ہیں، تاہم اندرونی قلعے (حصار) کی مجموعی ہیئت اپنی پوری آن بان کے ساتھ باقی ہے۔ اندرونی قلعے کا محیط گیارہ سو پچاس میٹر ہے اور دیواریں چودہ سے سولہ میٹر (مشرقی رخ پر دس سے بارہ میٹر) تک بلند ہیں۔ دیواروں کے اوپر اٹھے ہوے بیالیس برج ہیں جو زیادہ تر پنج گوشہ ہیں۔ ان میں سے انیس برج، جو قلعے کے مغربی رخ کے ساتھ ساتھ چلے گئے ہیں، ایک ایسے جہازی بیڑے کا منظر پیش کرتے ہیں جو ایک قطار میں آگے بڑھ رہا ہو۔ اندر داخل ہونے کے بڑے دروازے کے جنوب میں اور اندرونی قلعے کے جنوب مشرقی گوشے میں مشرق قلعہ سی نام کا ایک برج ہے اور شمال مشرقی گوشے کے قریب آق قلعہ ہے، جو حصار کا بلند ترین نقطہ تشکیل کرتا ہے اور اپنی نو سو اٹھتر میٹر بلندی کے ساتھ خطیب چای کی سطح سے، جو اس کے دامن میں بہتا ہے، ایک سو دس میٹر اونچا ہے۔ اندرونی قلعے کی طرح بیرونی قلعے کی فصیلیں اور برج بھی بوزنطی تعمیرات کے اوپر متعدّد بار بنائے اور مرمّت کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ سلجوقی دور میں ایک دوسری دیوار بھی بنائی گئی تھی، جو شمال میں آق قلعہ کے ایک گوشے سے ملی ہوئی ہے اور یہاں سے خطیب چای نظر آتا ہے۔ آٹھویں اور نویں صدی کے عرصے میں، جب کہ انقرہ شہر بہت سے حملوں سے دوچار ہوتا رہا، قلعے کو بار بار [از سرِ نو] تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی اور اس کام کے لیے قدیم رومی آثار اور رو بخرابی عبادت گاہوں کے سنگ مرمر کے ٹکڑے، ستونوں کے پائے، سرپوشوں (باشلک؟) اور مجسموں کے ٹکڑے، کتبوں کے پتھر، مصنوعی آبی گزرگاہوں (aquaducts) کے پائپ وغیرہ استعمال کیے گئے۔ یہ اندرونی قلعے کے فصیلوں کی پوری لمبائی، بالخصوص جنوبی رخ، میں نظر آتے ہیں۔ قلعے سے بہت شان دار منظر دکھائی دیتا ہے۔ ان پہاڑی ڈھلانوں کے پیچھے، جو اس میدان کو گھیرے ہوے ہیں جس میں نیا انقرہ پھیلا ہوا اور جن پر مضافاتِ شہر کی جھونپڑیاں (کوشک) اور ان کے باغیچے ہیں، پہاڑوں کی طویل قطاروں کے نیلے خطوط یکے بعد دیگرے نظر آتے ہیں۔ یہاں سے ادھر ادھر دیکھنے سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ کسی ایسے مقام کو جسے انسانوں نے بہت قدیم زمانے سے اپنا مسکن بنایا اور مستحکم کیا ہوا سے مختلف قومیں، جو ایک دوسری کی وارث ہوتی رہیں، صدیوں تک کیوں ترک نہیں کر سکتیں۔

انقرہ کے اندرونی اور بیرونی قلعے کے درمیان کی ڈھلواں سطح اور وہ رقبہ جو اندرونی قلعے کے گرد ہے ایسے محلّوں سے معمور ہے جن میں ناہموار فرش کے تنگ اور پیچیدہ راستوں کے دورویہ پرانے مکان بنے ہیں، لیکن وہ محلّہ جو اندرونی قلعے کے مغربی رخ کے سامنے پھیلا ہوا ہے اور ۱۹۱۷ء کی آتش زدگی میں تباہ ہو گیا تھا اب ایک سرسبز میدان بنا دیا گیا ہے۔ قدیم انقرہ کے بعض گھروں کے متعلّق اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ اٹھارھویں صدی کے شروع سے باقی چلے آتے ہیں، لیکن تقریباً ان سب میں بعد کے زمانے کی تعمیرات کی وجہ سے کم و بیش تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ ان گھروں میں ایسے بہت کم ہیں جو لکڑی یا پتھر سے بنائے گئے ہوں۔ قدیم انقرہ کا مثالی (typical) مکان لکڑی کا ایک ڈھانچہ قائم کرنے کے بعد اس کے خلاؤں کو کچی اینٹوں سے پُر کر کے بنایا جاتا تھا۔ اگرچہ کئی کئی منزل کے مکان بھی موجود تھے تاہم جو مکان دیکھنے میں آئے ہیں وہ زیادہ تر ایک منزل کے ہیں۔ ان میں ایک کشادہ صحن، ایک گودام یا نعمت خانہ اور بعض اوقات ایک اصطبل بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ چھجّے جو زیادہ تر باہر کی طرف بنائے جاتے ہیں، یا افقی اینٹوں کے چند ردّوں کے اوپر بنی ہوئی منزل، جو بالعموم نیچے کی منزل سے آگے کو بڑھی ہوئی ہوتی ہے، ان گلیوں کو جو پہلے ہی سے تنگ تھیں اوپر کی طرف جا کر اَور تنگ کر دیتی ہے۔ رہائش کے لیے مخصوص منزل میں اوپر سے کھلا ہوا دالان ہوتا ہے، جس میں بازار کی طرف کھڑکیاں ہوتی ہیں اور صحن کے رخ کو بانسوں یا بلّیوں سے بند کر دیا جاتا ہے۔ کمروں کے دروازے اسی دالان میں کھلتے ہیں۔ دیواروں پر چونے سے سفیدی کر دی جاتی ہے اور لکڑی کے حصّوں کو اکثر گہرے رنگ کی زمین پر شوخ رنگ کے پھولوں اور چھجّے دار اندرونی چھت کو ہندسی اشکال سے مزیّن کر دیتے ہیں۔ کھڑکیوں میں شیشے کے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگ ٹکڑے اور لکڑی کے پردے لگے ہوتے ہیں تاکہ مکان گرمیوں میں تپش اور خاک سے اور جاڑوں میں تند ہواؤں سے محفوظ رہیں۔

خارجی فصیلوں کے استانبول قپی اور مقبروں کے پہلو میں پہلے ایک میدان واقع تھا۔ اب اس میدان اور ان راستوں کے ساتھ ساتھ جو یہاں آکر ختم ہوتے ہیں بیوک ملّت مجلسی کی پرانی اور نئی عمارتیں اور انھیں کے ساتھ ہوٹل، بینک، تجارتی منڈیوں وغیرہ کی عمارتیں بن گئی ہیں۔

(ب) نیا شہر اور مضافات: جس زمانے میں قلعۂ انقرہ کے بیرونی محلّے اور سڑکیں کشادہ کی جارہی تھیں اور بڑے پیمانے پر عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں، جن سے اس کی شکل و صورت بدل رہی تھی اس وقت اس کے جنوب میں واقع میدان میں، جو قبل ازیں بالکل بے کار پڑا تھا اور جہاں وقت بے وقت اینجہ صُو کا پانی بھر جاتا تھا، ایک نئے انقرہ (یَنی شہر) کی بنیاد رکھی جارہی تھی۔ یَنی شہر کی ریڑھ کی ہڈی وہ بڑی سڑک ہے جو اَولُوس میدان سے شروع ہو کر قدیم انقرہ کے جنوبی سرے کو چھوتی ہوئی جاتی ہے اور چھے کیلومیٹر لمبی ہے۔ یہ اتاترک بولیوار کہلاتی ہے اور اس پر یا اس کے اطراف میں، پرانے انقرہ کے بالکل قریب، تجارتی منڈیوں اور بینکوں کا محلّہ ہے۔ زیادہ جنوب کی سمت وہ محلّہ ہے جہاں انقرہ یونیورسٹی کی عمارتیں واقع ہیں اور اس سے ذرا پرے سکنی محلّے ہیں، جن میں باقاعدہ بنی ہوئی سڑکوں اور گلیوں کے ساتھ ساتھ مکانات تعمیر کیے گئے ہیں، جن میں سے بعض میں باغیچے بھی ہیں۔ اس کے جنوب میں میدان کے پہلو کی ڈھلان میں وہ سرکاری محلہ ہے جو برابر پھیلتا جارہا ہے۔ پھر یہ بڑی سڑک تھوڑی سی چڑھائی کے ساتھ چنکیہ کے 'جمہور ریاستی کوشک' کے آگے پہنچ جاتی ہے، جو انقرہ کے حسین ترین مناظر میں سے ایک ہے اور جس کے دونوں طرف سفیروں کے لیے مخصوص بنگلے بنے ہوے ہیں۔ نیا شہر

گزشتہ چند سال میں ہر سمت میں بڑھتا رہا ہے۔ شمال میں یہ براہِ راست پرانے انقرہ سے جا ملا ہے اور مشرق کی جانب جبہ جی کی نواحی بستی سے، جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پھیلتی گئی ہے۔ ۱۹۴۰ء کی سرشماری میں یہ نئی شہر کی آبادی جبہ جی سمیت اکتالیس ہزار تھی۔ علاوہ ان قطعات کے جنھیں شہر انقرہ کے حصّے کہا جا سکتا ہے اطرافِ شہر میں اس سے ذرا فاصلے پر بعض قدیم دیہات کی جگہ، یا بالکل نئے سرے سے، کئی اضافی بستیاں بن گئی ہیں۔ گرمائی مساکن اور سکونتی مضافات ڈھلانوں پر بنائے گئے ہیں۔ اس کے برعکس وہ صنعتی اضافی بستی جس میں بڑے بڑے کارخانے ہیں شہر کے اَور زیادہ مغرب میں واقع ہے۔

مملکتِ ترکیہ کے اندر جو ریل کے نئے راستے بنائے گئے ہیں ان کی بدولت انقرہ نقل و حرکت کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔ اس طرح انقرہ بحیرۂ اسود کے ساحلوں سے مشرق اور جنوب میں مربوط ہو گیا ہے۔ وہ تیز رفتار ٹرین (Toros Express) جو مغربی یورپ کو براستۂ ترکیہ عراق وغیرہ سے ملاتی ہے انقرہ سے گزرتی ہے۔

ترکیہ کے دارالحکومت کی حیثیت سے انقرہ کو محض سیاسی اور اداری اہمیت ہی حاصل نہیں بلکہ گزشتہ برسوں میں ہونے والی ترقی کے باعث یہ شہر ایک ثقافتی مرکز اور اپنی صنعتی، تجارتی اور مالی سرگرمیوں کی بدولت ایک اقتصادی مرکز بھی بنتا جا رہا ہے۔ انقرہ میں متعدّد ابتدائی اور ثانوی مکاتب و مدارس، تجارتی و صنعتی درس گاہوں اور کالجوں (Iycees) کے علاوہ ثانوی درجات کے مدرسوں کی تربیت کا ایک کالج ہے جو غازی انسٹی ٹیوٹ کہلاتا ہے۔ علاوہ ازیں علومِ سیاسیہ کا مکتب (قدیم ملکیہ)، حقوق فاکولتہ سی (Law Faculty)، تاریخ و جغرافیا فاکولتہ سی، ایک یوکسک (اعلیٰ) زراعتی انسٹی ٹیوٹ، جس میں جنگل، زراعت اور بیطاری (مداوائے حیوانات) کی فیکلٹیاں ہیں، حرب اکیدمی سی کا فوجی سکول اور بیدک کا صوبائی مکتب ہے۔ طب کی فیکلٹی بھی بننے کو ہے۔ عوام کے ثقافتی ذوق کو فروغ دینے کے خیال سے ایک عوامی مرکز اور اس کے قرب میں اِتنوگرافی کا ایک عجائب گھر موجود ہے، جس میں 'دقّت شایانِ تُرک اِتنوگرافی' کے ذخائر کے علاوہ ایک مخصوص کمرے میں مختلف ''طریقتوں'' سے متعلّق چیزیں اور کئی اَور کمروں میں حطّی آثارِ قدیمہ ہیں۔ شہر کی جنوب مغربی پہاڑیوں میں سے ایک (رصد تپہ) پر اتاترک کا عالی شان مقبرہ تعمیر ہوا ہے۔ [انقرہ میں دو یونیورسٹیاں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی ہے، جو پورے مشرقِ اوسط کی تکنیکی ضروریات کی کفیل ہے۔]

اقتصادی لحاظ سے انقرہ کو ہمیشہ سے ایک مرکزِ مبادلہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اون کی صنعت کے انحطاط کے بعد بھی یہاں ایک خاصے وسیع علاقے کی زرعی پیداوار جمع ہوتی اور بیرونی ممالک کو برآمد کی جاتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اشیا جن کا یہ علاقہ محتاج تھا باہر سے درآمد ہوتی رہی ہیں۔ چونکہ اس کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے لہٰذا اب انقرہ اس پیداوار کا بیشتر حصّہ اپنے ہی صرف میں لے آتا ہے جو پہلے کی نسبت ایک زیادہ وسیع علاقے سے آتی ہے۔ خارجی ملکوں سے درآمدہ سامان کی مانگ بھی قدرتی طور پر بہت بڑھ گئی ہے۔ انقرہ کے علاقے میں اون کے علاوہ اَور خام پیداوار بھی خاصی مقدار میں موجود ہے۔ آبادی کے بڑھ جانے کی وجہ سے کاری گر بآسانی دست یاب ہو سکتے ہیں اور مقامی ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے، لہٰذا اس کا امکان موجود ہے کہ یہاں بڑے پیمانے پر بھی صنعتیں قائم کی جائیں؛ چنانچہ اسی لیے یہاں کچھ کارخانے تو ایسے بن گئے ہیں جو براہِ راست ایک بڑے شہر کی ضروریات کو پورا کر سکیں اور کچھ ایسے جو مصنوعہ چیزوں کو باہر بھیج سکیں (بجلی، گیس کے کارخانے اور آٹے کی چکیاں، کپڑوں کے کارخانے اور کارگاہیں، فرنیچر، چمڑے وغیرہ کے کارخانے)۔

اِداری لحاظ سے انقرہ ان صوبائی تشکیلات کی رُو سے جو ۱۹۲۴ء کے بعد عمل میں آئیں ولایت انقرہ کا صدر مقام ہے۔ اس ولایت کا رقبہ ۲۸۹۲۳ مربع کیلو میٹر ہے اور اس میں بارہ قضائیں ہیں (انقرہ، اَیاش، بالا، بے پازاری، چُبُوق، ہَیمنہ، قلعہ جک، کِسکِین، قِزِل جَہامام، قوچ حِصار، نَلّی خان، ٹُولا ذُلی)۔ ۱۹۳۵ء میں انقرہ کی مرکزی قضا میں ایک سو چھبیس اور پوری ولایت کے اندر تقریباً گیارہ سو چالیس گاؤں تھے اور ولایت کی آبادی ۵۳۴۰۲۵ تھی۔ [اکتوبر ۱۹۶۰ء کی سرشماری کی رو سے ایالتِ انقرہ کی آبادی تیرہ لاکھ سے اور شہر انقرہ کی ساڑھے چھے لاکھ سے زائد ہو گئی ہے۔ گویا انقرہ اب ترکیہ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔]

مآخذ: قدیم زمانے سے متعلّق متن مادّہ میں جن مغربی اسناد کے نام دیے گئے ہے ان کے علاوہ دیکھیے: (۱) Pauly-Wissowa: *Realencycl. d. Klass.*، ۴: *Géographie*: Strabon (۲): ۱: ۲۲۰-۲۲۲۱، *Altertumswiss*، ۱۸۷ و ۱۲: ۵۱۷، ۵۶۷؛ قرون وسطیٰ کے لیے دیکھیے: (۳) P. Wittek: *Zur Geschichte Angoras im Mittelalter* (در *Festschr. für Georg. Jacob zum siebzigsten Geburstag*، ۱۹۳۲ء، ص ۳۲۹-۳۵۴، اس میں بہت سی عربی، ترکی اور مغربی اسناد مندرج ہیں)؛ (۴) G. de Jerphanion: *Mélanges d' archéologie anatolienne...* (در *MFOB*، بیروت ۱۹۲۸ء، ج ۱۳)؛ (۵) H. Grègoire: *Byzantion (1927-29)*، ۴: ۴۳۷-۴۶۱ و ۵: ۳۲۷-۳۴۶؛ (۶) W. M. Ramsay: *The Historical Geography of Asia Minor*، لنڈن ۱۸۹۰ء (خصوصاً قدیم راستوں پر انقرہ کے محلِ وقوع کے متعلّق)؛ (۷) V. Schultze: *Altchristliche Städte und Landschaften*، ۲: ۳۹۲ ببعد؛ (۸) *Dictionnaire d' Histoire et de Géographie ecclesiastiques* (طبع A. Baud-rillard)، ص ۱۵۳۸ ببعد، شروع کے عیسائی ادوار کے بارے میں)؛ (۹) E. Mamboury: *Ankara* (۱۹۳۳ء، یہاں کی تاریخی معلومات کا کچھ حصّہ مکرمین خلیل ینانچ کی فراہم کردہ زبانی اطلاعات پر مبنی ہے اور کچھ P. Wittek کی مذکورہ بالا تصنیف سے لیا گیا ہے)؛ عثمانی دور سے متعلّق اسناد کے سلسلے میں دیکھیے: (۱۰) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۲: ۴۲۶-۴۴۳؛ (۱۱) وہی مصنّف: جہان نُما، ص ۶۳۳؛ یورپی سیّاحوں کے سفرنامے: (۱۲) A. G. v. Busbeck: *Itinera Constantinop-olitum et Amasianum* (فرانسیسی، جرمن اور انگریزی ترجمے موجود ہیں؛ ترکی ترجمہ از حسین جاہد یالچن: تُرک مکتبلری، استانبول ۱۹۳۸ء)؛ (۱۳) J. B.

P. de (۱۴) ؛ پیرس ۱۶۸۱ء، *Les six voyages...* :Tavernier (ایمسٹرڈم) *Relation d' un voyage du Levant* :Tournefort *Voyage du sieur Paul Lucas fait par*:P. Lucas (۱۵)؛ ۱۷۱۲ء)؛ *l'ordre du Roy ...* ، پیرس ۱۷۱۲ء؛ (۱۶) *Journey*:W. Ainsworth *from Angora by Kaisariah , Malatiyah...*، (در *JRGS*، ۱۸۴۰ء، ۱۰: ۲۷۵ ببعد، ۳۱۱ ببعد)؛ (۱۷) *Researches in Asia*:W. J. Hamilton *Minor...* (لنڈن ۱۸۴۲ء)، ج ۱؛ (۱۸) *Asie*:P. de Tchihatcheff *mineure*، پیرس ۱۸۵۳ - ۱۸۶۹ء؛ (۱۹) *Voyage* :B. Poujoulat *dans l'Asie Mineure...*، پیرس ۱۸۶۰ء؛ (۲۰) *Asie*:Ch. Texier *Mineure* (*Coll. Univers*)، پیرس ۱۸۶۲ء، ص ۴۷۹ - ۴۹۲؛ (۲۱) Ph. *Asie Mineure* :le Bas، پیرس ۱۸۶۴ء)؛ (۲۲) *Reise*:H. Barth *von Trapezunt ... nach Scutari*، گوتھا ۱۸۶۰ء، ص ۷۸؛ (۲۳) A. D. *Anatolien Skizzen und Reisebriefe aus* :Mord- tmann *Kleinasien 1850-1859*، ہانوور (Haunover) ۱۹۲۵ء، ص ۳۷۱ ببعد؛ (۲۴) *Souvenir d' un voyage en Asie Mineure*:G. Perrot، پیرس ۱۸۶۴ء؛ (۲۵) K. Humann و O. Puchstein: *Reisen in Klein-asien und Nordsyrien*، برلن ۱۸۹۰ء؛ (۲۶) *Vom*:E. Naumann *Goldenen Horn zu den Quellen des Euphrats*، میونخ ولائپزگ ۱۸۹۳ء، ص ۱۳۹ - ۱۵۲؛ (۲۷) *Exploration in*:J. G. C. Anderson *Galatia cis Halym* (در *Journ. of the Hist. Soc.*، ۱۸۹۹ء، ۱۹: ۹۷ ببعد)؛ آثار قدیمہ، مقبروں اور کتبوں کے بارے میں علاوہ مذکورۂ بالا تصانیف کے دیکھیے: (۲۸) G. Perrot: *Exploration de la Galatie*، پیرس ۱۸۲۶ء، ص ۲۲۷ ببعد؛ (۲۹) G. Perrot، E. Guillaume و J. Delbet: *La Galatie et la Bithynie* (پیرس ۱۸۶۲ء)؛ (۳۰) O. Hirschfeld: *Zum monumentum Ancyranum*، (*Arch. Epigr. Mitt.*)، وی انا ۱۸۵۵ء؛ (۳۱) J. Mordtmann: *Marmora Ancyrana*، برلن ۱۸۷۴ء؛ (۳۲) T. Mommsen: *Res Gestaedivi Auqusti*، برلن ۱۸۸۳ء؛ (۳۳) A. Domaszewski: *Inschriften aus Kleinasien Ancyra*، در *Arch. Epigr. Mitt.*، ۱۸۸۵ء، ۹: ۱۳۱۳ ببعد؛ اسلامی اور ترکی مقابر و کتبات کے لیے دیکھیے: (۳۴) مبارک غالب: انقرہ (استانبول ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۸ء)؛ جغرافیائی معلومات پر مشتمل پرانی تصانیف کے لیے دیکھیے: (۳۵) K. Ritter: *Erdkunde* (ج ۱۸، *Kleinasien*)، ص ۴۷۲ ببعد؛ (۳۶) E. Reclus: *Nouvelle Géographie Universelle*، ۹: ۳۷۳؛ (۳۷) Vital Cuinet: *Turquie d' Asie* (پیرس ۱۸۹۲ء)، ۱: ۲۴۷ ببعد؛ (۳۸) انقرہ ولایتی سالنامۂ رسمی سی (۱۲۸۸ - ۱۳۲۵ھ کے مابین صوبائی حکومت کی طرف سے باقاعدہ وقفوں کے ساتھ شائع کیا گیا)؛ نئے انقرہ کے لیے دیکھیے (۳۹) غازی مصطفیٰ کمال: نطق؛ (۴۰) E. Mambouri: انقرہ (۱۹۳۳ء)؛ (۴۱) H. Louis: تُرکیا جغرافیا سنڭ بعضی اِساسْلَرِی (برنجی جغرافیا کانگرسی)، ۱۹۴۱ء، ص ۲۲۳ ببعد؛ (۴۲) گِنِل نُفوسِ صایمی (۱۹۳۵ء)، نشریہ ۷۵، ۲ (انقرہ ولایتی) اور ۱۹۴۰ء کی سرشماری کے ابتدائی نتائج؛ (۴۳) اِسْتاتِسْتِک ییللغی (اِسْتاتِسْتِک عمومیہ مدیر لغی) ۱۹۳۹ - ۱۹۴۰ء، شمارہ ۱۵۹، ج ۱۱؛ (۴۴) انقرہ شہر نڭ جوسیلی، جینیسن و بِرِکْس طَرَفُنْدَن یا پیلان پلان و پروجہ لرینہ عائد ایضاحنامہ لر (انقرہ شہر امانتی)، انقرہ ۱۹۲۹ء؛ [(۴۵) *Turkey — Facts and Figures*، استانبول ۱۹۴۹ء.]

(بسیم دارکوت، در آ، ت)

الِانْکِشاریہ: رک بہ ینی چری. *

اَنْگورہ: رک بہ اَنْقَرہ. *

اَنْمار: رک بہ غَطَفان. *

اَنِّیَّۃ: ایک اصطلاح جو حرفِ اتصال اَنْ یا اَنَّ (بمعنی ''کہ'') سے مشتق اور ارسطو کی اصطلاح τό ὅτι کا لفظی ترجمہ ہے، اور اس لیے اس سے مراد یہ حقیقت ہے کہ کوئی شے اپنی ''ہُوِیّت'' (thatness) ہے (حرف اَنَّ کو بعض اوقات اسم کی طرح استعمال کیا جاتا ہے، چنانچہ الاَنّ کے وہی معنی لیے جاتے ہیں جو الاَنِّیّۃ کے ہیں)۔ اصل عبارت جس میں ارسطو نے اس اصطلاح کو استعمال کیا اس کی کتاب *Anal. Post.*، ۲/۱، میں ہے۔ وہاں اس نے کسی شے کے ہونے (τό ότι) کی حقیقت اور اس کے کیا ہونے (τοό τί εοτιν) کے مسئلے میں جو فرق کیا ہے وہ اس بحث کی اصل بنا ہے جو زمانۂ مابعد میں وجود (existentia) اور ماہیۃ (essentia) کے بارے میں پیدا ہوئی۔ حقیقت میں مسلم فلاسفہ نے لفظ اَنِّیّۃ کو سب سے بڑھ کر جس معنی خیز مفہوم میں استعمال کیا ہے وہ existentia کا مفہوم ہے، یعنی کسی خاص شے کا وجودِ حقیقی، برعکس اس کی ذاتی حقیقت (essentia)، اس کی اصل نوعیت، اس کے ''کیا ہونے'' یعنی ماہیۃ کے، جسے لاطینی ترجموں میں quidditas کہا گیا ہے؛ مثلاً جب الغزالی اپنی کتاب مقاصد الفلاسفۃ میں مسلم فلسفیوں کے اس عمومی عقیدے کی کہ اللہ میں وجود اور ذات دونوں متّحد ہیں، توضیح کرتے ہیں تو وہاں وہ الفاظ 'انّیّۃ' اور 'ماہیۃ' استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ فلسفے میں وجود اور غیر موجود ہستی کو اکثر ملتبس کر دیا جاتا ہے، چنانچہ یونانی فلسفے میں όν اور εἶναι کی اصطلاحیں دونوں معنوں میں استعمال ہوتی ہیں اور خود ارسطاطالیس (Met.، ۷/۱۷: ۱۰۴۱ الف، س ۱۵) τοόότι اور τό εἶναι کو مرادفات کی طرح استعمال کرتا ہے (ان اصطلاحوں کا یہاں عربی ترجمہ، Bouyges کے ایڈیشن، ص ۱۰۰۶، س ۹، میں الاَنَّ اور الاَنّیۃ ہے)۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ الانّیۃ غیر موجود ہستی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ارسطاطالیس کی کتاب *Metaphysics*، ۹/۱۰: ۱۰۵۱ ب، س ۲۳، کی ایک عبارت میں صدق اور کذب کی غیر موجود ہستی کو اَنِّیّۃ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے (یونانی متن میں ὑπάρχετν ہے) اور ابن رشد نے اس عبارت کی شرح میں اس اصطلاح کا ترجمہ 'ماہیۃ' کیا ہے۔ فرضی ارسطوئی نوافلاطونی رسائل *Theology of Aristotle* اور *liber de*

causis کا، جہاں ὄν اور εἶναι کا ترجمہ ہمیشہ انیہ کیا گیا ہے، ممتاز وصف یہ ہے کہ ان میں فلوطینس کے پانچ معقول مقولات (categories) کا اضافہ کر دیا گیا ہے (قب Plotinus: *Enn.*، ۲:۶)۔ اس میں مقولہ ὄν (وجود) کا ترجمہ 'انیۃ' کیا گیا ہے اور اس کے برعکس مقولہ ταυτότης (شخصیت) کا ترجمہ ھُوِیّۃ کیا گیا ہے، لیکن دوسرے تراجم میں، مثلاً ارسطو کی الٰہیات (*Metaphysics*) کے ترجمے میں، ὄν کا ترجمہ اکثر ھوِیّۃ بھی کیا گیا ہے (مثلاً کتاب ۵ / ۷ میں جہاں ὄν کی تعریف کی گئی ہے)، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انیۃ، وجود اور ھُوِیّۃ کی اصطلاحیں اکثر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوئی ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ بعض ایرانی صوفیوں نے انّیہ کو محض خیالی طور پر اَنا (= مَیں) سے مشتق قرار دیا ہے اور بعض جدید یورپی اہلِ علم نے بھی ان کی پیروی کی ہے لیکن یہ اگر اَور طرح نہیں تو محض نحوی اعتبار ہی سے صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ اَنَا کے صحیح مشتقات: انانیۃ اور انانیّ، دونوں متأخر عرب فلاسفہ کے ہاں پائے جاتے ہیں، مثلاً الشیرازی (سترھویں صدی)۔

مآخذ: ہمارے پاس عربی اصطلاحات فلسفہ کی کوئی قابلِ اطمینان لغت نہیں، تاہم ان مثالوں کے مطالعے سے فائدہ ہوگا جو Bouyges نے اپنی طبع ارسطاطالیس: الٰہیات، مع شرح ابن رشد، کے تدقیقی اشاریوں میں دی ہیں۔ اگرچہ ابن سینا نے اس اصطلاح [انّیۃ] کو بکثرت استعمال کیا ہے لیکن وہ نہ تو الغزالی کی تہافۃ میں پائی جاتی ہے اور نہ ابن رشد کی تہافۃ التہافۃ میں [نیز دیکھیے دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، ۳:۸۹ ببعد]۔

(S. VAN DEN BERGH)

---

* **اَنْواء:** (ع) قدیم عربوں کے ہاں [موسم کے] حساب کا ایک طریقہ۔ اس کا واحد نوء اور مادّہ ن اء [صحیح: ن وء] ہے، جس کے معنے ہیں ''بمشکل اٹھنا، جھکنا، کوئی بوجھ مشکل سے اٹھانا'' (قرآن مجید میں ہے [وَ اٰتَیْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ ۠] ۲۸ [القصص]: ۷۶) اور کسی ستارے یا ستاروں کے مجموعے کے شام کے وقت (acronychal) غروب ہونے اور اس کے مقابلے میں صبح کو (heliacal) اس کے مقابل کے ستارے (رَقیب) کے طلوع ہونے کا مفہوم رکھتا ہے؛ پھر معنی میں توسیع کر کے اسے محض کسی معیّن مدّت کے لیے استعمال کیا جانے لگا [لسان (فصل النون، حرف الھمزہ)۔ عرب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے بارش ہونے، ہواؤں کے چلنے اور گرمی و سردی کی آمد کو بعض ستاروں کے طلوع و غروب سے وابستہ سمجھتے تھے۔ اس عقیدۂ جاہلیت کی طرف نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے اس ارشاد میں اشارہ ہے: ثَلاثٌ مِن اَمرِ الْجاهلية: الطَّعْنُ فی الأنساب و النِياحةُ والاَنْواءُ؛ پھر فرمایا: مَن قال مُطِرْنا بِنَوءِ كذا و كذا فانّه كافرٌ باللّٰه و مؤمنٌ بالكواكب۔

ابوعُبَید کا قول ہے کہ ایسے ستارے اٹھائیس ہیں (جو دراصل منازلِ قمر ہیں؛ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: لسان)۔ مغرب میں ہر تیرہ دن کے بعد ایک ستارہ غروب ہو جاتا ہے اور اسی وقت ایک ستارہ مشرق میں طلوع ہوتا ہے۔ جب بھی یہ واقعہ ہوتا، عرب کہتے تھے کہ اب یا تو بارش ہوگی یا آندھی آئے گی یا قحط وغیرہ پڑے گا؛ مثلاً وہ کہتے تھے مُطِرْنا بِنَوْءِ الثُّریا، یعنی ثریا کے غروب (یا طلوع) ہونے کی وجہ سے بارش ہوئی۔ دراصل نوء کا لفظ اضداد میں سے ہے اور طلوع و غروب دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن عام استعمال میں ان ستاروں کو جو مغرب میں غروب ہوتے ہیں نوء کہتے ہیں اور اس کے ساتھ جو مشرق میں طلوع ہوتے ہیں بَوارِح کہلاتے ہیں]۔

قرونِ وُسطیٰ اور موجودہ عہد کی اصطلاح میں انواء کے معنے ''ابر، بارش، تند ہوا، طوفان'' ہیں (دیکھیے ڈوزی: *Suppl.*، بذیلِ مادّہ؛ Beaussier، بذیلِ مادّہ؛ H. Wehr: *Arab. Wörterbuch*، بذیلِ مادّہ)، اس لیے کہ جن ستاروں کو ہم اس طرح دیکھتے ہیں انھیں بارش کے ہونے [یا نہ ہونے] میں دخل حاصل ہے۔ بشکل جمع انواء کا لفظ اسی پورے نظام کے معنوں میں آتا ہے جو ستاروں یا ستاروں کے مجموعوں کے کسی سلسلے کے شام کے وقت غروب اور صبح کے وقت طلوع ہونے پر مبنی ہے۔ یہ لفظ بعض ایسی کتابوں کے نام میں بھی نظر آتا ہے جن کی اپنی ایک مستقل صنف ہے۔

(۱) نظامِ انواء: مرورِ وقت کا اندازہ لگانے کے لیے قدیم عربوں میں ایک سادہ سا ابتدائی طریقہ رائج تھا، جو ممکن ہے کہ اُس زمانے میں بھی تقویم ثریا (Calendar of the Pleiades) سے متأثّر ہو چکا ہو (قب J. Henninger: *Sternkunde*، ص ۱۱۴، اور وہ حوالے جو وہاں مذکور ہیں)۔ اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے: (الف) ایک طرف تو ستاروں یا ستاروں کے کسی مجموعے کا شام کے وقت غروب ہونا وقت کی معیّنہ مدتوں کی نشان دہی کرتا تھا، جنھیں نوء کہتے ہیں، لیکن جن کے اندر خود نوء کی مدّت ایک سے سات دن کی ہوتی تھی۔ یہ ستارے خود بارش لانے والے مانے جاتے تھے اور استسقاء [رک بآں] کے وقت انھیں پکارا جاتا تھا۔ جن بدویوں کو اس علم میں مہارت حاصل تھی وہ انواء کے ذریعے یہ پیشگوئی کر سکتے تھے کہ کسی معیّنہ مدت کے دوران میں موسم کی کیفیت کیا رہے گی؛ (ب) دوسری طرف انھیں ستاروں یا ان کے مجموعوں کے سلسلوں کے چھے چھے مہینے کے وقفوں پر صبح کو طلوع ہونے سے شمسی سال کا حساب لگایا جاتا تھا، یعنی غالباً اٹھائیس دن کی مدّتیں مقرر کر کے۔ [اس سلسلے میں] جو اقوال ہم تک پہنچے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقویم کی حقیقی بنیاد یہی تھی۔

ظہورِ اسلام سے کچھ پہلے (قب قرآن مجید، ۱۰ [یونس]: ۵ [...وَ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ]؛ ۳۶ [یٰسٓ]: ۳۹ [وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ۔ الآیۃ]) عربوں نے مقامات یا منازلِ [رک بآں] قمر کا پہچاننا سیکھ لیا تھا جو تعداد میں اٹھائیس تھے اور یہ علم [شاید] انھیں ہندوستان سے ملا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان منازل کی فہرست مجموعی طور پر ان کی اپنی فہرست انواء کے مطابق تھی لہٰذا انھوں نے ان دونوں نظریوں کو یک جا کر دیا اور منطقۂ شمسیہ کو تقریباً ۱۲° ۵۰ کے مساوی حصّوں میں تقسیم کر کے اپنے انواء کو اس طرح مرتب کیا کہ وہ منازلِ

قمری پر منطبق ہوجائیں اس طریقے سے اٹھائیس انواء، جو اٹھائیس منازل (دیکھیے فہرست، درلسان، بذیلِ نوء) پر منطبق ہوے، اٹھائیس ستاروں یا ان کے مجموعوں کے ذریعے معیّن کر دیے گئے، جن کے چودہ جوڑے بنے (جن میں سے ایک کا شام کو غروب دوسرے کے صبح کو طلوع کے مقابل تھا) اور جو تیرہ تیرہ دن کی ستائیس اور چودہ دن کی ایک مدت کی نشان دہی کرتے تھے۔ یہ تعدیلات، جن کی صحیح تاریخ معیّن نہیں کی جاسکتی، یقیناً ظہورِ اسلام کے بعد مکمّل کی گئیں... لیکن پرانا طریقہ پھر بھی باقی رہا، ایک طرف تو ذاتی تجربے کی بنا پر بدوی قبائل میں (قب مثلاً جنوبی تونس کے مرازگ کے ہاں نُوہ، جمع: نواوی، در G. Boris: *Documents linguistiques*، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۲۰۸-۲۱۱) اور دوسری طرف روایۃً اور انواء کی منازل سے مکمّل تطبیق کے ساتھ اس سے متعلّق ایسی مخصوص تصانیف میں جنھوں نے اسے بعض دیہاتی آبادیوں میں قائم ودائم رکھا ہے (دیکھیے Ed. Westermarck: *Ritual and Belief in Morocco*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ۲: ۷۷ و *Wit and Wisdom in Morocco*، لنڈن ۱۹۳۰ء، ص ۳۱۳-۳۱۷).

(۲) انواء عربی ادب میں: سب سے پہلے، جیسے کہ توقّع کی جاسکتی تھی، لغت نویسوں نے انواء کی بابت بدویوں کے خیالات جمع کیے اور انھیں اپنی لُغوی تصانیف میں شائع کیا۔ کتاب الازمنۃ اور اس جیسی دیگر تصانیف سے قطع نظر کرتے ہوے ہم صرف ان تصانیف سے بحث کریں گے جن کا عنوان کتاب الانواء ہے۔ کتاب الانواء کے جن بڑے بڑے مصنّفین کا ذکر آیا ہے ان کے نام حسبِ ذیل ہیں، گو ان کی تصانیف میں سے اب تک ایک بھی ہمیں نہیں مل سکی: ابن کُناسہ (م ۲۰۷ھ/ ۸۲۲ء)؛ مُؤرِج (م ۱۹۵ھ/ ۸۱۰-۸۱۱ء)؛ النَّضْر بن شُمَیْل (م تقریباً ۲۴۵ھ/ ۸۵۹ء)؛ الأصمعی (م ۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء)؛ ابن الأعرابی (م ۲۳۳ھ/ [۸۴۷-۸۴۸ء])؛ الشَّیبانی (م تقریباً ۲۴۵ھ/ ۸۵۹ء)؛ المُبَرِّد (م ۲۸۵ھ/ ۸۹۸ء)۔ دوسری جانب ابن قتیبہ کی کتاب الانواء موجود ہے، جو حال ہی میں (۱۹۵۷ء) حیدرآباد میں طبع ہوئی، اور کچھ حصّے ابوحنیفہ الدِّینَوَری (م بعد ۲۸۲ھ/ ۸۹۵ء) کی کتاب کے بھی مل گئے ہیں، مگر الأخفش الأصغر (م ۳۱۵ھ/ ۹۲۷ء)؛ الزّجاج (م ۳۱۰ھ/ ۹۲۲ء)؛ ابن دُرَید (م ۳۲۱ھ/ ۹۳۳ء)؛ قاضی وَکیع (م ۳۳۰ھ/ ۹۴۱ء) اور دیگر مصنّفین کی تصانیف ضائع ہوچکی ہیں۔ اساسی طور پر ان تصانیف میں نظامِ انواء کی تشریح، منازل کی فہرست (یعنی تعدیل کردہ انواء کی)، منازل کو معیّن کرنے والے ستاروں کے طلوع وغروب کی تاریخیں، ہواؤں اور بارشوں کا نظام وغیرہ کی تشریح درج ہے اور تشریح کے ساتھ کہاوتیں اور اشعار بھی دیے گئے ہیں، جن کی عموماً شرح بھی موجود ہے.

لیکن تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی سے ہیئت دانوں نے بھی انواء میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی، چنانچہ الحسن بن سَہْل بن نوبخت، ابومعشر البلخی (م ۲۷۲ھ/ ۸۸۵-۸۸۶ء)، ثابت ابن قُرّہ (م ۲۸۹ھ/ ۹۰۲ء) اور ابن خُرّداذبہ (م ۳۰۰ھ/ ۹۱۲-۹۱۳ء) نے کتاب الانواء کے نام سے اپنی اپنی کتابیں لکھیں اور البیرونی (م ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء) نے اپنی کتاب الآثار الباقیۃ میں ایک پورا باب اس کی نذر کر دیا اور سنان بن ثابت ابن قُرّہ کی کتاب الانواء کا، جو ایک تقویم ہے، کچھ حصّہ (ص ۲۴۳-۲۷۵) بھی نقل کیا.

درحقیقت عرب مصنّفین سے یہ امید کی جاسکتی تھی کہ اُس طرز کی تقاویم تیار کریں گے جیسی کہ انھیں مفتوحہ ممالک میں ملی تھیں اور اگرچہ اس وقت ہمارے پاس صرف سِنان کی تقویم ہے، جو عراق کے لیے بنائی گئی تھی، تاہم گمانِ غالب یہ ہے کہ مصری مصنّفوں نے بھی بہت شروع زمانے میں تقاویم تیار کی ہوں گی، جیسا کہ ابن الحَمّاتی اور المَقْرِیزی کے بعض ابواب سے اور اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ اندلس میں جو جنتریاں مرتّب ہوئیں ان میں قبطی مہینوں کے نام موجود ہیں۔ فی الواقع اندلس کی ایک جنتری ہمارے پاس موجود ہے، جو ڈوزی نے *Calendrier de Cordoue de l'année 961* (لائڈن ۱۸۷۳ء) کے نام سے شائع کی تھی اور جس کا اصل نام اس وقت بھی کتاب الانواء تھا۔ یہی نام مراکش کے ریاضی دان ابن البنّاء (م ۷۲۱ھ/ ۱۳۲۱ء) کی کتاب کا بھی تھا، جسے H. P. J. Renaud نے شائع کیا ہے (پیرس ۱۹۳۸ء)۔ دیگر کتب الانواء، جو اب ناپید ہو گئی ہیں، الغَزّال (م ۴۰۳ھ/ ۱۰۱۲-۱۰۱۳ء) اور الخطیب الأُمَوی القُرطُبی (م ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵-۱۲۰۶ء) سے منسوب ہیں۔ یہ جنتریاں شمسی ہیں اور مصنّف ہر دن کے ذیل میں انواء کی بابت اطلاع درج کرتا ہے، دن اور رات کی لمبائی بتاتا ہے، زرعی دستور وغیرہ دکھاتا ہے اور قرطبہ کی تقویم کے مطابق عیسائی تہوار بھی دیتا ہے۔ آج کل کی مقبول عام جنتریاں (رَعْدِیّہ، تقویم، وغیرہ) کتاب الانواء ہی کی نئی صورتیں ہیں.

مآخذ: (۱) البتّانی: *Opus astronomicum*، طبع ومترجمہ C. A. Nallino، میلان ۱۹۰۳ء ببعد، بمدد اشاریہ؛ (۲) الفَرغانی: کتاب فی الحرکات السّماویۃ و جوامع النّجوم، طبع وترجمہ J. Golius، (*Elementa astronomica*)، ایمسٹرڈم ۱۶۶۹ء؛ (۳) عبدالرحمٰن الصُّوفی: کتاب الصُّوَر السّماویۃ، حیدرآباد؛ (۴) ابن سِیْدَہ: المخصّص، ۹: ۹ ببعد؛ (۵) البیرونی: *Chronologie Orient. Volker*، طبع زخاؤ (C. E. Sachau)، لائپزگ ۱۸۷۸ء؛ (۶) ابن ماجد: کتاب الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد، طبع G. Ferrand، پیرس ۱۹۲۱-۱۹۲۳ء؛ (۷) القزوینی: عجائب المخلوقات، طبع وسٹنفلڈ؛ (۸) حاجی خلیفہ، طبع فلوگل، ۵: ۵۳-۵۴؛ (۹) لسان العرب، بذیلِ مادّۂ نوء؛ (۱۰) المَرْزُوقی: کتاب الازمنۃ والامکنۃ، حیدرآباد ۱۳۳۲ھ؛ (۱۱) Reinaud: *Introduction générale â la geographie des Orientaux*، یعنی *Geographie d' Aboulfeda*، ج ۱، پیرس ۱۸۴۸ء؛ ص clxxxiii؛ (۱۲) G. Ferrand: *Introduction á l' astronomie nautique arabe*، پیرس ۱۹۲۸ء؛ (۱۳) Motylinski: *Les Mansions lunaires des Arabes*، الجزائر ۱۸۹۹ء؛ (۱۴) J. Henninger: *Über Sternkundeund Sternkult in Nord-und Zentral arabien*، در *Zeitschrift für Ethnologie*، ۱۹۵۴ء، ص ۸۲-۱۱۷؛ (۱۵) Ch. Pellat: *Dictions rimés, anwā' et mansions lunaires chez les Arabes*،

در *Arabica*، ۱۹۵۵ء، ۱: ۱۷-۴۱؛ [(۱۶) مفردات، بذیلِ مادّہ؛ (۱۷) ابن الأثیر: نهایة، بذیل مادّہ].

(CH. PELLAT)

---

* **اَنوارِ سُہَیلی**: کَلِیلَة وَدِمْنَة کا فارسی ترجمہ از حسین واعظ کاشفی؛ رک بہ کاشفی.

---

* **اِنْوخ**: (=Enoch احنوخ، حنوک) رک بہ اِدْرِیس.

⊗ **اَنْوَر پاشا**: ترکی کا مشہور قائد و سیاست دان، انجمنِ اتّحاد و ترقّی (عثمانلی اتّحاد و ترقی جمعیتی) کا ممتاز رہنما، احرار ترکوں کا سالار، جس نے رفیقوں کی ایک جاں باز جمعیت کے ساتھ مملکت ترکیہ کے نہایت نازک دور میں شدید خارجی اور داخلی خطروں کا مقابلہ پامردی سے کیا.

انور کے والدین — احمد بے اور عائشہ — کا وطن مناستر تھا (موجودہ بٹول (Betolj)، سابق مقدونیہ، حال جنوبی یوگوسلافیا)۔ خود انور کی ولادت استانبول کے محلّہ ''دیوان یولو'' میں ۲۲ نومبر ۱۸۸۱ء کو ہوئی، جہاں اس کے والد ایک معمولی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ انور اپنے چھے بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کے بچپن ہی میں والدین، غالباً بسلسلۂ تبادلہ، وطن واپس چلے گئے، جہاں ثانوی تعلیم مکمّل کر کے انور استانبول کے مکتبۂ حربیہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس نے فوجی افسروں کے تربیتی نصاب کے علاوہ جنرل سٹاف کا اعلیٰ نصاب بھی پورا کر لیا اور ۲ دسمبر ۱۹۰۲ء کو آخری امتحان ہوا تو پوری جماعت میں دوسرا درجہ حاصل کیا (پہلا درجہ انور کے گہرے اور عمر بھر کے دوست اسمٰعیل حقی پاشا (۱۸۷۹-۱۹۱۵ء) کو ملا)۔ اس زمانے میں ترکی کی سات بڑی فوجیں تھیں۔ انور کو تیسری فوج کے جنرل سٹاف میں بطورِ کپتان مقرّر کیا گیا، جو مقدونیہ میں متعیّن تھا.

مقدونیہ میں اس وقت چھاپا مار دستوں کا ہنگامہ بپا تھا، جنھیں بلقانی ریاستوں سے امداد مل رہی تھی۔ انور کے آئندہ تین سال انھیں دستوں کے خلاف تادیبی کارروائیوں میں گزرے۔ ستمبر ۱۹۰۶ء میں اسے میجر بنا کر تیسری فوج کے صدر مقام مناستر میں لگا دیا گیا۔ غالباً یہیں وہ انجمنِ اتّحاد و ترقّی کا رکن بنا۔ عام روایت کے مطابق اس کا نمبر بارھواں تھا.

جس انجمن نے آگے چل کر ''اتّحاد و ترقّی'' کے نام سے شہرت پائی اس کی ابتدا ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ملک میں دستوری حکومت قائم کی جائے اور تمام انتظامی شعبے جدید اصول پر لائے جائیں، لیکن جب تک یہ تحریک فوج میں نہ پہنچی اس نے کوئی مؤثّر شکل اختیار نہ کی اور نہ اس کے ذریعے کوئی نتیجہ خیز قدم اٹھایا جا سکا۔ اگرچہ فوجی افسروں نے انجمن کی توسیع کے لیے سرگرمی سے کام کیا لیکن حقیقۃً اس میں زبردست روحِ عمل پیدا کرنے اور اسے فعّال قوّت بنانے میں انور کے برابر کوئی نہ پہنچ سکا [رک بہ انجمن اتّحاد و ترقّی]۔ انور ہی تھا جس نے سلطان کو بحالیِ دستور پر مجبور کرنے کے لیے سب سے پہلے عملی اقدام کیا.

مقدونیہ کے فوجی حلقوں میں جو دستوری تحریک تیزی سے پھیل رہی تھی اس کی بھنک سلطان کے کان میں پڑ چکی تھی۔ ایسی تحریکوں کو دبا دینے کی عام تدبیر یہ تھی کہ گرم جوش کارکنوں کو ترقّی دے کر مرکز میں بلا لیا جاتا جہاں ان کی نقل و حرکت کی پوری پوری نگرانی کی جاتی، پھر حسبِ ضرورت ان کے خلاف مقدمے قائم کر دیے جاتے یا بے دست و پا بنا دینے کے دوسرے حربوں سے کام لیا جاتا۔ انور کے سامنے بھی ترقّی کا ایسا ہی مرحلہ پیش آیا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ ترقّی نہیں لینا چاہیے اور جہاں ہے وہیں رہ کر اصل کام جاری رکھا جائے۔ اسی فیصلے کے مطابق وہ ۸ جون ۱۹۰۸ء کو صدر مقام سے نکلا اور ہم نواؤں کی ایک مختصر سی جمعیت کے ساتھ مقدونیہ کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ ۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو احمد نیازی بے نے بھی یہی قدم اٹھایا اور رِسنہ (موجودہ رسان (Resan)، جنوبی یوگوسلافیا) کے پہاڑوں میں جا بیٹھا۔ پھر ایوب صبری نے انھیں کی پیروی کی۔ غرض ایک ہنگامے کی صورت پیدا ہو گئی۔ سلطان نے شمسی پاشا کو ہنگامہ فرو کرنے کے لیے بھیجا، لیکن اسے ۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو مناستر کے بازار میں دن دہاڑے گولی مار دی گئی۔ پھر تیسری فوج کے مختلف دستے پے در پے دستور کے حق میں اعلان کرنے لگے، یہاں تک کہ سلطان ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو ۱۸۷۶ء کے دستور کی بحالی کے اعلان پر مجبور ہو گیا۔ غرض انور ہی کی دلیری اور جاں بازی کی بدولت مملکتِ ترکیہ کے لیے نئے دور کا دروازہ کھلا۔ وہی اس ڈرامے کا ہیرو تھا اور اس وقت اس کی عمر صرف چھبیس سال تھی.

دستور کا اعلان تو ہو گیا مگر تھوڑے ہی عرصے میں سلطان نے خفیہ جوڑ توڑ شروع کر دیے، یہاں تک کہ رجعت پسند عناصر نے استانبول میں ایسے ہنگامے کا سروسامان کر لیا جس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ دستور درہم برہم ہو جائے۔ پھر مقدونیہ کی تیسری فوج نے محمود شوکت پاشا کی سرکردگی میں حفاظتِ دستور کا آخری فرض انجام دیا۔ تیسری فوج استانبول پہنچ گئی۔ ۲۸ اپریل ۱۹۰۹ء کو سلطان عبدالحمید کی معزولی کا اعلان ہوا اور اس کا بھائی محمد رشاد خان، محمد خامس کے لقب سے سلطان بن گیا۔ اس اقدام کی روح و رواں بھی انور ہی تھا.

احیاے ترکیہ کے اسباب کی گردآوری میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوششیں کارگر نہ ہو سکیں تو دُولِ یورپ باہر سے فتنوں کی آگ بھڑکانے میں مصروف ہو گئیں۔ پہلے اطالیہ کو طرابلس الغرب (موجودہ لیبیا) پر حملے کے لیے ابھارا گیا، پھر جنگِ بلقان شروع کرائی گئی تاکہ ترکوں کو امن و اطمینان سے اصلاحِ احوال کا موقع نہ مل سکے؛ چنانچہ انور اور اس کے رفیق داخلی مشکلات کو ختم کر کے اصلاحات کی داغ بیل بھی نہیں ڈال سکے تھے کہ ان کے لیے ایثار و جانبازی کی نئی آزمائشیں پیش آ گئیں.

انور نے مقدونیہ میں جرمنوں کی عسکری تنظیمات و تدابیر سے شناسائی حاصل کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں اسے برلن کے ترکی سفارت خانے میں فوجی اتاشی بنا دیا گیا۔ اس زمانے میں اس نے عسکریاتِ جرمن کا گہرا مطالعہ کیا اور وہاں کی فوجی ترتیبات و

استعداد میں مہارت پیدا کی۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے یکا یک طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا تو انور اتاشی کے عہدے سے مستعفی ہو گیا تا کہ آزاد رضا کار کی حیثیت سے مملکت کے اس دور افتادہ حصّے کی حفاظت کا فرض انجام دے جہاں براہِ راست ترک فوج نہیں بھیجی جا سکتی تھی کیونکہ راستے میں مصر حائل تھا، جو اگرچہ اصلاً مملکتِ ترکیہ کا ایک صوبہ تھا مگر اس پر برطانیہ مسلّط ہو چکا تھا اور اس نے وہاں سے فوج گزارنے کی ممانعت کر دی تھی۔

انور اور اس کے مختلف فدا کار رفیق، جن میں سے مصطفٰی کمال اور عصمت اِنونو بطورِ خاص قابل ذکر ہیں، خدا جانے کس طرح بھیس بدل کر طرابلس پہنچے۔ وہاں مقامی عربوں کو منظّم کر کے اور جوانوں کو جلد از جلد فوجی تربیت دے کر اطالویوں پر یورشوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ زیادہ تر بندوقیں اور توپیں اطالویوں ہی سے چھینیں اور انھیں ساحلِ طرابلس سے چند قدم بھی آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ یہی دَور ہے جس میں ترکوں کی اعانت، ہمدردی اور محبت کے ولولوں سے دنیائے اسلام نے زندگی کی نئی کروٹ لی اور خود پاک و ہند کے مسلمانوں میں ہمہ گیر بیداری کی ابتدا ہوئی۔

اطالیہ طرابلس میں بے چارگی و بدحالی سے دو چار ہوا تو بلقانی ریاستوں میں عہد و پیمان کرا کے ۱۹۱۲ء میں ترکی پر حملہ کرا دیا گیا۔ اب انور اور اس کے رفیقوں کو طرابلس چھوڑ کر وطن کی حفاظت کے لیے لوٹنا پڑا، دولِ یورپ جس طرح طرابلس میں اطالیہ کی پاس دار تھیں اسی طرح بلقانی ریاستوں کی پشتیبان بن گئیں۔ ترکیہ کو پے در پے شکستیں ہوئیں۔ مقدونیہ اور تھریس چھن گئے، اِدرنہ (ایڈریانوپل) طویل محاصرے کے بعد حوالگی پر مجبور ہوا اور استانبول کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت کامل پاشا صدرِ اعظم تھا، جسے عملاً برطانیہ کا کارندہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ذریعے سے جنگ ملتوی کرا کے لنڈن میں صلح کی کانفرنس کا انتظام کر لیا گیا، جس میں قرر پایا کہ حکومتِ ترکیہ مقدونیہ، تھریس کے بڑے حصّے نیز اِدرنہ اور جزیرۂ اقریطش (کریٹ) سے دست بردار ہو جائے۔ کامل پاشا نے اپنی وزارت کو اس کی منظوری پر آمادہ کر لیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۱۳ء کو وزارت اس تجویز پر صاد کرنے والی تھی کہ انور جان ہتھیلی پر رکھ کر اس ایوان میں جا پہنچا جہاں وزارت کا اجلاس ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا، جس پر پانسو سے زیادہ فوجی افسروں کے دستخط تھے۔ مطالبہ یہ تھا کہ یا تو جنگ جاری رکھی جائے یا وزارت مستعفی ہو جائے۔ ناظم پاشا وزیر جنگ انور کو روکنے کے لیے آگے بڑھا، اس کے ایڈی کانگ نے گولی چلا دی، جس سے انور بال بال بچا، مگر اس کا ایک ساتھی مارا گیا۔ انور کے ساتھیوں میں سے بھی کسی نے جوابی گولی چلائی اور ناظم پاشا مارا گیا۔ انور نے اندر پہنچتے ہی فوجی افسروں کا مطالبہ پیش کر دیا، یعنی جنگ جاری رکھی جائے یا استعفا دے دیا جائے۔ کامل پاشا اور اس کے ساتھی مستعفی ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں محمود شوکت پاشا کے زیرِ صدارت نئی وزارت بن گئی۔ لنڈن میں صلح کی جو صورت قرار پائی تھی وہ ٹھکرا دی گئی اور جنگ از سرِ نو شروع ہو گئی۔ اب خود بلقانیوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ ترکوں نے تھریس کا بھی خاصا حصّہ بچا لیا اور اِدرنہ بھی واپس لے لیا، جہاں ترک فوج خود انور کے زیرِ قیادت فاتحانہ داخل ہوئی (۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء)۔

محمود شوکت پاشا کو مخالفینِ احیائے ترکیہ کے ایک گروہ نے ایوانِ وزارت سے نکلتے وقت شہید کر دیا (۴ جنوری ۱۹۱۴ء)۔ سعید حلیم پاشا نے نئی وزارت بنائی، جس میں انور کو وزیرِ جنگ کا عہدہ ملا اور اسے پاشا کا خطاب دیا گیا۔

وزیرِ جنگ بنتے ہی انور نے وسیع پیمانے پر فوجی اصلاحات شروع کر دیں۔ پرانے افسروں کو خدمات سے سبک دوش کر دیا۔ نئے اور کاردان جوان بروے کار لائے گئے، اعلٰی فوجی عہدوں پر تقرّر کے ساتھ آزمائش کی ایک میعاد مقرّر کر دی گئی تا کہ عہدے دار کی صلاحیّت اور کارکردگی کا اندازہ بخوبی ہو جائے۔ یوں فوج جلد اعلٰی پیمانے پر پہنچ گئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جنگِ بلقان کے وقت مملکتِ ترکیہ کی حدود بہت وسیع تھیں مگر اس کی فوج چھوٹی چھوٹی بلقانی ریاستوں کے مقابلے میں بھی شکستیں کھاتی رہی۔ انور کی تیار کردہ فوج چار سال تک عامی جنگ میں مختلف محاذوں پر لڑی اور ہر جگہ اس کی کارکردگی قابلِ ستائش رہی۔

اصلاحات کے ابتدائی دور میں پہلی عالمی جنگ پیش آ گئی اور اس میں ترکوں کے لیے اتحادیوں کے خلاف شرکت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ انور یا اس کے رفیقوں نے اپنی خوشی سے اس میں حصّہ نہیں لیا تھا۔ وہ عرصۂ دراز سے دیکھ رہے تھے کہ دُولِ یورپ ایک دوسرے کو مطمئن کرنے کے لیے یا تو افریقہ کے مختلف علاقے نو آبادیوں کے طور پر بانٹ لیتے ہیں یا مملکتِ ترکیہ کے کسی علاقے یا جزیرے کو طُعمہ بنایا جاتا ہے۔ بلقان کے مختلف علاقے، بوسنیا اور ہرزی گوینا، پھر مقدونیہ، تھریس کا بڑا حصّہ، البانیا، اقریطش، طرابلس، جزائر دوازدہ گانہ (ڈوڈیکانیز)، روڈس، قبرص وغیرہ اسی طرح چھنے تھے۔ آخر برطانیہ اور فرانس نے روس کو ساتھ ملانے کے لیے اسے آبنائیں اور استانبول دے دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ روسی زاروں کی حکومت کا تختہ الٹ جانے کے بعد بالشویکوں نے خفیہ معاہدے شائع کر دیے تو یہ حقیقت دنیا بھر پر آشکارا ہو گئی۔ ترک شاملِ جنگ ہوتے یا نہ ہوتے، ان کے لیے عزّت، امن اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ان کے سامنے یہی راستہ رہ گیا تھا کہ یا تو عزّت کی زندگی کے لیے جانیں لڑا دیں یا بیٹھے بٹھائے ذلّت و نامرادی کی ٹھوکریں کھائیں؛ چنانچہ پہلے روس کے خلاف جرمنی سے ایک دفاعی معاہدہ کیا گیا (۲ اگست ۱۹۱۴ء)۔ سعید حلیم پاشا، انور اور چند خاص رفیقوں کے سوا اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ حکومتِ ترکیہ نے برطانیہ سے دو جنگی جہاز بنانے کی فرمائش کر رکھی تھی اور ان کا روپیہ بھی دے دیا تھا مگر برطانیہ نے وہ جہاز دینے سے انکار کر دیا، لہٰذا ترکوں نے جرمنی سے دو جنگی جہاز لے لیے (جن کے جرمن نام گوبن (Goeben) اور بریسلا (Breslau) تھے؛ ترکوں نے اپنے نام تجویز کر لیے)۔ ان جہازوں نے بحیرۂ اسود میں روسی بیڑے اور بندرگاہوں کو تباہ کیا۔ اس پر اکتوبر ۱۹۱۴ء میں ترکوں کے خلاف اعلانِ

جنگ کر دیا گیا۔

عالمی جنگ میں ترک فوجوں کی مفصّل کارکردگی زیرِغور موضوع سے خارج ہے۔ اجمالاً صرف یہ ذکر کافی ہوگا کہ ترک فوجوں نے قفقاز کے محاذ پر زبردست جنگ جاری رکھی۔ دومرتبہ سویز پر حملہ کیا تاکہ مصر سے انگریزوں کو خارج کر دیا جائے۔ اس اقدام پر شدید مخالفانہ ضرب شریف حسین کی وجہ سے لگی۔ ترک فوج نے عدن پر حملہ کیا۔ ایک ترک فوج فخرالدین پاشا کے زیرِ قیادت اختتامِ جنگ تک مدینۂ منورہ کی حفاظت کرتی رہی۔ سب سے بڑا معرکہ گیلی پولی میں پیش آیا، جہاں ترکوں نے مصطفٰی کمال پاشا کی سرکردگی میں اتّحادیوں کو شکستِ فاش دی اور شدید نقصان کے بعد نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ انور نے ''تشکیلاتِ مخصوصہ'' کے نام سے ایک ادارہ سلیمان عسکری کے زیرِ اہتمام قائم کر دیا تھا، جس نے مقدونیہ، لیبیا (طرابلس الغرب)، قفقاز وغیرہ میں چپاولی جنگ جاری رکھی۔ کُوت العَمَارہ (عراق) میں انگریزوں کو سخت ہزیمت اٹھانا پڑی۔

سعید حلیم پاشا کی وفات پر طلعت پاشا کو صدرِ اعظم مقرّر کیا گیا۔ سلطان محمّد خامس کا انتقال ہوا تو اس کا بھائی وحیدالدین، محمد سادس کے لقب سے سلطان بنا۔ جب جنگ کے حالات بہت نازک صورت اختیار کر گئے تو ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو طلعت پاشا کی وزارت مستعفی ہوگئی تاکہ اتّحادیوں سے متارکۂ جنگ کی گفتگو میں سہولت رہے۔ ۲ نومبر کو طلعت، انور، جمال، ڈاکٹر ناظم اور انجمن اتّحاد و ترقّی کے دوسرے ممتاز ارکان انور کے ایڈی کانگ کاظم کے مکان پر جمع ہوے، جو آبنائے باسفورس کے کنارے تھا اور ایک جرمن جہاز میں سوار ہو کر اُڈیسہ (بحیرۂ اسود) کی روسی بندرگاہ میں جا اترے، جو اس وقت جرمنوں کے قبضے میں تھی، انور وہاں ٹھہر گیا، کیونکہ وہ قفقاز جانے کا خواہاں تھا۔ باقی سب لوگ دسمبر میں برلن پہنچ گئے۔ چند روز بعد وہ بھی برلن چلا گیا۔ استانبول پر اتّحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور سلطان ان کے زیرِ اثر تھا۔ وہاں ایک فوجی عدالت قائم کی گئی، جس نے ۵ جولائی ۱۹۱۹ء کو انور، طلعت، جمال اور ڈاکٹر ناظم کے خلاف غیر حاضری میں موت کی سزا سنا دی۔

ترکِ وطن کے بعد انور تقریباً ساڑھے تین سال تک زندہ رہا۔ اس دور کی سرگرمیوں کا کوئی منضبط، مرتّب اور مفصّل مرقّع ہمارے سامنے موجود نہیں، صرف متفرّق اطلاعات ہیں؛ مثلاً یہ کہ وہ اور جمال پاشا کئی مرتبہ روس اور وسطِ ایشیا گئے۔ اس اثنا میں اناطولیہ میں ایک قومی تحریک شروع ہو چکی تھی اور انور کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی پوری قوّتِ عمل و تنظیم اس تحریک کی تقویّت میں صرف کر دے، لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ جو لوگ براہِ راست تحریک کے ذمّے دار تھے ان سے کسی بھی درجے میں اختلاف کی نوبت آئے۔ اسی دور میں اس نے دو اداروں کی بنیاد رکھی۔ ایک کا نام اسلام و استقلال جمہوریت لری اتّحادی (=انقلابی اسلامی انجمنوں کا اتّحاد) تھا، جسے ایک بین المِلّی انقلابی اسلامی ادارہ سمجھنا چاہیے۔ دوسرے کا نام خلق شورالرفرقہ سی (=عوامی شورائی انجمن) تھا، جو پہلے ادارے کی ایک شاخ تھا۔ بالشویکوں نے نمائندگانِ اقوامِ شرق کی ایک کانفرنس باکو میں منعقد کی تھی (یکم تا ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء)۔ اس کانفرنس میں انور نے بھی لیبیا، تونس، الجزائر اور مراکش کے نمائندے کی حیثیت سے حصّہ لیا۔ مصطفٰی کمال کی طرف سے بھی ایک وفد ابراہیم طالع کی سرکردگی میں شریک ہوا تھا۔

غرض انور کبھی برلن، کبھی روس جاتا آتا رہا۔ ایک مرتبہ اس کا طیارہ انجن کی خرابی کے باعث لتھوانیا میں اتر پڑا اور وہاں اسے کئی ہفتے قید رکھا گیا۔ پھر احباب برلن کی مداخلت سے رہائی ملی۔ اسے یقین تھا کہ بالشویک اس تحریکِ آزادی کی پوری حمایت کریں گے جو مصطفٰی کمال کے زیرِ قیادت اناطولیا میں شروع ہو چکی تھی، لہٰذا اس نے وزارتِ خارجہ روس سے اجازت لینا چاہی کہ ترک اسیرانِ جنگ اور مسلمانانِ قفقاز سے رسالے کے دو ڈویژن تیار کر کے انھیں اپنے زیرِ کمان اناطولیا لے جائے اور تحریکِ استقلال کی حمایت کرے (اکتوبر ۱۹۲۰ء)۔ برلن سے مجاہدینِ اناطولیا کے لیے اسلحہ خریدنے کی بھی کوشش کی۔ مختلف تصریحات سے، جن کی تفصیلی کیفیت معلوم نہیں، مترشّح ہوتا ہے کہ مصطفٰی کمال کو انور کا اناطولیا آنا اور تحریک میں حصّہ لینا پسند نہ تھا؛ مثلاً انور نے میجر نعیم جاوید کو ''خلق شورالرفرقہ سی'' کی طرف سے پروپیگنڈے کا سامان دے کر بھیجا تو اسے بحیرۂ اسود کی بندرگاہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ مصطفٰی کمال کی طرف سے علی فواد سفیر بن کر ماسکو آیا اور انور نے اس سے ملاقات کی (۲۶ فروری ۱۹۲۱ء) تو سفیر مذکور نے انور کو تحریکِ اناطولیا میں مداخلت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس بنا پر انور نے ایک طویل مکتوب مصطفٰی کمال کے نام بھیجا، جس میں واضح کیا کہ خدا جانے میرے متعلّق بے بنیاد شبہات کیوں پیدا ہو گئے؟ آخر میں کہا کہ میں صرف باہر ہی سے قومی تحریک کے لیے ہر ممکن اعانت کا انتظام کرنے پر قانع رہوں گا (۱۶ جولائی ۱۹۲۱ء)۔

ممکن ہے یہ اطلاعات بے بنیاد ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مصطفٰی کمال تک خبریں اس انداز میں پہنچتی ہوں کہ شبہات کے لیے گنجائش پیدا ہو گئی ہو اور جو لوگ نہایت نازک حالات میں اہم کاموں کی ذمّے داری اٹھا لیتے ہیں وہی صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ کوئی نئی چیز پیدا ہوئی تو اس کا اثر اصل تحریک پر کہاں کہاں اور کس کس طرح پڑے گا۔ سب سے آخر میں یہ کہ طبیعتوں کا تفاوت بھی بعض اوقات دو بڑی شخصیتوں کے اشتراک میں حائل ہو جاتا ہے۔

محولۂ بالا مکتوب بھیجنے سے چند روز بعد انور کو اطلاع ملی کہ یونانی فوجیں اَنْقَرہ کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ ماسکو سے باطُوم پہنچ گیا، جو بحیرۂ اسود کے مشرقی کنارے پر اناطولیا کی سرحد سے قریب بڑی بندرگاہ ہے۔ وہاں ۵ ستمبر کو انجمن اتّحاد و ترقّی کے ارکان کا ایک اجلاس ہوا، جس میں مجلس انقرہ سے اپیل کی گئی کہ انجمن اتّحاد و ترقّی کے ارکان سے مخالفت کا برتاؤ ترک کر دیا جائے۔ یہی وقت ہے جب یونانی فوجیں جنگِ سقاریہ (۲ ستمبر۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء) میں شکست فاش کھا کر اس طرح بھاگیں کہ پھر اُزمیر (سمرنا) تک دم نہ لیا۔ بہت سے یونانی مارے گئے یا سمندر میں ڈوب گئے اور ان کی ایک بہت قلیل تعداد ہی جہازوں میں سوار ہو کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکی۔ مصطفٰی کمال کی سیاسی حیثیت

مستحکم ہوگئی۔ اس وقت کوئی مداخلت بداہۃً سراسر خلافِ مصلحت تھی، چنانچہ انور باطُوم سے تفلس، باکُو، عشق آباد اور مَرْو کے راستے بخارا چلا گیا (اکتوبر ۱۹۲۱ء)۔ چند قدیم رفیق ہم راہ تھے۔ ان میں سے حاجی سامی کا نام تصریحًا مذکور ہے، جو ادارۂ خاص (تشکیلاتِ مخصوصہ) میں کام کر چکا تھا۔

عام بیان کے مطابق انور نے بالشویکوں کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ مختلف مسلم عناصر کو منظّم کر کے انگریزوں کے خلاف لڑائے گا۔ یقیناً اس کا عزم یہی ہوگا، تاہم وہ ترکستان کو اجنبی اقتدار سے محفوظ کر دینے کا مقصد نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور ترکستان اس وقت بالشویکوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا، چنانچہ اس نے اُزبکوں کے مختلف گروہوں کو اکٹھا کر کے بالشویکوں کے خلاف مزاحمت پر آمادہ کرنے میں بھی کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔

اپنے مقاصد کے لیے حسنِ تدبیر سے کام لینا گناہ نہیں، تاہم انور کی ذات اس قسم کے ہیر پھیر اور اینچ پینچ سے بہت بالا تھی۔ اس وقت اُزبک مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک جمعیتِ احرار تھی، جس کی عنانِ قیادت عثمان خواجہ کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ بالشویکوں کی اعانت سے امیرِ بخارا کو کابل بھگا چکے تھے اور جمہوریت کے حامی تھے۔ دوسرا گروہ قبائلیوں پر مشتمل تھا، جو ''بَسْمَچی'' کہلاتا تھا اور جمہوریت پسندوں اور بالشویکوں دونوں کی مخالفت اور امیرِ مفرور کی حمایت کر رہا تھا۔ عثمان خواجہ نے انور کا خیر مقدم کیا اور انور نے احمد زکی ولیدی طوغان سے گہرے روابط پیدا کر لیے جو اُزبکوں کو بالشویکوں کے خلاف منظّم کر رہا تھا۔

۸ نومبر کو انور تیس رفیقوں کے ساتھ بظاہر شکار کے بہانے سے نکلا۔ حقیقتًہ وہ بسمچیوں سے مل کر جلد از جلد کام شروع کر دینا چاہتا تھا۔ تاخیر میں اندیشہ تھا کہ بالشویکوں کی حیثیت مستحکم ہو جائے گی۔ وہ شیر آباد سے مشرقی جانب پلٹا اور افغانی سرحد کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ مقامی گروہ اس کی جمعیت میں شامل ہوتے گئے۔ کوا گن تپہ کے حوالی میں، جو دوشَنْبِہ (موجودہ سٹالن آباد) کے جنوب مغرب میں ہے، اس نے ابراہیم سے ارتباط پیدا کر لیا۔ وہ بھی بَسْمَچی رہنما تھا، مگر امیرِ بخارا کا چنداں سرگرم حامی نہ تھا۔ ابراہیم کو احرار ترکوں سے بھی اتنی ہی نفرت تھی جتنی احرار بخاریوں سے تھی، لہٰذا اس نے انور کو گرفتار کر لیا اور تقریبًا چھے ہفتے نظر بند رکھا (یکم دسمبر ۱۹۲۱ - ۱۵ جنوری ۱۹۲۲ء)۔ ایشاں سلطان کے زیرِ قیادت بَسْمَچیوں نے انور کو رہا کرایا؛ پھر اس نے دوسو تاجیک لے کر دوشَنْبِہ پر حملہ کر دیا جہاں سے روسی فوج کو نکال دیا گیا (۱۳ فروری ۱۹۲۲ء)۔

۱۹ فروری کو مفرورین کے تعاقب میں انور کا بازو زخمی ہو گیا۔ دوشَنْبِہ پر کامیاب یورش کے باعث بہت سے مسلّح افراد اس کے پاس جمع ہو گئے۔ بعض کارندے افغانستان چلے گئے تاکہ مزید کمک لائیں۔ پھر کافران کی لڑائی میں انور کو ہزیمت سے سابقہ پڑا (۲۸ جون) اور جس تیزی سے لوگ اس کے گرد جمع ہوئے تھے اسی تیزی سے منتشر ہو گئے، یہاں تک کہ انور بَسْمَچیوں کے ایک قائد دانشمند بک کے ساتھ مل جانے پر مجبور ہو گیا۔ یہ اتّصال بَلْجَوان میں ہوا، جو دوشَنْبِہ سے جنوب مشرق میں ہے۔

۴ اگست ۱۹۲۲ء کو چکن نام گاؤں کے قریب ایک روسی فوج پر جوابی حملہ کیا گیا، جس کی تعداد انور کے رفیقوں سے بہت زیادہ تھی۔ خود انور نے رسالے کی کمان سنبھالی، کلدار توپوں کی باڑھ سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا اور وہیں شہادت پائی۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا اور ذوالحجّہ ۱۳۴۰ھ کی غالبًا ساتویں تاریخ تھی۔ دانشمند بک نے انور کو بچانے کی کوشش میں جان دے دی۔ چکن ہی میں انھیں ۵ اگست کو دفن کیا گیا۔ انور نے چالیس سال آٹھ مہینے اور تیرہ روز کی عمر پائی۔ اس کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جو ملّت وقوم کی بہبود کے لیے فکر و تدبیر یا ایثار و جانبازی سے خالی گزرا ہو۔

انور کا قد متوسّط اور جسم سُبک تھا۔ آنکھیں نہایت خوب صورت اور ان میں خاص چمک تھی۔ وہ ذاتی شجاعت میں بے مثال، جوشِ عمل و سرگرمی کا ایک بے کراں نمونہ، نہایت خلیق، بردبار، شیریں گفتار اور پیکرِ ایثار تھا۔ اس کی تنظیمی صلاحیتوں کا ایک قابلِ قدر مظاہرہ طرابلس الغرب (لیبیا) میں ہوا، جہاں کامل بے سروسامانی کے عالَم میں اس نے مقامی عربوں کو اطالویوں کے خلاف ایک زبردست دفاعی قوت بنا دیا۔ پھر تھوڑے عرصے میں عساکرِ ترکیہ کی کایا پلٹ دی۔ رفیقوں میں گہری اور پائدار وفاداری پیدا کر لینے کا اس میں خاص جوہر تھا۔ عوام کو اس سے بے پناہ محبت تھی۔ اس کے اخلاص و دیانت اور حبّ وطن کی شہادت حریف بھی دیتے رہے۔ راقم الحرف کو اس کے ابتدائی رفیق غازی رؤف بے نے بتایا کہ وہ حیا و شرافت کا پیکر تھا۔

۵ مارچ ۱۹۱۴ء کو انور کی شادی سلطان محمد خامس اور سلطان محمد سادس کی بھانجی امینہ ناجیہ سلطان سے ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پیچھے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔ بیٹیوں میں بڑی کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ چھوٹی کا نام تُرکان تھا، جس کی شادی ہُوَیدا میاتپک سے ہوئی، جو ۱۹۶۳ء میں ترکیہ کی طرف سے سفیر ڈنمارک تھا۔ بیٹے کا نام علی انور تھا۔ اس کے حالات کا پتا نہ چل سکا۔ امینہ ناجیہ سلطان (۱۸۹۸-۱۹۵۷ء) کے ساتھ ۵ مارچ ۱۹۱۴ء کو انور کی شادی ہوئی تھی۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں انور کے لیے وطن چھوڑ جانے کے سوا چارہ نہ رہا تو دوبارہ بیوی اور بچوں کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی البتہ آخری دور میں اس نے ناجیہ سلطان کو ایک درد بھرا خط وسط ایشیا سے بھیجا تھا۔ انور کی شہادت سے تقریبًا چودہ مہینے بعد اس کے بھائی کامل کلی گل نے ناجیہ سے شادی کر لی تھی۔

انور متعدّد زبانیں جانتا تھا۔ ترکی اس کی مادری زبان تھی۔ مکتبۂ حربیہ میں فرانسیسی کی تحصیل لازم تھی۔ پھر اس نے جرمن اور انگریزی بقدرِ ضرورت سیکھ لی۔ طرابلس الغرب میں عربوں سے سابقہ پڑا تو بے تکلّف عربی بولنے لگا۔ جب ماسکو گیا تو وہاں روسی میں بھی بات چیت کا محاورہ ہو گیا۔

صرف ایک واقعہ قابلِ ذکر رہ گیا۔ انور نے ۱۹۱۸ء کے اوائل میں جنوبی و غربی محاذِ جنگ کا دورہ کیا تھا۔ جمال پاشا ساتھ تھا، جو اس زمانے میں شام کا

گورنر تھا۔ اچانک انور نے مدینۂ مُنوّرہ حاضر ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ حجاز ریلوے اس وقت جاری تھی۔ وہ اور جمال سپیشل ٹرین میں مدینۂ مُنوّرہ پہنچے۔ اگرچہ سٹیشن پر سواری کا انتظام موجود تھا، مگر انور نے سوار ہونے سے انکار کر دیا اور کہا: ''ہم غلاموں کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں''۔ سٹیشن سے پیدل مسجد النّبیؐ پہنچے۔ پھر روضۂ اطہر کی زیارت سے شرف یاب ہوے۔ مقامی علما کے اجتماع میں بھی شرکت کی اور واپس چلے گئے۔ اس کی آمد کی کچھ تفصیلات مولانا حسین احمدؒ نے اسیر مالٹا اور نقش حیات (جلد دوم) میں درج کی ہیں۔

۱۹۳۴ء کے بعد انور کے اہلِ خاندان نے خاندانی نام ''کلی گل'' اختیار کرلیا تھا۔ ان میں سے جن جن کے حالات معلوم ہوسکے ان کا ذکر درج ذیل ہے:

نوری کلی گل: (۱۸۹۰-۱۹۴۹ء) احمد بے (بعد میں پاشا) اور عائشہ کا دوسرا فرزند اور انور پاشا کا چھوٹا بھائی۔ وہ بھی فوج میں شامل ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں میجر تھا۔ ۱۹۱۵-۱۹۱۸ء تک طرابلس الغرب (لیبیا) میں مقامی عربوں کو منظّم کر کے اطالویوں کے خلاف لڑاتا رہا اور انھیں ساحلی علاقے سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر وہ قفقاز میں چھاپا مار دستوں کی تنظیم کر رہا تھا۔ حکومت استانبول نے اسے واپس بلا لیا، مگر وہ ارزِ روم میں ٹھیرا رہا۔ ۱۹۲۰ء میں داغستان پہنچ گیا اور وہاں بالشویکوں کی مزاحمت کے انتظام میں مشغول رہا۔ پھر استانبول واپس جا کر سکون کی زندگی بسر کرنے لگا۔ ۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو شلجہ کے کارخانۂ اسلحہ سازی میں جو دھماکہ ہوا اس میں فوت ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تقرر کارخانے میں ہوگیا تھا۔

کامل کلی گل: انور کا سب سے چھوٹا بھائی۔ تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی۔ ۱۹۶۲ء میں انتقال ہوا۔ اس نے انور کی بیوی ناجیہ سلطان سے ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو شادی کی تھی۔

مدیحہ کلی گل: انور کی سب سے چھوٹی بہن، پیدائش ۱۸۹۹ء۔ اس کی شادی ۱۹۱۹ء میں کرنل (بعد میں جنرل) کاظم سے ہوئی، جو انور کا ایڈی کانگ رہ چکا تھا۔ کاظم کو ۱۹۶۱ء میں صدر گرسل مرحوم نے دستور ساز اسمبلی کا صدر بنا دیا تھا۔ بعد میں جمہوریہ کے سینٹ کا رکن نامزد کر دیا۔ مدیحہ نے ۱۹۶۳ء میں وفات پائی۔

خلیل پاشا: (۱۸۸۱-۱۹۵۷ء) انور کا سوتیلا چچا، جو اس کا ہم عمر تھا۔ مکتبۂ حربیہ میں تعلیم و تربیت پا کر ۱۹۰۴ء میں ممتاز یوز باشی (کپتان) بنا۔ طرابلس الغرب (لیبیا) اور بلقان کی جنگوں کے علاوہ عالمی جنگ میں بھی اہم خدمات انجام دیں۔ ۱۹۱۶ء میں بریگیڈیر جنرل (میرلوا) کے عہدے پر پہنچا۔ پھر اسے لفٹننٹ جنرل بنا کر چھٹی فوج کی کمان سونپ دی گئی، جو عراق میں مصروفِ جنگ تھی۔ خلیل پاشا نے وہاں شان دار فتوحات حاصل کیں۔ کوت العمارہ میں اسی نے برطانیہ کی تیرہ ہزار فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا، جو جنرل راؤ ٹشنڈ کے زیرِ کمان تھی۔ جون ۱۹۱۸ء میں اسے قفقاز کی مشرقی فوج کا کمان دار بنا دیا گیا اور وہ باکو پر قابض ہو گیا۔ متارکہ ہوجانے پر اسے باطوم میں نظر بند کر دیا گیا، مگر وہ بچ نکلا اور استانبول پہنچ گیا، جہاں اسے ارمنوں پر تشدّد کے الزام میں قید ہونا پڑا۔ وہاں سے بھی مخلصی حاصل کرلی (۱۸ اگست ۱۹۱۹ء) اور اناطولیا پہنچ گیا۔ مصطفٰی کمال نے اسے فوجی اور مالی امداد حاصل کرنے کے لیے ماسکو بھیج دیا، جہاں وہ چچرن (وزیر خارجہ) اور قراخان سے ملا۔ اسلحہ اور ایک لاکھ ترکی پونڈ کی امداد لے کر لوٹا۔ ۱۹۲۰ء کے سرما میں پھر ماسکو پہنچا ہوا تھا۔ وہاں انور سے رابطہ پیدا کر کے ''خلق شورالر فرقہ سی'' کے لیے کام شروع کرنے کی غرض سے طرابزون پہنچا، مگر مصطفٰی کمال کی حکومت نے اسے وہاں سے نکال دیا۔ احرار ترکوں کی کامیابی کے بعد خلیل پاشا استانبول گیا۔ سلطان وحیدالدین کی حکومت نے اتّحادیوں کے زیرِ اثر اسے فوج سے برطرف کر دیا تھا (۱۸ فروری ۱۹۲۰ء)۔ یہ حکم ۱۹۲۳ء میں منسوخ ہوگیا۔ پھر خلیل پاشا نے کسی سیاسی یا فوجی کام میں کوئی حصّہ نہ لیا۔ ۱۹۳۴ء کے قانون کی پیروی میں اس نے ''کوت'' خاندانی نام اختیار کیا، جو کوت العمارہ میں اس کی شان دار فتح کی یادگار تھا۔

مآخذ: ضیا شاکر (Soku): *Yokin tarihin üc büyük adams: Camal, Enwer, Talât*، طبع ثانی، استانبول ۱۹۴۴ء ایک عام پسند تذکرہ ہے لیکن ہر معاملے میں پابند صحت نہیں؛ (۲) Kurt Okay: *Enwer Pasha, der grosse Freund Deutschlands*، برلن ۱۹۳۵ء، میں واقعہ اور افسانہ دونوں موجود ہیں؛ انور کی بیوہ کے حالات (۳) اخبار وطن، استانبول، ۱۵ دسمبر ۱۹۵۲ و ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوے؛ ۱۹۱۴ تک انور کے سیاسی اور فوجی مشاغل کے لیے قب (۴) A. D. Alderson: *Structure of the Ottoman Dynasty* اوکسفرڈ ۱۹۵۶ء، لوحہ ۴۷؛ (۵) Tevfik Biyikliŏglu: *Trakya' da Milli Mücadeie*، انقرہ ۱۹۵۵-۱۹۵۶ء، بالخصوص ۱: ۸۸ ببعد؛ (۶) Resneli Ahmad: *Khatirat -i- Niyāzi*: Niyazi، استانبول ۱۳۲۶ھ [انگریزی تلخیص از E. F. Night: *The Awakening of Turkey*؛ عربی ترجمہ از ولی الدین بے، اردو ترجمہ از انشاءاللہ: ترکی کی بیداری]؛ (۷) E. E. Ramsaur: *The Young Turks*، پرنسٹن ۱۹۵۷ء؛ (۸) Ali Fuad Türkgeldi: *Görüp Işit-tiklerim*، طبع ثانی، انقرہ ۱۹۵۱ء؛ جرمنوں کے ساتھ اتحاد اور پہلی عالمی جنگ میں شامل ہونے کے متعلق قب (۹): Ibnülemin Mahmud Kemal Inal: *Osmanli devinde son sadriazamlar*، استانبول ۱۹۴۰-۱۹۵۳ء بالخصوص ص ۱۸۹۶ ببعد؛ (۱۰) *Harp kabinelerinin isticvabi*، استانبول ۱۹۳۳ء (۱۹۱۹ء کی پارلیمانی لجنۂ تحقیقات کے سامنے اراکینِ مجلسِ خاصِ جنگ کی شہادت)؛ (۱۱) Carl Mühlmann: *Deutschland und die Türkei, 1913-1914*، برلن ۱۹۲۹ء؛ ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء میں اس کی فوجی قیادت کے لیے قب: (۱۲) W. E. D. Alllen و Paul Muratoff: *Caucasian Battlefields*، کیمبرج ۱۹۵۳ء؛ (۱۳) احمد جمال پاشا: *Memoes of a Turkish Statesman*، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۱۴) M. Larcher: *La guerre dans la guerre mondiale*، پیرس ۱۹۲۶ء؛ (۱۵) Carl Mühlmann: *Dasdeutsch-türkische Waffenbündnis im Weltkrieg*، لائپزگ ۱۹۴۰ء؛ (۱۶) Joseph Pomiankowski: *Der Zusammenbruch des ottomanischen Reiches*، لائپزگ ۱۹۲۸ء؛ جلاوطنی میں انور خلیل اور نوری کی کارروائیوں کے لیے

قپ: (۱۷) Samet Ağaoğlu: *Babamin arkadaşlari*، استانبول ۱۹۵۹ء، ص ۳۰-۴۳ (نوری کا خاکہ)؛ (۱۸) Abdullah Receb Baysun: *Turkistan Milli hareketleri*، استانبول ۱۹۴۵ء؛ (۱۹) Tevfik Biyiklioğlu: *Atatürk Anadoluda*، انقرہ ۱۹۵۹ء، ص ۳۵، ۶۸ ببعد؛ (۲۰) Wipert von Blücher: *Deutschlands Weg nach Rapallo*، Wiesbaden ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۲-۱۳۵؛ (۲۱) Olaf Caroe: *Soviet Empire*، لنڈن ۱۹۵۳ء، ص ۱۱۴-۱۳۰؛ (۲۲) Joseph Castagné: *Les Basmat chis (1917-1924)*، پیرس ۱۹۲۸ء؛ (۲۳) Ali Fuat Cebesoy: *Maskova hatiralari*، استانبول ۱۹۵۵ء، خصوصاً ص ۱۲۸-۱۳۷، ۱۵۷-۱۸۸، ۲۲۰-۲۳۹، ۳۱۳، ۳۲۷؛ (۲۴) Baymirza Hayit: *Turkestan im XX Jahrhundert*، Darmstadt ۱۹۵۶ء؛ (۲۵) Gotthard Jäschke، در *WI*، ۱۹۲۹ء، ۱۰:۶ و سلسلۂ نو، ۷، ۱۹۵۷ء، ص ۴۴-۵۲ و ۶ (۱۹۶۱ء): ۱۸۵-۲۲۲ و ۸ (۱۹۶۲ء): ۳۵-۴۳؛ (۲۶) Sami Sabit Karaman: *Millî mücadele ve Enver Pasa*، از مِیدِ ۱۹۴۹ء؛ (۲۷) Friedrich von Rabenau: *Sceckt Aus seinem Leben 1918-1936*، لائپزگ ۱۹۴۰ء، ص ۹۵، ۳۵۶ ببعد؛ (۲۸) D. A. Rustow، در *World Politics*، ۱۱ (۱۹۵۹ء): ۵۱۳-۵۵۲؛ (۲۹) Otto - Ernst Schuddekopf: *Karl Radek in Berlin*، در *Archiv für Sozialgeschichte*، ۲ (۱۹۶۲ء): ۸۷-۱۶۶ (جس میں Radak کی برلن کی ان یادداشتوں کا جرمن زبان میں ترجمہ، بعنوان *November* بھی شامل ہے، جو پہلی بار مجلہ *Krasnayanov*، اکتوبر، نومبر ۱۹۲۶ء، میں طبع ہوئیں، بالخصوص ص ۹۷ (جہاں انور کی برلن سے ماسکو جانے کی پہلی اور دوسری کوشش میں کچھ التباس واقع ہوگیا ہے) اور ص ۱۵۲؛ (۳۰) احمد زکی ولیدی طوغان: *Bugünku Türkili (Turkistan) ve yokin mazisi*، استانبول ۱۹۴۷ء، ص ۴۳۴-۴۵۳؛ (۳۱) انور کا خط بنام مصطفٰی کمال، مؤرخہ ۱۶ جولائی ۱۹۲۰ء، کی نقل ''جوادارۂ تاریخِ انقلابِ ترکیہ'' (Türk Inkilap Tārihi Enstitüsü) میں موجود ہے.

ان مآخذ میں ان معلومات کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو جنرل کاظم اُورے بے (انقرہ، ۳۰ اور ۳۱ جنوری ۱۹۶۳ء) اور بے علی انور (استانبول، ۴ فروری ۱۹۶۳ء) سے ملاقاتوں کے دوران میں ان کی عنایت سے حاصل ہوئیں۔ ان کے علاوہ دیگر معلومات از راہِ مہربانی Bay Faik Resit Unat، انقرہ، نے بہم پہنچائیں)؛ [(۳۲) وجاہت حسین: انور پاشا، لاہور ۱۹۲۱ء؛ (۳۳) مقالہ انور پاشا، از D. A. Rustow، در *JAI*، لائڈن، طبع دوم؛ (۳۴) مجلۂ الہلال، کلکتہ، جلد اوّل (اگست - اواخر دسمبر ۱۹۱۲ء) و جلد دوم (جنوری - اواخر جون ۱۹۱۳ء)؛ (۳۵) حسین احمد مدنیؒ: نقش حیات (خودنوشت سوانح)، جلد دوم، مطبوعۂ دلی پرنٹنگ ورکس، دلی ۱۹۵۴ء؛ (۳۶) حسین احمد مدنی: اسیر مالٹا].

(غلام رسول مہر)

⊗ **اَنْوری**: اوحدالدّین محمد بن علی بن اسحٰق (۵۶۴ھ/۱۱۶۸ء)، جس کا شمار شاہانِ سلجوقیہ بالخصوص سنجر کے عہد میں فارسی کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کا نام کہیں محمد بن محمد بھی لکھا ہوا ملتا ہے [لباب الالباب، طبع براؤن، ۲: ۱۲۵ ببعد]، لیکن محمد الظہیری السمرقندی نے بھی، جو انوری کا ہم عصر تھا، اس کا نام محمد بن علی ہی لکھا ہے دیکھیے سندباد نامہ، جو اس نے ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء کے تھوڑے عرصے بعد لکھی، طبع احمد آتش، استانبول ۱۹۴۸ء، مقدمہ و ص ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۷ وغیرہ؛ نیز اغراض السیاسۃ، جس کی طباعت ابھی نہیں ہوئی (مخطوطہ در کتب خانۂ آیا صوفیا، استانبول، شمارہ ۲۸۴۴، ورق ۶۴۶ ب)۔ انوری اپنے ایک شعر میں کہتا ہے کہ اس کے دادا کا نام اسحٰق تھا۔ چند سال ہوے ایران میں دیوان قطران کا ایک مخطوطہ ملا ہے، جسے ترتیب دینے والا علی بن اسحٰق ابیوردی شاعر ہے۔ ہر شخص کا خیال یہ ہے کہ اس دیوان کا مرتب مشہور شاعر انوری ہے (قپ مہدی بیانی: دیوان قطران تبریزی، بخط انوری ابیوردی، در مجلۂ یغما، ج ۳، شمارہ ۱۱، تہران ۱۳۲۹ھ ش، ص ۴۷۴-۴۹۵ و دیوان قطران تبریزی، طبع محمد نخجوانی، تبریز ۱۳۳۳ھ ش)، لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دیوان پر شاعر کا تخلّص موجود نہیں۔ اگر انوری کے نام کے بارے میں جو کچھ اوپر مذکور ہوا صحیح ہے تو کہنا چاہیے کہ اس دیوان کا مرتّب خود انوری نہیں بلکہ اس کا باپ تھا۔ اکثر مآخذ میں لکھا ہے کہ انوری شروع شروع میں خاوری تخلّص کرتا تھا اور بعد میں اس نے اپنا تخلّص انوری رکھ لیا۔ انوری کی جاے پیدائش کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ اس سلسلے میں ابیورد، خاوران، بدنہ اور مہنہ مذکور ہوے ہیں، لیکن دولت شاہ لکھتا ہے کہ اس کی اصل ابیورد کی ولایت کے بدنہ نام گاؤں سے ہے، جو مہنہ کی طرف واقع ہے۔ یہاں کے صحرا کو دشت خاوران کہا جاتا ہے۔ تذکرۃ الشعراء (طبع E.G. Browne، لائڈن ۱۹۰۰ء، ص ۸۴) کے اس بیان سے مولد کے بارے میں اختلافی بیانات کی توضیح ہوجاتی ہے۔ خاوران ہی کی نسبت سے غالباً اس نے پہلے خاوری تخلّص رکھا ہوگا.

انوری کے خاندان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ایک تحریر کی بنا پر، جو دیوان کے ایک نسخے میں دیکھی جاتی ہے (ملاحظہ ہو ضمیمۂ حدائق، در فہرست کتب خانۂ سپہ سالار، تہران ۱۳۱۸-۱۳۲۱ھ ش، ۲: ۵۶۵)، انوری ابھی تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ اس کا باپ فوت ہوگیا اور اس کے لیے بہت سی دولت چھوڑ گیا۔ انوری نے یہ دولت عیش و عشرت میں اڑا دی؛ لیکن اس روایت کا اعتبار کر لینا ممکن نظر نہیں آتا کیونکہ اس یقین کر لینے کی صورت میں اس بات کی وضاحت کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ آخر انوری نے اس قدر وسیع اور گوناگوں معلومات کیونکر حاصل کیں۔ یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ انوری نے لڑکپن ہی سے علم حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کی [کہا جاتا ہے کہ اس نے طوس کے مدرسۂ منصوریہ میں تعلیم حاصل کی (براؤن، *Lit. Hist.*، ۲: ۳۶۶)۔] انوری اپنے اشعار میں ان علوم کا ذکر کرتا ہے جو اس نے حاصل کیے: احکام، نجوم، فلسفہ، منطق، ہیئت، کلام وغیرہ (ملاحظہ ہو کلیات، ص ۷۰۴ ببعد)۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ علمِ نجوم میں بہت ماہر تھا، چنانچہ وہ جو حکم لگا دیتا ہر شخص اس پر یقین کر لیتا۔ ایک اَور شعر میں (کلیات، ص ۲۳۶) کہتا ہے کہ وہ

اپنی غزلوں کو دہاوند، راہوی اور عراق کے سُروں میں گایا کرتا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ علمِ موسیقی سے بھی بہرہ مند تھا۔

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ انوری نے تحصیلِ علم کو ترک کیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ ایک دن سلطان سنجر طُوس میں آیا تو انوری مدرسے میں بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص بڑی شان وشوکت والا گزر رہا ہے۔ انوری نے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے؟ اسے بتایا گیا کہ وہ سلطان کے شعرا میں سے ایک شاعر ہے۔ [یہ شاعر امیر معزی تھا (*JA*، مارچ واپریل ۱۸۹۵ء)۔] انوری نے جب دیکھا کہ حالات کی بہبود، جو علم کے ذریعے سے حاصل کی جاسکتی ہے، شعر کہنے سے بھی مل سکتی ہے تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ شاعری کو اپنا پیشہ بنائے گا۔ اس رات اس نے اپنا پہلا قصیدہ لکھا اور اگلی صبح سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان سنجر نے شاعر کی استعداد دیکھ کر اس کا وظیفہ اور روزینہ مقرّر کردیا اور انوری اس کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔ اس روایت میں جس قصیدے کا ذکر آتا ہے وہ کلیات انوری میں شامل ہے (ص ۱۲۴ ببعد)۔ یہ قصیدہ طرزِ بیان کے لحاظ سے اس قدر پختہ اور عمدہ ہے کہ اسے شاعر کا ابتدائی کلام نہیں سمجھا جاسکتا، البتہ اس قصیدے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جس زمانے میں انوری نے یہ قصیدہ لکھا اور سلطان سنجر کے حضور پیش کیا [تو وہ گزشتہ دس سال سے سلطان سنجر کے ''ندیمان مجلس'' اور ''مقیمانِ آستاں'' میں شامل ہونے کا آرزومند تھا (ملاحظہ ہو دیوان انوری، طبع سعید نفیسی، ص ۹۴، بیت ۱ و ۲)]۔ اس وجہ سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ یہ قصیدہ انوری کا اوّلین قصیدہ تو نہ تھا لیکن سلطان سنجر کی مدح میں ضرور کہا گیا تھا، اس لیے اس کے نام سے منسوب ہوا (سلطان سنجر کے ساتھ انوری کی پہلی ملاقات کے بارے میں جو دوسری روایات مذکور ہیں وہ بے بنیاد کہانیاں معلوم ہوتی ہیں)۔

سلطان سنجر کے ساتھ انوری کے گہرے تعلقات کے بارے میں بے بنیاد معلومات کے سوا اَور کوئی بات نہیں ملتی۔ اس کے اشعار سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی سلطان کی مجلس میں موجود ہوتا تھا؛ مثلاً ایک قصیدے میں وہ ظاہر کرتا ہے کہ ۵۳۶ھ/ ۱۱۴۱-۱۱۴۲ء میں وہ کسی طرح سلطان کی ایک مجلس میں حاضر ہونے کے لیے بلخ سے سمرقند آیا (کلیات، ص ۳۵۷-۳۶۲)۔ ۵۴۲ھ/ ۱۱۴۷-۱۱۴۸ء میں ہزار اسپ کی فتح کے وقت وہ سلطان کا ہم رکاب تھا (ملاحظہ ہو حدائق السحر، طبع اقبال، تہران ۱۳۰۸ھ ش، مقدمہ، ص ۸)۔ علاوہ ازیں انوری کے لیے ممکن بھی نہ تھا کہ ہر وقت سلطان کی مجلس میں حاضر رہتا کیونکہ وہ اس بات کی شکایت کرتا ہے کہ سلطان جب ملکوں کو فتح کرنے میں مشغول ہوتا ہے تو اپنے پرستاروں کی طرف نظر نہیں کرتا (کلیات، ص ۱۸۵، بیت ۱)۔ سلطان سنجر کی مدح میں انوری کے دوسرے قصیدوں کی تاریخیں معیّن کرنا ممکن نہیں کیونکہ سلطان سنجر کا عہدِ حکومت نیابۃً و اصالۃً باسٹھ سال تک طول پکڑ گیا تھا (۴۹۰ھ/ ۱۰۹۷ء-۵۵۲ھ/ ۱۱۵۷ء)۔

چونکہ ادبیاتِ ایران کی تاریخ کے مآخذ اکثر دوسرے شعرا کی طرح انوری کے بارے میں بھی بہت کم معلومات بہم پہنچاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان تمام معلومات کو تاریخی ترتیب سے اکٹھا کیا جائے جو اس کے دیوان میں موجود ہیں۔ ترتیب کو قائم کرنے کے لیے انوری کے ممدوحوں کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔ انوری کا قدیم ترین ممدوح وزیرِ رسل ورسائل تھا، جس کا نام صدرالدّین محمد بن فخرالملک الظفری تھا۔ وہ ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۶-۱۱۰۷ء میں سلطان سنجر کا وزیر مقرّر ہوا تھا (دیکھیے عمادالدّین: زبدۃ النصرۃ، طبع ہوتسما (Houtsma)، ص ۲۶۵-۲۶۷)۔ انوری نے اس منصبِ وزارت پر فائز ہونے کی تقریب میں ایک قصیدہ کہہ کر (کلیات، ص ۲۵۲) مبارک باد پیش کی، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انوری نے وہ قصیدہ ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۶ء میں لکھا تھا (اس وزیر کی مدح میں دوسرے قصائد کے لیے ملاحظہ ہو کلیات، ص ۲۰۷ ببعد، ۲۱۳ ببعد، ۳۳۴ ببعد)۔ انوری کا دوسرا ممدوح وزیر نصیرالدّین ابن ابی توبۃ المروزی ہے، جو ۵۲۱ھ/ ۱۱۲۷ء میں وزیر مقرّر ہوا اور ۵۲۶ھ/ ۱۱۳۱-۱۱۳۲ء میں معزول ہوا (دیکھیے زبدۃ النصرۃ، طبع مذکور، ص ۲۶۸-۲۷۰)۔ اس وزیر کے لیے انوری کی کلیات میں صرف ایک قصیدہ پایا جاتا ہے، لیکن اس قصیدے سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انوری نے اس کی مدح میں اَور قصیدے بھی لکھے ہوں گے۔ انوری کا تیسرا ممدوح ناصرالدّین ابوالفتح طاہر بن المظفر فخرالملک ہے، جس کے لیے انوری نے بہت سے قصیدے لکھے ہیں۔ یہ شخص ۵۲۸ھ/ ۱۱۳۳-۱۱۳۴ء میں سلطان سنجر کا وزیر مقرّر ہوا اور ۵۴۸ھ/ ۱۱۵۳ء میں غزّ ترکوں کے حملے کے بعد (قتل سطورِ ذیل) فوت ہوگیا تھا (زبدۃ النصرۃ، ص ۲۷۱)، لیکن انوری کے قصیدے میں (کلیات، ص ۳۰۰) سال ۵۵۰ھ [/ ۱۱۵۵ء] مذکور ہے، لہٰذا وہ اس سال تک یقینی طور پر زندہ تھا۔ انوری کا چوتھا ممدوح مجدالدین ابوالحسن عمرانی ہے، جسے سلطان سنجر نے ۵۴۳ھ/ ۱۱۴۸ء سے ۵۴۸ھ/ ۱۱۵۳ء تک کے درمیانی عرصے میں مروا دیا تھا۔ انوری پر اس کے بہت سے احسان تھے۔ وہ اس کی وفات کے بعد بھی اسے مخلصانہ طور پر یاد کرتا رہا، چنانچہ فتوحی اس کی ہجو لکھتے ہوئے کہتا ہے: عمرانی کو فوت ہوئے پندرہ سال گزر گئے ہیں اور تو ابھی تک اس کی یاد میں شعر کہہ رہا ہے'' (دیکھیے بدیع الزمان بشرویہ خراسانی: سخن و سخنوران، ۱: ۳۷۰)۔ انوری کے ممدوحین میں سے قاضی القضاۃ حمیدالدین، مؤلّف مقامات حمیدی، کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کی کتاب میں، جو ۵۵۰ھ/ ۱۱۵۵ء میں لکھی گئی، اس کی مدح میں انوری کا قصیدہ موجود ہے۔

انوری کی زندگی کا ایک حصّہ ان ممدوحین کے درمیان چنداں آرام وآسائش کے ساتھ نہیں گزرا۔ پہلا واقعہ ستاروں کے اجتماع کے حق میں حکم لگانے کی وجہ سے رونما ہوا۔ مآخذ کے بیان کے مطابق [تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن، ص ۸۵] انوری نے حکم لگایا تھا کہ برجِ میزان میں سات سیّاروں کے یک جا ہونے کی وجہ سے تیز وتند ہوائیں چلیں گی، جو تمام عمارتوں کو ویران کردیں گی، یہاں تک کہ پہاڑوں کو بھی اکھاڑ پھینکیں گی۔ عوام النّاس نے اس حکم سے خوف کھا کر وقتِ معیّن پر ان تہ خانوں اور گڑھوں میں پناہ لی جو انھوں نے بنا لیے تھے، لیکن اس وقت ہوا کو جنبش تک نہ ہوئی۔ اگلے دن سلطان سنجر نے انوری کو بلا کر سخت عتاب کیا۔

انوری نے جواب دیا کہ اجتماع سیّارگان کے اثرات بتدریج ظاہر ہوں گے، لیکن اس سال تیز و تند ہوا نام کو بھی نہ چلی۔ انوری صورتِ حال سے گھبرا کر بلخ چلا گیا، لیکن ہر جگہ عوام الناس کے استہزا کا نشانہ بنا۔ انوری کے مصائب پر فرید کاتب نے دو قطعے کہے، جو آج تک باقی ہیں۔ اس کے باوجود اس روایت پر، جیسے کہ بیان کی گئی ہے، یقین کر لینا مشکل ہے۔ پہلی بات یہ کہ برج میزان میں سیّاروں کا اجتماع ۲۹ جمادی الاُخریٰ ۵۸۲ھ/ ۱۶ ستمبر ۱۱۸۶ء کو واقع ہوا (قب ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۱۱: ۳۴۸؛ دوسرے مآخذ کے لیے قب مجتبیٰ مینوی: اجتماع کواکب در سال ۵۸۲ھ، در مجلّۂ دانشکدۂ ادبیات، تہران ۱۳۳۴ھ ش، ۲: ۱۶-۵۳)۔ از بسکہ سلطان سنجر ۵۵۲ھ/ ۱۱۵۷ء میں فوت ہو گیا تھا اس لیے ممکن نہیں کہ وہ اس واقعے کا شاہد ہو۔ دوم فرید کاتب کے ہجو یہ قطعات میں حکم کا تو ذکر ہے، سات سیّاروں کے اجتماع کا کوئی ذکر نہیں۔ دوسری جانب عبدالواسع جبلی شاعر نے، جو انوری کا ہم عصر تھا، برجِ میزان میں زحل کے داخل ہونے اور عوام النّاس میں قحط اور مصیبت کا ہراس پھیلنے کی بات کی ہے (ملاحظہ ہو سخن و سخنوران، ۱: ۳۶۱)۔ یہ حادثہ ۵۲۲ھ [/ ۱۱۲۸ء] میں واقع ہوا۔ ممکن ہے کہ انوری نے اس دوسرے حادثے کے بارے میں حکم لگایا ہو اور بعد میں یہ حکم دوسرے حکموں کے ساتھ، جو اس نے سیارگان کے اجتماع کے بارے میں لگائے تھے، مخلوط ہو گیا ہو۔

انوری کی زندگی کا دوسرا اہم واقعہ اہلِ بلخ کی ہجو کی وجہ سے رونما ہوا [جو در حقیقت سوزنی نے ''خرنامہ'' کے عنوان سے لکھی تھی (براؤن: *Lit. Hist.*، ۲: ۳۸۲)]۔ لوگوں نے اس ہجو کو انوری سے منسوب کیا اور چاہا کہ ہجو گوئی کی تہمت لگا کر اسے شہر سے نکال دیں۔ انوری نے حمیدالدّین اور چند دوسرے اشخاص کی حمایت سے اس مصیبت سے نجات پائی (کلیات، ص ۲۹۹ ببعد)۔ [اواخر] ۵۴۸ھ/ [اوائل] ۱۱۵۴ء (براؤن: وہی کتاب، ۲: ۳۸۴) میں غز ترکوں (=اُوغُز Ogoz) نے علمِ بغاوت بلند کیا، جس میں انھیں کامیابی ہوئی اور سلطان سنجر ان کے ہاتھوں اسیر ہو گیا۔ غزوں نے سارے خراسان پر قبضہ کر لیا، شہروں کو برباد اور نذرِ آتش کر دیا اور بہت سے نامور علما کو شہید کر ڈالا (الراوندی: راحة الصدور، طبع محمد اقبال، شمارہ ۲: ص ۱۱۷-۱۸۳)۔ اس دہشت ناک واقعے سے تمام اہلِ خراسان کے ساتھ انوری بھی انتہائی خوف زدہ ہوا۔ اس موقع پر انوری نے ایک قصیدہ لکھ کر، جو ''اشک ہائے خراسان'' کے نام سے مشہور ہے، سمرقند کے خاقان کو بھیجا۔ [یہ قصیدہ ۵۵۰ھ/ ۱۱۵۵ء میں لکھا گیا (براؤن: وہی کتاب، ۲: ۳۸۶)] اور اس سے اپنے ملک کی نجات کے لیے مدد مانگی۔ اس واقعے نے ایک اَور وجہ سے بھی انوری کو خوف زدہ کیا تھا۔ انوری نے سلطان علاء الدین حسین غوری کی، جو ۵۴۷ھ/ ۱۱۵۲ء میں سلطان سنجر کا قیدی تھا، ہجو لکھی تھی۔ غز ترکوں کی بغاوت کے دوران میں اس سلطان نے قید سے رہائی پائی اور چاہا کہ انوری سے انتقام لے۔ اس نے اپنے منشی فخرالدّین خالد کو حکم دیا کہ غز ترکوں کے ایک امیر ابوشجاع طوطی (ملاحظہ ہو راحة الصدور، ص ۱۸۲؛ ابن الاثیر، طبع مذکور، ۹: ۵۴) کو خط لکھے اور درخواست کرے کہ انوری کو اس کے پاس بھیج دے۔ لیکن فخرالدین خالد نے، جو انوری کا دوست تھا، انوری کو متنبّہ کرنے کے لیے خط کے سرنامے پر عربی کی تین ابیات لکھ دیں۔ انوری نے سلطان علاء الدّین کے مقصد کو بھانپ لیا اور طوطی کو رضامند کر لیا کہ اسے سلطان علاء الدّین کے پاس نہ بھیجے (انوری کے کلام میں ایک رباعی طوطی نام شخص کی تعریف میں موجود ہے، جو بظاہر یہی امیر ہے؛ ملاحظہ ہو کلیات، ص ۵۴۰، آٹھویں رباعی)۔

[انوری کی وفات کے بارے میں تذکرہ نویسوں کی آرا مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض کے حوالے درج ذیل ہیں (۱) احمد بن محمد بن یحییٰ فصیحی: مجمل (۸۴۵ھ/ ۱۴۴۱ء) میں ۵۸۵ھ/ ۱۱۸۹-۱۱۹۰ء؛ (۲) دولت شاہ سمرقندی: تذکرة الشعراء (۸۹۲ھ/ ۱۴۸۶ء) میں ۵۴۷ھ/ ۱۱۵۲ء؛ (۳) امین احمد رازی: هفت اقلیم (۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۳-۱۵۹۴ء) میں ۵۸۰ھ/ ۱۱۸۴-۱۱۸۵ء؛ (۴) تقی کاشی: خلاصة الاشعار (۹۸۵ھ/ ۱۵۷۷-۱۵۸۷ء) میں ۵۸۷ھ/ ۱۱۹۱ء؛ (۵) تقی اوحدی؛ عرفات العاشقین (۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء) میں ۵۴۷ھ/ ۱۱۵۲ء؛ (۶) حاجی خلیفہ: تقویم التواریخ (۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء) میں ۵۴۷ھ/ ۱۱۵۲ء؛ (۷) محمد بختاور خاں: مرآة العالم (۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۷-۱۶۶۸ء) میں ۵۹۲ھ/ ۱۱۹۵ء؛ (۸) شیر خاں لودھی: مرآة الخیال (۱۱۰۲ھ/ ۱۶۹۰-۱۶۹۱ء) میں ۵۴۹ھ/ ۱۱۵۴-۱۱۵۵ء؛ (۹) غلام علی آزاد: سرو آزاد (۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۲ء) میں ۵۸۵ھ/ ۱۱۸۹-۱۱۹۰ء؛ (۱۰) غلام علی آزاد: خزانۂ عامرہ (۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) میں ۵۸۰ھ/ ۱۱۸۴-۱۱۸۵ء؛ (۱۱) آذر: آتشکدہ (۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶-۱۷۶۷ء) میں ۵۴۵ھ/ ۱۱۵۱-۱۱۵۰ء؛ (۱۲) رضا قلی خاں ہدایت: مجمع الفصحاء (۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳-۱۸۳۴ء) میں ۵۴۵ھ/ ۱۱۵۰-۱۱۵۱ء.

متذکرۂ بالا تذکروں میں تذکرة الشعراء اور مجمل نسبۃً قدیم ہیں۔ اوّلیں تذکرہ چہار مقالہ ہے، لیکن اس میں انوری کا کوئی ذکر نہیں۔ حمداللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ (۷۳۰ھ/ ۱۳۲۹ء) اور عوفی نے لباب الالباب (شروع تیرھویں صدی عیسوی) میں انوری کے حالات تو رقم کیے ہیں لیکن سال وفات نہیں لکھا۔ ان مختلف سنین کے پیشِ نظر انوری کا سالِ وفات متعین نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس کے بعض واردات و اشعار سے اس کے زمانۂ آخر کے متعلق استدلال کیا جا سکتا ہے۔ فتوحی کے اشعار سے، جو اس نے انوری کی ہجو میں کہے تھے (قب اوپر)، معلوم ہوتا ہے کہ انوری ۵۵۸ھ/ ۱۱۶۲ء سے ۵۶۳ھ/ ۱۱۶۷ء تک بقیدِ حیات تھا، اس لیے ۵۶۳ھ سے پہلے کے سنین وفات غلط ثابت ہوتے ہیں۔ پھر جیسے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے سیّاروں کے اجتماع برجِ میزان میں ۵۸۱ھ/ اکتوبر ۱۱۸۵ء میں ہوا۔ اس اجتماع کی بنا پر انوری نے پیشین گوئی کی جو اس کی ندامت کا سبب بنی اور وہ زندگی کے آخری دن گزارنے کے لیے بلخ چلا گیا۔ بلخ میں کسی کی کہی ہجو کے باعث اسے پریشان کن حالات کا سامنا کرنا پڑا (قب اوپر)۔ اس نے معذرت کے طور پر قصیدہ (سوگند نامۂ تہمتی کہ بروی بستند اهالی بلخ) کہا۔ اس قصیدے کے آخر میں آخری سلجوقی حکمران سلطان طغرل تکین بن

ارسلان (۵۷۱ھ/ ۱۱۷۵ء-۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء) اور اس کے وزیر ناصرالدّین کی تعریف کی ہے.

حبّذا تاریخ این انشا که فرمانده ببلخ
رایت طغرل تگینی بود و رای ناصری

یہ واقعات شاہد ہیں کہ وہ ۵۸۱ھ/ ۱۱۸۵ء تک زندہ تھا، اس لیے اس سے پہلے کے سنین بظاہر غلط ہیں۔ جن تذکرہ نویسوں نے انوری کی وفات ۵۸۵ھ/ ۱۱۸۹ء اور ۵۸۷ھ/ ۱۱۹۱ء کے مابین بتائی ہے ان میں ژوکوفسکی (V. Zhukovskiy) اور ایتے (Ethe) بھی شامل ہیں۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ اسی زمانے کے کسی سال میں انوری کی وفات ہوئی.]

اگرچہ کہا جاتا ہے کہ انوری نے علمی موضوعات پر بہت سی کتابیں تالیف کیں اور ان میں ایک مفید کتاب علمِ نجوم کے بارے میں تھی لیکن بظاہر وہ سب کی سب ضائع ہو چکی ہیں۔ آج صرف اس کی کلیات موجود ہے، جو متعدد بار چھپ چکی ہے (قب A. J. Arberry: *Catale. of the Library of the India Office*، ج ۲ و ۶ (کتب فارسی)، لنڈن ۱۹۳۷ء، ص ۲۵۸؛ اس پر تبریز کی طباعتوں ۱۲۶۰ھ و ۱۲۶۶ھ کا اضافہ کر لینا چاہیے)۔ یہ کلیات انوری کے قصیدوں، غزلوں، رباعیوں اور متفرق اشعار اور چند چھوٹی چھوٹی مثنویوں پر مشتمل ہے۔ انوری کی کلیات کی دو شرحیں لکھی جا چکی ہیں: ایک شرح محمد بن داؤد شادی آبادی نے ناصرالدّین خلجی (۹۰۶ھ/ ۱۵۰۰ء-۹۱۶ھ/ ۱۵۱۰ء) کی فرمائش پر لکھی (قب Ch. Rieve: *Catal.*، ص ۵۵۶؛ بلوشہ (Blochet): *Catal.*، ۲: ۴۱)۔ دوسری شرح ابوالحسن فراہانی نے، جو سترھویں صدی کا شاعر تھا، مرتب کی (دیکھیے بلوشہ (Blochet)، ۲: ۴۲؛ Rieve، ص ۵۵۶).

انوری کی کلیات دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان اشعار کی بدولت انوری کو ادبیاتِ ایران میں بہت بلند مقام حاصل ہوا۔ مشہور قطعہ کے رُو سے، جو حقیقت سے دور نظر نہیں آتا، انوری کو فردوسی و سعدی کے ساتھ پیغمبرانِ سخن میں سے شمار کیا گیا ہے:

[سه کس به سخن پیمبران اند
هر چند که لا نبی بعدی
ابیات و قصیده و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی]

ایران کے تذکرہ نویسوں نے تین بڑے قصیدہ نویسوں اثیرالدین اُخسیکتی، خاقانی اور انوری کو، جو سب کے سب شاہانِ سلجوقیہ کے زمانے میں ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے بالمقابل رکھ کر جانچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انوری نے نیا اسلوبِ شعر اختیار کیا اور قصیدہ نگاری کی خصوصیات کو بدرجۂ احسن نباہا۔ ایک شاعر نے ان لوگوں کو جو ظہیر فاریابی کے اشعار کو انوری کے اشعار پر ترجیح دیتے ہیں ایسے گروہ سے تشبیہ دی ہے جو سحر اور معجزے میں امتیاز نہیں کر سکتے.

آج انوری کے کلام کے بارے میں حکم لگانا آسان نہیں کیونکہ اس کا بیشتر کلام مدحیہ ہے، جو موجودہ زمانے میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے باوجود اس کے اشعار کی چند خصوصیات بیان کی جا سکتی ہیں.

انوری کے اکثر قصیدے بہت طویل اور نسیب یا تشبیب کے حامل ہیں، لیکن کبھی کبھی وہ اس کے بغیر ہی مدح شروع کر دیتا ہے۔ چند قصیدوں میں مدح سے پہلے محبوبہ یا ممدوح سے مکالمہ بھی پایا جاتا ہے۔ اس قسم کے قصیدے بہت مہارت کا پتا دیتے ہیں۔ انوری کے بعض قصیدے سلیس بھی ہیں جو اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔ ان اشعار میں جو بات محسوس کی جاتی ہے یہ ہے کہ ان میں احساسات منفرد اور خیالات بہت وسیع ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ عربی الفاظ کثرت سے استعمال کرنے کا رجحان رکھتا ہے بلکہ کبھی کبھی پورے کا پورا مصرع یا شعر عربی زبان میں لکھ جاتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کیفیت کبھی کبھی اس کے اشعار کو ایک اَور طرح کا رنگ خوبی عطا کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ مختلف علوم کی اصطلاحیں بھی شعروں میں سمو دیتا ہے، جس سے فضیلت کی نمائش تو ہوتی ہے لیکن کلام بوجھل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ ابن سینا سے گہری عقیدت رکھنے کی وجہ سے ان افکار کو بھی شعروں میں ڈھال دیتا ہے جو ابن سینا کے فلسفے سے اس نے اخذ کیے (قب کلیات، طبع مذکور، ص ۵۸۵)۔ اس کے اشعار کا مشکل ہونا اسی سبب سے ہے۔ انوری نے غزلیات میں بھی قصائد کی سی پُرشکوہ زبان اختیار کی ہے، جو غزل کے مزاج کے مطابق نہیں؛ نیز ان میں جذباتیت کی کمی ہے جو غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل گوئی نے ابھی وہ صورت اختیار نہیں کی تھی جو آٹھویں صدی ہجری کی غزلوں میں نظر آتی ہے۔ انوری کی رباعیاں بھی اتنی اچھی نہیں۔ انوری دراصل قصیدہ گوئی کے لیے مشہور ہے۔ قصیدے کے بعد اس نے جس صنف پر زیادہ توجہ دی وہ قطعہ ہے.

انوری ادبی صنائع کو، بالخصوص لفظی صنائع کو، جو اس کے زمانے میں بہت مقبول اور مرغوب تھیں، اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی زیادہ تر توجہ فکر و معنی کی طرف ہے جو اس کی فطری استعداد کا نتیجہ ہے۔ شعری خارجی ہیئت کی طرف اس کی توجہ کم ہے۔ اس کیفیت کی ظاہری وجہ یہ ہے کہ انوری شعر و شاعری کو خاص اہمیت نہیں دیتا تھا؛ چنانچہ اپنے ایک قصیدے میں، جو اس نے شعر و شاعری کے موضوع پر لکھا ہے (کلیات، ص ۴۰۴ ببعد)، اسے بے فائدہ اور مبتذل قرار دیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے انوری نے کئی مرتبہ شعر کہنے سے توبہ کی۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے (کلیات، ص ۷۰۵) کہ اس نے مدح و ہجو کہنے سے احتراز اختیار کر لیا ہے اور اس کی ''گمراہی کی حالت'' دور ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انوری اپنے آپ کو شاعری سے بلند خیال کرتا تھا، لیکن چونکہ یہی اس کا ذریعۂ معاش تھا اس لیے مدح گوئی اور اظہار بندگی کے بغیر، جو لازم و ملزوم ہیں، اس کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا (کلیات، ص ۶۲۹ ببعد؛ نیز ص ۴۰۶، بیت ۱، ۱۳).

اس کے باوجود جو اشعار اس کی قلبی کیفیت کا نتیجہ ہیں وہ سہلِ ممتنع کا درجہ

رکھتے ہیں۔اس نے سلجوقیوں کی پوری مملکت میں انتہائی شہرت حاصل کر لی اور یہ شہرت صدیاں گزر جانے کے باوجود کسی وقت کم نہیں ہوئی۔اس کا اثر ایران اور ترکیہ میں سترھویں صدی عیسوی کے کلام پر بہت نمایاں ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ گو انوری کے اشعار اس کے اپنے دور کے ذوق وسلیقہ کے موافق نہیں، تاہم ادبیاتِ ایران کی تاریخ کے ہر زمانے میں ممتاز درجے کے حامل رہیں گے۔

مآخذ: (۱) محمد عوفی : لباب الالباب (طبع براؤن (E. G. Browne): *Persian Historical Texts*، ج ۲)، ۲: ۱۲۵ ببعد و ا: ۳۴۳ ببعد (حواشی از میرزا محمد قزوینی)؛ (۲) دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن، ص ۸۳ ببعد، ۹۰، ۱۱۰، ۱۲۵؛ (۳) آذر: آتش کدہ، بمبئی ۱۲۹۹ھ، ص ۵۸ ببعد؛ (۴) رضا قلی خان ہدایت: مجمع الفصحاء، تہران ۱۲۷۰ھ، ۱: ۱۵۶ ببعد؛ (۵) حمد اللہ مستوفی قزوینی: تاریخِ گزیدہ، طبع براؤن، در *GMS*.، ۱۴/۱: ۴۷۴، ۴۸۸، ۸۱۳ ببعد؛ (۶) خواند امیر: حبیب السیر، بمبئی ۱۲۷۳ھ، ۲/۴: ۱۰۳ ببعد؛ (۷) جامی: بہارستان، مطبوعۂ استانبول، ص ۷۹؛ (۸) Ch. Rieve: *Catalogue of th Persian Mss. in the British Museum*، ص ۵۵۴؛ (۹) بلوشے (Blochet): *Catalogue des Mss. Persans de la Bibliothéque Nationale*، ۳: ۳۸ ببعد؛ (۱۰) عبد المقتدر: *Catalogue of the Arabic and Persian Mss. in the Orient Public Library at Bankipore*، کلکتہ ۱۹۰۸ء، ۱: ۳۳ ببعد؛ (۱۱) ض- حدائق: فہرست کتاب خانۂ مدرسۂ عالی سپہ سالار، تہران ۱۳۱۸ھ، ۲: ۵۶۴ ببعد؛ (۱۲) انوری کے بارے میں اوّلین علمی بحث V. Zhukovskiy کی طرف سے طبع ہوئی ہے *Ali Awhad al -Din Anwari*، در *Materyli dlya biografii ikarakteristiki*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۳ء؛ W. Pertsch کی طرف سے جرمن زبان میں اس کتاب کے خلاصے کے لیے دیکھیے *Literature Blatt für Orientalische philologie*، لائپزگ ۱۸۸۴-۱۸۸۵ء، ج ۲؛ (۱۳) M. Ferté: *Notice sur le poéte persan Enveri*، در *JA*، سلسلہ ۹، ۵: ۲۳۵؛ (۱۴) Ethé: *Grundriss der Iranische Philologie*، ۲: ۲۶۱ ببعد؛ (۱۵) براؤن (E. G. Browne): *A Literary History of Persia*، ۲: ۳۶۵-۳۹۱ (Zhukovskiy کی کتاب پر مبنی ہے)؛ (۱۶) میرزا محمد قزوینی: بیست مقالہ، تہران ۱۳۱۳ھ ش، ۲: ۲۸۳ (انوری کی وفات کے بارے میں)؛ (۱۷) وہی مؤلّف: انوری و سلطان علاء الدین غوری (در یادگار، تہران ۱۳۲۳ھ ش، سال ۱، شمارہ ۵: ص ۷۳ ببعد؛ (۱۸) شبلی نعمانی: شعر العجم (فارسی ترجمہ از گیلانی: تاریخ شعر و ادبیات ایران، تہران ۱۳۱۶ھ، ۱: ۱۹۴-۲۱۵)؛ [(۱۹) محمود شیرانی: تنقید شعر العجم؛ (۲۰) دیوان انوری، طبع سعید نفیسی؛ (۲۱) محمد بن علی بن محمد الظہیری السمرقندی: سندباد نامہ۔]

(احمد آتش)

---

* **اَنْوَرِی:** حاجی سعد اللہ افندی (۱۷۳۳؟-۱۷۹۴ء) ایک عثمانی مؤرّخ، طَرابُزون (Trebizon) میں پیدا ہوا اور جوان ہو کر استانبول گیا۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کرنے کے بعد اسے ''باب عالی'' میں [بحیثیت خوجہ (مہتمم دیوان)] ملازمت مل گئی۔

۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۹ء میں انوری کو سرکاری مؤرّخ کا عہدہ ملا۔ چار تھوڑے تھوڑے وقفوں کے سوا وہ اس عہدے کے فرائض تین سلطانوں مصطفٰی ثالث، عبد الحمید اوّل اور سلیم ثالث — کے عہد میں انجام دیتا رہا۔ اس کے علاوہ دیگر خدمات بھی انجام دیں۔ ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۱ء کے بعد وہ یکے بعد دیگرے 'تشریفاتجی'، 'جبہ جیلر کاتبی'، 'موتوفاتجی'، 'بیوک تذکرہ جی'، اور چار مرتبہ 'محاسبہ جی سی' مقرر ہوا۔ چار بار اس کی جگہ واصف نے یا واصف کی جگہ اس نے کام کیا۔

اس کی تاریخ جس کا نام تاریخِ انوری ہے، کبھی طبع نہیں ہوئی۔ اس کی تین جلدیں ہیں، جن میں سے پہلی میں ان عسکری اور سیاسی واقعات کا ذکر ہے جو روس کے خلاف ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۶۹ء میں شروع ہونے والی جنگ کے دوران میں رونما ہوئے۔ اس کے دیباچے میں مصنّف نے واضح کیا ہے کہ اس نے پُرتکلّف اسلوبِ تحریر سے اجتناب کیا ہے اور خیال رکھا ہے کہ اہم واقعات میں سے کوئی واقعہ چھوٹنے نہ پائے اور کوشش کی ہے کہ واقعات صاف اور سادا زبان میں بیان کیے جائیں (مخطوطہ، در کتاب خانۂ جامعۂ استانبول، عدد ۲۴۳۷ T. Y.، ورق ۲ الف)۔ واصف نے اس جلد کی بعض ضروری مخصوص باتوں کو بدل دیا ہے اور اسے اپنی تاریخ کا پہلا حصّہ قرار دیا ہے۔ جودت پاشا نے انوری کی تاریخ کی دوسری جلد سے بہت کچھ مواد حاصل کیا ہے، جس میں ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء - ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء کا دور لیا گیا ہے۔

انوری شعر بھی کہتا تھا اگرچہ اس میدان میں اس کی تخلیقات کچھ زیادہ توجہ کی مستحق نہیں۔ وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھ سکتا تھا۔ اس نے حج کے لیے مکّۂ معظّمہ کا سفر بھی کیا تھا اور اپنی نیکی اور حسنِ کردار کی وجہ سے مشہور تھا (جمال الدین: آئینۂ ظرفا، استانبول ۱۳۱۴ھ، ص ۵۷۔ مصنّف کا اپنا نسخہ کتاب خانۂ جامعۂ استانبول میں ہے، عدد ۳۷۲ T. Y.؛ فطین: تذکرہ، ص ۲۰)۔

مآخذ: جامعۂ استانبول، انقلاب اور طوپ قپوسرای کے نسخوں کے علاوہ انوری کے بڑے بڑے مخطوطات کے لیے دیکھیے: (۱) *Istanbul Kütüphaneleri Tarih-Coğrafya Yazmalari Kataloglari*، استانبول ۱۹۴۴ء، ۲: ۱۴۳-۱۴۶؛ (۲) Babinger، ص ۳۲۰؛ (۳) محمد ثریّا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ھ، ۱: ۴۴۰؛ (۴) محمد طاہر: عثمانی مؤلفلری، استانبول ۱۳۴۲ھ، ۳: ۲۲؛ (۵) سعد الدین نزہت اِرکُن: ترک شاعرلری، ۳: ۱۳۰۳ھ؛ (۶) نَیْل تومان: *Katalog*، مصنّف کا مخطوطہ در کتاب خانۂ جامعۂ استانبول، ص ۲۷۱؛ [(۷) (آ) انگریزی، طبع اوّل، اور وہ مآخذ جو وہاں درج ہیں]۔

(ABDULKADIR KARAHAN)

---

* **اِنوس:** (نیز اِنُوس یا اِنُوز) کلاسیکی اَیْنُوس (Ainos) کا عثمانی نام، جو آج کل اِینز (Enez) کے نام سے موسوم ہے؛ ایک شہر جو بحرِ اِیجہ کے ساحلِ تراکیا (Thrace) پر (۴۰° ۳۰ عرض بلد شمالی، ۲۶° ۳ طول بلد مشرقی)

دریاے مِیرِچ (Merič) (قدیم ہِبْرُوس Hebros) کے پھیلے ہوے دہانے کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ قدیم زمانے سے پچھلی صدی تک یہ ایک کامیاب بندرگاہ رہا کیونکہ یہ اس اہم تجارتی شاہ راہ پر آباد تھا جو مِیرِچ کی بالائی وادی سے چل کر بحرِ اسود کی خاکنائے کے گرد گھومتی ہوئی جاتی تھی۔ اس میں بڑے قیمتی نمک کی جھیلیں تھیں، جن پر ہر ایک قابض ہونا چاہتا تھا۔ ۱۳۵۵ء میں مِدِلّی (Lesbos) کے ساتھ یہ بھی جان پنجم پیلیولوگوس (John V Palaeologus) کی بہن ماریہ (Maria) کے جہیز میں فرانسسکو گیٹیلوشیو (Francesco Gattilusio) کے ہاتھ آ گیا۔ جب ۱۴۵۵ء میں پالامیڈو گیٹیلوشیو (Palamedo Gattilusio) کی وفات پر خاندانی جھگڑے اٹھے اور ہمسائے میں بسنے والے مسلمانوں کی شکایات پہنچیں کہ اہلِ اِنُوس مسلمانوں کے مفرور غلاموں کو پناہ دیتے ہیں (عاشِق پاشا زادہ، طبع Giese، فصل ۱۲۵؛ تُرسُون (Tursun)، در *TOEM*، ''عِلاوہ''، ص ۶۸) تو محمد ثانی کو وہاں کے داخلی معاملات میں مداخلت کرنا پڑی۔ صفر ۸۶۰ھ/جنوری ۱۴۵۶ء میں محمد ثانی اِنُوس پہنچا اور وہاں کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ اس زمانے سے یہ سنجاقِ گیلی پولی میں ایک قضا کے طور پر چلا آ رہا ہے۔ دریا کے اٹ جانے (جس میں اِن دنوں بمشکل کشتی رانی ہو سکتی ہے)، دہِ اَغاچ [رک بآن] تک ریل نکل آنے اور ۱۹۱۳ء میں سرحدوں کی ازسرِنو تعیین سے اِنُوس اب ماہی گیروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہو کر رہ گیا ہے، جو سمندر سے چار کیلومیٹر کے فاصلے پر دلدلی جھیلوں سے گھرا ہوا ہے۔

مآخذ: (۱) Pauly-Wissowa، بذیلِ مادّۂ *Ainos*، (از G. Hirschfeld)؛ (۲) F. W. Hasluck: *Monuments of the Gattilusi*، در *Annual of the British School at Athens*، ۱۵ (۱۹۰۸-۱۹۰۹ء): ۲۴۸ ببعد (نقشے کا خاکہ اور سیّاحوں کے بیانات کے حوالے وغیرہ)؛ (۳) S. Casson: *Macedonia , Thrace and Illyria*، ۱۹۲۶ء، ص ۲۵۵ ببعد؛ (۴) F. Babinger: *Mehmed der Eroberer und seine Zeit*، میونخ ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۱ ببعد؛ (۵) Ö. L. Barkan: قانُونلَر، استانبول ۱۹۴۳ء، ص ۲۵۵-۲۵۶؛ (۶) پیری رئیس: کِتابِ بَحْرِیہ، استانبول ۱۹۳۵ء ص ۹۸-۹۹؛ (۷) حاجی خلیفہ: جِہان نُما = J. Von Hammer: *Rumeli and Bosna*، وی انا ۱۸۱۲ء، ص ۶۸؛ (۸) M. F. Thielen: *Die europäische Türkey*، وی انا ۱۸۲۸ء، ص ۷۶؛ (۹) *Turkey* (بحریہ کے محکمۂ جاسوسی کا کتابچۂ جغرافیہ)، ۱۹۴۳ء، ۲:۷۹.

(V. L. MÉNAGE)

---

* **اَنُوشَرْوَان**: [ایران کے ساسانی شاہنشاہ] خُسْرَوِ اوّل کے نام کی عربی شکل (الطبری [طبع ڈخویہ]، ۱: ۸۹۲)؛ رک بہ کسریٰ)، پہلوی میں اَنُوشَگ رُوَان، پاژند میں اَنُوش رُآن (= روح جاوید کا مالک)، بعد ازاں فارسی میں نُوشِیرَوَان (نُوشِیرْوَان)، جس کی تشریح عام طور پر نُوشَین رُوَان (= جانِ شیریں کا مالک) سے کی جاتی ہے (بُرھانِ قَاطِع).

[اردو میں بھی فارسی کے تتبع میں نوشیروان ہی لکھا جاتا ہے۔ نوشیروان اپنے باپ قُباذ (کَیْقُباد) کی وفات پر ۵۳۱ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے ساسانی سلطنت کی حدود کو بحیرۂ ابیض اور بحیرۂ اسود کے ساحلوں تک پہنچا دیا، بوزنطی شہنشاہ یوستنیانوس (Justinianus) کو شکست دے کر خراج ادا کرنے پر مجبور کیا اور اڑتالیس سال کی حکمرانی کے بعد ۵۷۹ء میں وفات پائی۔ اس کا عہدِ سلطنت ساسانیوں کی تاریخ کا نہایت درخشاں زمانہ تھا، جس میں مزدکیوں کی خطرناک بدعت کا خاتمہ ہوا، ملک کے اندر امن وامان اور ادب وتہذیب کو ترقی نصیب ہوئی۔ اس کا وزیر بُزُرگ مِہر (بُزُرْجُمِہر) عقل و دانائی میں مشہور تھا۔ عربی اور فارسی کتابوں میں نوشیروان کو نہ صرف عادل بادشاہوں میں شمار کیا گیا ہے بلکہ رحم اور عالی ظرفی کا نمونہ بھی قرار دیا گیا ہے (الطبری، ۱: ۸۶۲ ببعد؛ المسعودی: مُرُوج الذَّھَب، ۲: ۹۷، ۱۵۶؛ البیہقی: کتاب المَحاسن و المساوی، ص ۵۳۸؛ نظام الملک: سیاست نامہ، مطبوعۂ پیرس، ص ۲۹ ببعد)۔ شیخ سعدی کہتے ہیں:

زندہ است نام فرخ نوشیروان بہ خیر
گرچہ بسی گزشت کہ نوشیروان نماند

(گلستان، بہ تصحیح وحواشی از عبدالعظیم قریب، ص ۱۹؛ کلیات سعدی، تہران ۱۳۲۰ھ ش، ص ۱۲، سطر ۹)۔ اس کے مقابلے میں بوزنطی مصنّفین (مثلاً پروکوپیوس) کے بیانات ہیں، جن میں اسے عیّار، پست اخلاق، ظالم اور برادر کش بتایا جاتا ہے؛ لیکن ان بیانات کو بغض وعناد سے مبرّا نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ اسلامی ادب میں نوشیروان کو اس لیے بھی اہمیت دی جاتی ہے کہ اسی کے عادلانہ دورِ حکومت میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادتِ باسعادت ہوئی تھی].

مسلمانوں میں بھی اس نام کے کئی افراد گزرے ہیں (زامباور (Zambaur) نے چار کا ذکر کیا ہے)۔ ان میں سے ایک انوشروان، مِنُوچِہر کا بیٹا اور سلطان محمود غزنوی کا نواسا تھا، جو ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء سے ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء تک جرجان کا امیر رہا (ابن الاثیر، ۹: ۲۶۲)۔ ایک اَور انوشروان کے لیے رک بہ انوشروان بن خالد بن محمد الکاشانی.

مآخذ: متن میں درج تصانیف کے علاوہ (۱) A. Christensen: *'L' Iran sous les Sassanides* باب ۸ [اردو ترجمہ از محمد اقبال: ایران بعہد ساسانیان، انجمن ترقیِ اردو، دہلی ۱۹۴۱ء]؛ (۲) Zambaur، اشاریہ، بذیلِ مادّہ.

(MASSÉ [و ادارہ])

---

* **اَنُوشَرْوَان بن خَالِد بن محمد الکاشانی**: شَرَف الدّین ابونَصْر، سلجوقی سلطان محمد بن مَلِک شاہ کا خزانہ دار اور عارِض الجَیْش۔ جب اس کی جگہ شمس الملک بن نظام الملک کو عارض الجَیْش بنا دیا گیا تو یہ بغداد چلا گیا۔ محمود بن ملک شاہ کے عہد میں اسے کچھ مدّت کے لیے قید کر دیا گیا تھا، لیکن بعد میں رہائی پائی اور عہدۂ وزارت پر متمکّن ہوا (۵۲۱ھ/۱۱۲۷ء-۵۲۲ھ/۱۱۲۸ء)۔ ۵۲۶ھ/۱۱۳۲ء سے ۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء تک وہ خلیفہ المُسْتَرشِد کا وزیر رہا؛ ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء میں

سلطان مسعود ابن محمد کا وزیر مقرّر ہو گیا اور ۵۳۰ھ/ ۱۱۳۵-۱۱۳۶ء تک اس منصب پر فائز رہا۔ ابن الأثیر کے قول کے مطابق اس نے ۵۳۳ھ/ ۱۱۳۸-۱۱۳۹ء میں اور ہِنْدُو شاہ بن سَنْجَر : تَجَارِب السَّلَف کے بیان کی رُو سے ۵۳۲ھ/ ۱۱۳۷-۱۱۳۸ء میں بمقام بغداد وفات پائی، اس نے ایک کتاب اپنے عہد کے حالات پر مشتمل فارسی زبان میں بعنوان فُتُور زَمان الصُّدُوْر و صُدُوْر زَمان الفُتُور تحریر کی، جس کا ترجمہ بعد ازاں عماد الدین نے عربی میں کیا۔ البُنْدَاری نے اس ترجمے کا جو خلاصہ کیا ہے اسے ہوتسما (Houtsma) نے طبع کرا دیا ہے (*Recueil de textes relat. á l'hist, des Seldjoucides*، ج ۲).

حاجی خلیفہ نے اس کی ایک اَور تصنیف نَفْثَةُ المَصْدُور کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن غالباً یہ وہی (مذکورۂ بالا) کتاب فُتُور زَمان الصُّدُور ہے (قب میرزا محمد قزوینی: مقالۂ تاریخی و انتقادی، تہران ۱۳۰۸ھ ش)۔ متعدد معاصر شعرا نے اُنُوشَروان کی مدح میں اشعار کہے۔ اسی نے الحریری کو مقامات لکھنے پر آمادہ کیا تھا.

مآخذ: (۱) ابن الأثیر، ج ۱۰ و ۱۱؛ *Recueil de textes relat. à l'hist. des seldjoucides*، ج ۲؛ (۳) سِبْط ابن الجَوْزی [: مرآة الزمان فی تأریخ الاعیان، آخری حصّہ (۴۹۵-۶۵۴ھ)، طبع Jowett، شکاگو ۱۹۰۷ء و حیدر آباد (دکن) ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء]؛ (۴) ہِنْدُو شاہ بن سَنْجَر: تَجَارِب السَّلَف.

(A. K. S. LAMBTON)

---

* اِنُونُو: رک بہ عِصْمَت اِنُونُو.

---

* اَنْہِلْوَاڑَہ: عربی اور فارسی کتب میں نَہْرَوالہ؛ آج کل پٹَن؛ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں آبادی: ۴۳۰۴۴؛ عرض بلد ۲۰ درجے ۵۱ دقیقے شمالی اور طول بلد ۷۲ درجے ۱۱ دقیقے مشرقی پر ضلع محسانہ، صوبۂ بمبئی، میں دریاے سرسوتی کے بائیں کنارے واقع ہے۔ یہ شہر ۶۹۹ھ/ ۱۲۹۹ء سے ۸۱۶-۸۱۷ھ/ ۱۴۱۳-۱۴۱۴ء تک گجرات کی مسلم ولایت کا صدر مقام رہا، تا آنکہ گجرات کے اوّلین خود مختار سلطان احمد شاہ، نبیرۂ مظفر خاں، نے احمد آباد کو اپنا دار السلطنت قرار دیا.

تاریخ: ہندو اور جینی روایات کی رُو سے اَنْہِلْواڑہ کی بنیاد چاوَڑہ قوم کے فرمانروا بن راج نے ۱۲۸ھ/ ۷۴۶ء یا ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء میں رکھی تھی (دیکھیے مُنْشی (K.M. Munshi): *The Glory that was Gurjaradeśa*، ج ۲، بمبئی ۱۹۴۴ء [نیز دیکھیے مرآتِ احمدی، ۱: ۲۷؛ مرآتِ محمدی، ص ۱۶])۔ چوتھی صدی ہجری کے آغاز/ دسویں صدی عیسوی کے وسط تک یہ چولوکیہ۔ سولنکی خاندان کا دار السلطنت رہا اور ۴۱۶ھ/ ۱۰۲۵ء میں اسے بھیم دیو نے سلطان محمود غزنوی کے حوالے کر دیا؛ لیکن محمود نے، جس کی توجہ کا اصل مرکز سومنات تھا، یہاں صرف اتنے روز ہی قیام کیا کہ سامانِ رسد کی کمی پوری کر سکے۔ [اگرچہ ۵۹۳ھ/ ۱۱۹۶-۱۱۹۷ء میں سلطان قُطب الدّین ایبک نے بھی آبو کے قریب راجپوتوں کے ایک بہت بڑے لشکر کو شکست فاش دے کر نہروالہ فتح کر لیا، لیکن مسلمانوں کا قبضہ یہاں زیادہ عرصے تک نہ رہا اور] شاہانِ دہلی کی افواج ۶۹۹ھ/ ۱۲۹۹ء میں یہاں فوجی پرچم لہرا سکیں جبکہ چولوکیہ۔ باگھیلہ خاندان کی حکومت تھی۔ [سالِ مذکور میں سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے دو سپہ سالاروں اُلُغ خاں اور نصرت خاں کو تسخیرِ گجرات کے لیے روانہ کیا، جنھوں نے باگھیلہ راجہ کرن کو شکست دی اور آگے بڑھ کر انہلواڑہ پر الغ خاں نے اور کھمبایت پر نصرت خاں نے قبضہ کر لیا۔] (فتح مذکور کے لیے دیکھیے K. S. Lal: *History of the Khaldjīs*، الٰہ آباد ۱۹۵۰ء).

ایک صدی تک انہلواڑہ دہلی کے زیرِ سیادت و اقتدار رہا۔ [دربارِ دہلی سے گجرات کے آخری ناظم ظفر خاں کا تقرّر ۲ ربیع الاوّل ۷۹۳ھ/ ۲۱ فروری ۱۳۹۱ء کو ہوا، جس نے ۸۱۰ھ/ ۱۴۰۷ء میں مظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کی اولاد کے عہد میں احمد آباد دار الحکومت قرار پایا اور] انہلواڑہ فقط ایک جاگیر ہو کر رہ گیا۔ ۹۸۰ھ/ ۱۵۷۲ء میں اکبر نے گجرات فتح کیا اور اس کے بعد سے انہلواڑہ صوبۂ گجرات میں سرکارِ پٹن کا مرکز بن گیا (دیکھیے آئین اکبری طبع H. Blochmann، کلکتہ ۱۸۷۷ء).

عمارات: انہلواڑہ میں آٹھویں/ چودھویں صدی کے شروع سے مسلمانوں کے آثارِ قدیمہ کا پتا چلتا ہے۔ آدینہ یا جامعہ مسجد، جو ۷۰۵ھ/ ۱۳۰۵ء کے قریب سفید سنگِ مرمر سے تعمیر کی گئی تھی، بارھویں/ اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئی اور موجودہ شہر کی فصیل بنانے کے لیے مسجد کے ملبے سے پتھر لے لیے گئے۔ گُمدا؟ (Gumada) اور شیخ جوز کی مسجدیں تا حال قائم ہیں، لیکن مسلمانوں کی سب سے شان دار عمارت، جو اس وقت انہلواڑہ میں موجود ہے، خان سروور [کا تالاب] ہے۔ ''ایک نفیس چادرِ آب''۔ جس کا رقبہ ۱۲۷۳x۱۲۲۸ فٹ ہے اور جسے اکبر کے رضاعی بھائی مرزا عزیز کوکہ نے ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء اور ۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۴ء کے درمیان موجودہ شکل دی.

مآخذ: (۱) H. C. Ray: *Dynastic History of Northern India*، ج ۲، کلکتہ ۱۹۳۲ء؛ (۲) H. Cousens و J. Burgess: *Archaeological Antiquities of Northern Gujrat*، در *Archaeological Survey of Western India*، ج ۹، مطبوعۂ ۱۹۰۳ء؛ (۳) *Bombay Gazetteer*، ج ۷ (بڑودہ)، بمبئی ۱۸۸۳ء؛ (۴) مخطوطات محکمۂ رسد: *A History of Gujrat*، لنڈن ۱۹۳۸ء؛ [(۵) مرزا محمد حسن: مرآتِ احمدی، طبع سیّد نواب علی، جز اوّل، کلکتہ ۱۹۲۸ء؛ (۶) غلام محمد: مرآت محمدی، بمبئی ۱۳۴۲ھ].

(P. HARDY)

---

* اَنِیْزَا: رک بہ عُنَیْزَہ.

اَنِیس: میر ببر علی نام، اردو کے نامور شاعر اور ممتاز مرثیہ گو، نسبًا سیّد تھے۔ ⊗

مورثِ اعلیٰ اِمامی مُوسوی عہدِ شاہ جہانی (۱۶۲۸-۱۶۵۸ء) میں ہرات سے آئے اور پرانی دلّی میں آباد ہو گئے۔ مشہور مثنوی نگار میر حسن [رک بآں] اُن کے پرپوتے تھے۔ میر حسن نقل مکانی کر کے فیض آباد چلے آئے، جہاں ان کے منجھلے بیٹے میر خلیق کے ہاں ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱-۱۸۰۲ء میں میر انیس کی ولادت ہوئی۔ درسیات کی ابتدائی کتابیں فیض آباد ہی میں میر نجف علی سے پڑھیں۔ پھر لکھنؤ میں علّامہ حیدر علی سے عربی کی تکمیل کی اور میر امیر علی سے فنونِ سپہ گری سیکھے۔ ان کے تبحّرِ علمی اور وسعتِ نظر کو سب تسلیم کرتے تھے۔

میر انیس کا خاندان ہمیشہ سے مُوقّر و محترم سمجھا جاتا تھا۔ اس گھرانے کی زبان کو سند کا درجہ حاصل تھا۔ سخن فہمی اور سخن گوئی اس کا طرۂ امتیاز رہی اور اس کے ہر فرد کو شاعری گویا ورثے میں ملتی رہی۔ اس کا اندازہ ان کے خاندانی شجرے سے ہو سکتا ہے:

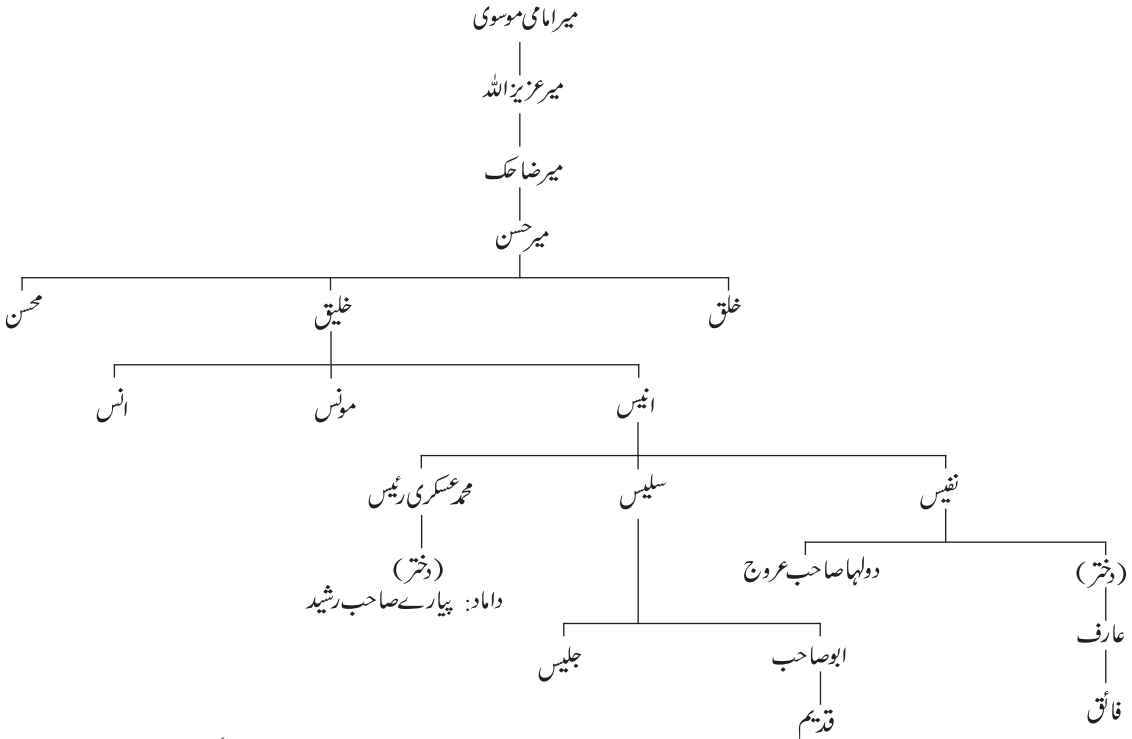

میر انیس بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ شروع شروع میں غزل کہتے تھے اور حزیں تخلّص کرتے تھے۔ پھر ناسخ کی تجویز پر انیس تخلّص اختیار کیا اور اپنے والد میر خلیق کی فرمائش پر غزل کو خیر باد کہہ کر زندگی مرثیہ گوئی کے لیے وقف کر دی اور اس صنف کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔

آصف الدّولہ کے عہد (۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء- ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء) میں فیض آباد کے بجائے لکھنؤ دارالسّلطنت قرار پایا تھا، لیکن میر حسن اور میر خلیق دونوں بہو بیگم (بیوۂ شجاع الدّولہ) کے متوسّلین میں سے تھے، اس لیے ان کا مستقل قیام فیض آباد ہی میں رہا، گو میر خلیق، میر انیس اور خاندان کے دیگر افراد اکثر لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے؛ چنانچہ میر انیس نے تعلیم کی تکمیل لکھنؤ ہی میں کی۔ امجد علی شاہ کے عہد (۱۸۴۲-۱۸۴۷ء) تک فیض آباد کی رہی سہی رونق بھی ختم ہو گئی تو میر صاحب مستقل طور پر لکھنؤ چلے آئے۔ اس وقت ان کی عمر بیالیس سال سے متجاوز تھی۔ پھر انتزاعِ سلطنت تک وہ لکھنؤ سے باہر نہ نکلے۔ یادگارِ انیس کے مصنّف کا بیان ہے کہ زوالِ سلطنت کے بعد کچھ دنوں کے لیے کاکوری میں بھی مقیم رہے۔ ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد کا سفر کیا اور ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علی خاں کی دعوت پر ایک بار پھر وہاں گئے۔ ۱۸۷۱ء میں سیّد شریف حسین (بن ارسطو جاہ) کی تحریک سے نواب تہوّر جنگ نے بہ اصرار حیدر آباد (دکن) بلایا۔ ''اہلِ حیدر آباد نے ان کے کمال کی ایسی قدر کی جیسی چاہیے۔ مجلسوں میں لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ عالی شان مکان کی وسعت جگہ نہ دے سکتی تھی۔ دروازے پر پہرے کھڑے کر دیتے تھے کہ سخن فہم لوگوں کے سوا کسی اَور کو آنے نہ دو اور کسی امیر کے ساتھ دو متوسّلوں سے زیادہ آدمی نہ ہوں۔ اس پر بھی لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ کھڑے رہنے کو غنیمت سمجھتے تھے اور اسی میں خوش تھے کہ ہم نے سنا تو سہی'' (آب حیات، ص ۵۴۷)۔ عظیم آباد کے سفر سے واپسی پر بنارس میں اور حیدر آباد سے لوٹتے وقت الٰہ آباد میں بھی قیام کیا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے مولوی ذکاء اللہ مرحوم پروفیسر میو کالج کی زبانی ایک مجلس کا حال لکھا ہے: ''خاص و عام ہزاروں آدمی جمع تھے۔ کمال اور کلام کی کیا کیفیت بیان کروں۔ محویت کا عالم تھا۔ وہ شخص (انیس) منبر پر بیٹھا پڑھ رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے''۔ ان تمام مقامات پر انیس نے متعدد مجالس میں اپنے کمالِ فن کا سکّہ بٹھایا اور عوام و خواص سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ پڑھنے کا انداز بھی بہت مؤثّر اور دل کش تھا۔

میر صاحب دین داری، زہد وتوکل، خودداری اور پاسِ وضع کا ایک نمونہ تھے (اس سلسلے میں مختلف واقعات کے لیے دیکھیے یادگار انیس، حیاتِ انیس اور واقعاتِ انیس)۔ مزاج میں استغنا اور قناعت تھی۔

۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ/ ۷ دسمبر ۱۸۷۴ء، بروز دوشنبہ، بعارضۂ تپ وفات پائی اور اپنے ذاتی مکان (واقع سبزی منڈی، لکھنؤ) سے ملحقہ باغیچے میں مدفون ہوے۔ شمسی سن کے اعتبار سے تہتّر اور قمری سن کے حساب سے پچھتر برس عمر پائی۔ میرزا دبیر نے تاریخ کہی:

آسماں بے ماہِ کامل سدرہ بے روح الامین
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس = ۱۸۷۴ء

میر انیس کا شمار شعرائے اردو کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے بلکہ بعض نقّاد تو انھیں زبانِ اردو کا بہترین اور کامل ترین شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا کلام مرثیوں، سلاموں اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ عام رواج کے مطابق انھوں نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی مگر ان کی غزلیں دستیاب نہیں کہ ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاسکے، البتہ مطبوعۂ مراثی میں غزل کی طرز پر ان کے سلام موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس ہیئت شعری کی طرف متوجہ رہتے تو اس میں بھی بلند مقام پاتے۔ بہرحال انھوں نے ''شبیرؑ کی مداحی'' کو اپنا موضوعِ سخن ٹھیرایا اور اردو مرثیے کو وہ کمال بخشا کہ اگر دوسرے ملکوں کی زبانوں میں ترجمہ کرکے اردو شاعری کی عظمت کا سکّہ بٹھانا ہو تو کلامِ انیس کا بڑا حصّہ بوجہ احسن یہ مقصد پورا کرسکے گا۔

میر انیس نے جب مرثیہ گوئی کے میدان میں قدم رکھا تو یہ صنف خاصی ترقی کرچکی تھی (رک بہ مرثیہ)۔ میر ضمیر کا طرزِ جدید قبولِ عام کی سند پاچکا تھا اور لکھنؤ کے عام مذاق کے مطابق شوکتِ الفاظ، معنی آفرینی، رعایت لفظی اور صنائع کی گرم بازاری تھی۔ مرزا دبیر [رک بآں] کی شہرت پورے عروج پر تھی اور ان کی علمیت، مضمون آفرینی اور صنائع وبدائع کے کثیر استعمال پر سر دُھنا جارہا تھا۔ میر انیس نے سلاستِ زبان، صفائی روزمرّہ اور خوبی بندش کی خصوصیات ورثے میں پائی تھیں، لیکن ان کی شاعری کا اصل جوہر واقعہ نگاری تھا، جس کے مناسب اور بجا استعمال نے انھیں بہت جلد مجلسِ سخن کا مسند نشین بنادیا۔ لکھنؤ کے سخن فہم دو حریف گروہوں میں بٹ کر ''انیسیے'' اور ''دبیریے'' کہلائے۔ معاصرانہ چشمک کے باوجود خود انیس اور دبیر نے ہمیشہ ایک دوسرے کو عزّت وتکریم کی نظر سے دیکھا اور اپنے مقابل کے بارے میں یہی کہا کہ ایسا صاحبِ کمال شاید پھر پیدا نہ ہو؛ البتہ ''دبیریوں'' اور ''انیسیوں'' کی باہمی رقابت بہت عرصے تک جاری رہی، جس کی بدولت اردو کے مناظرانہ اور تنقیدی ادب میں خاصا قابلِ قدر اضافہ ہوا (قب شبلی نعمانی: موازنۂ انیس و دبیر؛ نظیر الحسن فوق: المیزان؛ میر افضل علی ضو: ردّالموازنہ؛ عبدالغفور خاں نسّاخ: انتخاب نقص؛ مرزا محمد رضا معجز: تطہیر الاوساخ)۔

میر انیس کی شاعرانہ عظمت کو تمام ناقدانِ فن نے تسلیم کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں: ''میر انیس نے اردو شاعری میں، جو مدّت سے بے حس وحرکت پڑی تھی، تموّج بلکہ تلاطم پیدا کردیا''۔ شبلی کی رائے میں ''میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے''۔ مسعود حسن رضوی ادیب کا خیال ہے کہ ''شاعری کی جو تعریفیں کی گئی ہیں، اس کے جو محاسن قرار دیے گئے ہیں، اس کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں، ان سب کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا شمار اعلیٰ درجے کی شاعری میں ہوگا''۔ نوبت رائے نظر کے نزدیک ''میر انیس کے کلام کی روانی دریا کی روانی نہیں، جس میں سیپ، گھونگے، خس وخاشاک، سب ہی بہتے نظر آتے ہیں بلکہ وہ اس نہر کی روانی سے مشابہ ہے جو بلّور سے بنائی گئی ہو، جس میں صاف کیا ہوا پانی آتا ہو اور نہایت خوش رنگ مچھلیاں تیرتی ہوں''۔

ان کا کلام بے حد ہموار اور ابتذال سے پاک ہے۔ عام شعرا کی طرح رطب ویابس کا مجموعہ نہیں بلکہ سادگی و پرکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل ہے۔ وہ بڑے سے بڑے واقعے، نازک سے نازک خیال اور لطیف سے لطیف کیفیت کا ابلاغ مناسب وموزوں الفاظ میں کرجاتے ہیں۔ انھوں نے زبانِ اردو کو صاف ہی نہیں کیا وسعت بھی بخشی ہے۔ ایسے ہزاروں الفاظ و محاورات، جو صرف اہلِ زبان کی بول چال میں آتے تھے ایسی خوش سلیقگی سے برتے کہ وہ جزوِ شاعری ہوکر رہ گئے۔ بقول سر تیج بہادر سپرو: ''ان کی شاعری فنّی حیثیت سے اس قدر مکمل ہے کہ ناقد کو ان کے باب میں مجالِ سخن نہیں۔ ان کے کلام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ زبانِ اردو میں انسانی دماغ کے عمیق ترین خیالات وجذبات کے اظہار کا ذریعہ بننے کی کس قدر اہلیت ہے''۔ ان کی تشبیہیں، استعارے اور تمثیلیں سریع الفہم ہونے کے علاوہ موضوع اور موقع کے عین مطابق ہیں اور فطرت، حیاتِ انسانی اور جذبات کی گہرائیوں سے نکلی ہیں۔ فصاحت، نشستِ الفاظ اور زورِ کلام ان کے ہر مرثیے میں موجود ہے۔ اپنی قوتِ متخیلہ کو کام میں لاکر وہ ایک ہی مضمون کو بڑی سادگی اور دل آویزی سے سو سو طرح باندھتے ہیں اور ہر بار وہ ایک نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

میر انیس کے کلام میں بقول مولانا شبلی ''بلاغتِ الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجے کی ہے، لیکن یہ ان کے کلام کا اصلی معیار نہیں۔ ان کے کلام کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے''۔ انھوں نے ہر مقام پر جزئیاتِ بلاغت کا پورا خیال رکھا ہے؛ جذباتِ فطرت اور مناظرِ قدرت کی بے مثل تصویریں کھینچی ہیں؛ کوئی واقعہ ایسا نہیں جو اقتضاے حال کے خلاف ہو اور ترتیب واقعات اور تسلسل بیان کے قابلِ قدر نمونے پیش کیے ہیں۔ غرض تکلّف وتصنّع، مبالغہ واغراق اور دِقّت پسندی کی فضا میں رہ کر میر انیس نے حقیقی شاعری کا چراغ جلایا۔

اخلاقی شاعری کے اعتبار سے بھی میر انیس کے مراثی کا پایہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے مختلف طبقات کے فرائض وحقوق کا اظہار بڑے سلیقے سے کیا اور روحانی اور اخلاقی تقاضوں کی طرف توجہ منعطف کرائی۔ اخلاق کی تعلیم انھوں نے براہِ راست پند وموعظت کے ذریعے بہت کم دی ہے۔ بالعموم وہ امام حسینؓ

اور رفیقانِ امام ہمامؓ کی بلند اخلاقی کے نہایت دل کش نمونے پیش کر کے ہمیں ان کی تقلید کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک ایسی فضا ملتی ہے جو تمام تر خیر اور نیکی کی طرف مائل کرنے والی ہے۔ انیس کے زمانے تک کربلا کی خونیں داستان مسلمانانِ ہند کا تہذیبی سرمایہ بن چکی تھی، لیکن یہ ان کی کردار نگاری اور واقعہ نگاری کا کمال ہے کہ بلا لحاظِ مذہب و ملّت برّعظیم پاک و ہند کے تمام باشندوں نے اسے ایک ذاتی المیے کا درجہ دے دیا ہے۔ اگر یہ پہلو پیشِ نظر رکھا جائے تو انیس اور دوسرے مرثیہ نگاروں پر یہ اعتراض بڑی حد تک رفع ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اشخاصِ مرثیہ کی جو سیرت دکھائی ہے اس میں عربیت پر ہندوستانیت غالب ہے، کیونکہ شاعر کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ اس کے مخاطبین امام حسینؓ کو حسنِ اخلاق کا محض خیالی معیار نہیں بلکہ عملی طور پر اپنے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ قرار دیں اور ان کے مصائب کو اپنی ذاتی مصیبتوں کی طرح محسوس کریں۔ یہی وجہ ہے کہ انیس نے واقعہ نگاری کے ضمن میں بھی تاریخی حقائق کے بجائے صداقتِ شعری کو معیار ٹھیرایا ہے۔

میر انیس کی عظمتِ فن ان کی جذبات نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں مضمر ہے۔ انھیں خارجی کیفیات اور داخلی واردات دونوں کی تصویر کشی پر بے نظیر قدرت حاصل تھی۔ مناظرِ قدرت اور رزم و بزم کا جو مرقّع وہ پیش کرتے ہیں اس کی تمام جزئیات اپنی اپنی جگہ مکمل ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ اشخاصِ مرثیہ کی حیثیت، عمر، جنس اور حالت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان کے جذبات و کیفیات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کردار نگاری کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

انھوں نے کم و بیش ایک ہزار مرثیے کہے (واقعاتِ انیس)، جن میں سے کئی ایک ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ مراثی انیس پہلی بار ۱۸۷۶ء میں مطبع نول کشور، لکھنؤ سے پانچ جلدوں میں شائع ہوئے تھے۔ پھر سیّد علی حیدر طباطبائی نے انھیں تین جلدوں میں مرتب کر کے بدایوں سے شائع کیا (۱۹۲۱-۱۹۳۰ء)۔ ان کا ایک اَور قابلِ ذکر ایڈیشن (مرتبۂ مرزا احمد عباس) حال ہی میں کراچی سے شائع ہوا ہے (۱۹۶۱ء)۔ کلامِ انیس کا ایک اَور قابلِ ذکر مجموعہ رباعیاتِ میر انیس مرحوم (مرتبۂ سیّد محمد عباس، مطبوعۂ نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۹۴۸ء) ہے۔ شعرائے اردو میں مرثیہ نگاروں نے رباعی کو خاص اہمیت دی اور انھوں نے ہر مرثیے کے ساتھ چند رباعیاں پڑھنا اپنا شعار بنا لیا۔ میر انیس بھی اس دستور کے پابند تھے، چنانچہ اس مجموعے میں ان کی پانسو سے زیادہ رباعیاں شامل ہیں جو مجموعی طور پر مذہبیت اور اخلاقیات کے تحت آتی ہیں اور انھیں فارسی کی بہترین رباعیات کے مقابلے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

میر انیس کا کلام زبان، مواد، اسلوب اور فن کے معیار پر پورا اترتا ہے اور اردو شاعری نے اس سے جو اثر قبول کیا ہے وہ دیر پا بلکہ لازوال ہے۔

مآخذ: (۱) بیلی (T. G. Bailey): *A History of Urdu Literature*، عدد ۱۵۲، کلکتہ ۱۹۳۲ء؛ (۲) سیّد غلام امام: *Anis & Shakespeare: a comparison*، لکھنؤ ۱۹۵۰ء، نیز قب مقدمہ از سر تیج بہادر سپرو؛ (۳) رام بابو سکسینہ: *A History of Urdu Literature*، الٰہ آباد ۱۹۴۰ء، ص ۱۲۶ ببعد (اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری: تاریخ ادب اردو، ص ۲۶۵ ببعد)؛ (۴) محمد حسین آزاد: آبِ حیات، مطبوعۂ شیخ مبارک علی، لاہور؛ (۵) حالی: مقدمۂ شعر و شاعری، مرتبۂ تنویر الدّین علوی، مطبوعۂ علی گڑھ (نیز قب مرتبۂ ڈاکٹر وحید قریشی، مکتبۂ جدید، لاہور)؛ (۶) شبلی: موازنۂ انیس و دبیر، آگرہ ۱۹۰۶ء؛ (۷) سیّد عابد علی عابد: موازنۂ انیس و دبیر کے باب میں، در موازنۂ انیس و دبیر، مطبوعۂ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۴ء؛ (۸) سری رام: خمخانۂ جاوید، جلد اوّل، دہلی ۱۳۲۵ھ؛ (۹) عبدالحی: گل رعنا، اعظم گڑھ ۱۳۷۰ھ؛ (۱۰) امجد علی اشہری: حیات انیس، آگرہ ۱۳۴۳ھ؛ (۱۱) مہدی حسن احسن: واقعاتِ انیس، لکھنؤ ۱۹۰۸ء؛ (۱۲) مسعود حسن رضوی ادیب: روح انیس، الٰہ آباد ۱۹۳۱ء و لکھنؤ ۱۹۵۶ء؛ (۱۳) امیر احمد علوی: یادگارِ انیس، لکھنؤ ۱۳۵۳ھ؛ (۱۴) سفارش حسین رضوی: میر انیس، مطبوعۂ مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی؛ (۱۵) شارب ردولوی: مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر، مطبوعۂ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ؛ (۱۶) نوبت رائے نظر، در زمانہ، کان پور، فروری ۱۹۰۸ء؛ (۱۷) ابن حسن جارچوی: میر انیس، در نوائے انیس، کراچی ۱۹۶۵ء؛ (۱۸) محمد احسن فاروقی: نوائے انیس، در کتابِ مذکور؛ (۱۹) جعفر علی اثر: انیس کی مرثیہ نگاری (مضامین بجواب احسن فاروقی، در رسالۂ نگار ۱۹۵۵-۱۹۵۶ء؛ (۲۰) ارشد جعفری: میر انیس کی مرثیہ نگاری، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے، کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی، لاہور؛ (۲۱) سید صفدر حسین: زندگی اور ادب شاہانِ اودھ کے عہد میں، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی، لاہور؛ (۲۲) ابواللیث صدیقی: لکھنؤ کا دبستان شاعری، لاہور ۱۹۵۰ء۔

(سیّد امجد الطاف)

اَوائل: اوّل (= پہلا) کی جمع [= وہ چیزیں جو سب سے پہلے ایجاد ✱ ہوئیں یا علم میں آئیں]۔ یہ لفظ اصطلاحی طور پر مختلف النّوع تصوّرات کے سلسلے میں بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً مُدرَکاتِ فلسفہ یا مظاہرِ قدرت کے ''مبادیات''؛ زمانۂ جاہلیت یا ابتدائے عہدِ اسلام کی وہ چیزیں جو پہلے پہل ایجاد ہوئیں یا عمل میں آئیں یا ان کے موجد؛ اوائل سے مقصود وہ واقعہ یا وہ اسم یا فن بھی ہے جو اپنے سلسلے کی پہلی کڑی ہو۔

یہ اصطلاح اسلامی ادبیات کی ایک چھوٹی سی شاخ کے لیے مخصوص ہے جس کا تعلّق ادب، تاریخ اور الٰہیات سے ہے۔ خود مسلمانوں کے ہاں دسویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں حاجی خلیفہ (استانبول ۱۹۴۱-۱۹۴۳ء، عمود ۱۹۹۶؛ طبع فلوگل (Flügel)، ۴۹۰:۳) نے اوائل کو تاریخ اور ادب سے متعلّق ایک جداگانہ علم قرار دیا ہے۔

ابتدائے آفرینش کے بارے میں تجسّس سامی متقدّمین کے تاریخی شعور میں گہری جڑ پکڑ چکا تھا اور یہ [مختلف] ادبی واسطوں سے عربوں تک پہنچا۔ یونانی (Hellenistic) دنیا میں اوّلین موجدوں سے متعلّق کتابیں موجود تھیں (Peri Heurêmatôn)، قب حالیہ تصنیف A. Kleingünther: *Prôtos*

Heuretês، در Philologus Supplementband، ۲۶:۱، ۱۹۳۴ء)۔ مسلمانوں کے لیے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور آغازِ اسلام کی تاریخ سے متعلّق ''اوائل'' کا علم کئی پہلوؤں سے دوررس فقہی اور علمی اہمیّت کا حامل تھا، چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوانح حیات کے متعلق جو قدیم ترین ادب موجود ہے اس میں اس طرف خاص توجہ دی گئی ہے (قب الثعالبی: لطائف المعارف، طبع مصر ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۶۰ء)۔

نہ صرف سیاسی تاریخ بلکہ تہذیب وتمدّن اور علم کی تاریخ میں مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے شوق کے ساتھ ساتھ (قب بالخصوص وہ تمہیدی ملاحظات جو الفِہرِست کے ہر باب میں کسی خاص علم کی اصل وابتدا کے متعلّق درج ہیں) ایسے ہر موضوع کے متعلّق جو تصوّر میں آسکتا ہے یہ سوال کیا جانے لگا کہ اس میں اوّلیت کا شرف کسے حاصل ہے؟ اور اس کا جواب بھی ہمیشہ دیا گیا، گو اس سلسلے میں کبھی کبھی خیال آرائی سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ بہر حال اوائل کے موضوع پر تصانیف اپنے مصنّفین کی تہذیبی وسعتِ نظر اور تاریخی سوجھ بوجھ کی درخشاں تعبیرات ہیں اور گراں قدر مواد اور دلچسپ علمی نِکات سے پُر ہیں۔ یہ مضامین جس وسیع علمی وذہنی جاذبیت کے حامل ہیں اس کا پتا اس حقیقت سے چلتا ہے کہ سنہ عیسوی کے آغاز ہی سے چینیوں کے ہاں بھی اوائل پر کتابیں موجود تھیں (قب J. Needham: Science and Civilization in China، کیمبرج ۱۹۵۴ء، ۱:۵۱ ببعد)۔ آگے چل کر متأخّر ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں بھی قدیم موجدوں کے متعلّق مفید ومستند کتابیں لکھی گئیں، جیسے چودھویں صدی عیسوی کے مصنّف Guglielmo da Pastrengo کی کتاب De viris illustribus کا وہ باب جو موجدوں کے بارے میں ہے اور حروفِ تہجّی کے مطابق مرتّب کیا گیا ہے (وینس ۱۵۴۷ء، بعنوان De originibus rerum، اوراق ۷۸-الف تا ۸۹-الف)؛ نیز polydore Vergil کی مشہور ومعروف اور مقبولِ خاص وعام تصنیف De originibus rerum، جو سب سے پہلے ۱۴۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

اسلامی ادبیاتِ اوائل کی قدیم ترین نمائندہ تصنیف کا زمانہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کا آغاز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوبکر بن ابی شَیْبَہ (م ۲۳۵ھ/ ۸۴۹ء؛ براکلمان: تکملہ، ۱:۲۱۵) کی ضخیم تصنیف المُصنّف کے آخر (یا تقریبًا آخر) میں اوائل سے متعلّق ایک مستقل باب موجود تھا، جس سے [بدرالدین محمد بن عبداللہ] الشِبْلی [م ۷۶۹ھ/ ۱۳۶۷ء] کی تصنیف مَحَاسِن الوَسَائِل اِلی مَعْرِفَۃ الاَوَائِل میں ماخذ کا کام لیا گیا ہے۔ بظاہر اس کا موضوع ابتدائے اسلام کے اوائل اور مسلمانوں کی تاریخ ورسوم کا آغاز تھا۔ اس باب کا آخری حصّہ مخطوطے کی صورت میں محفوظ ہے (برلن، عدد ۹۴۰۹)؛ لیکن المُصنّف کے دوسرے بڑے حصّوں کا مطالعہ نہیں کیا جاسکا۔

اسی زمانے میں کِتاب الاَوَائِل کے نام سے ہشام ابن الکَلْبی (یاقوت: اِرشاد، ۷:۲۵۲)، الممدّ ائنی (الفِہرِست، ص ۱۰۴)، الحَسَن بن مَحْبُوب (الفِہرِست، ص ۲۲۱؛ جس کی تصانیف یاقوت: اِرشاد، ۷:۳۲، میں احمد الرَّقّی کے نام کے تحت درج ہیں) اور ایک اَور مصنّف سَعِید بن سَعْدُون العَطّار (الفِہرِست، ص ۱۷۱؛ جس کی تاریخ پیدائش و وفات معلوم نہیں ہوسکی) نے بھی کتابیں لکھیں۔ چونکہ ان تصانیف میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں اور نہ اوائل سے متعلق دیگر تصانیف میں ان کا کوئی حوالہ ملتا ہے اس لیے یہ بات نہایت مشتبہ ہے کہ ان کتابوں میں اوائل کا ذکر اسی مفہوم میں آیا ہو جس سے ہم بحث کر رہے ہیں (یا یہ کہ ان میں کوئی مواد اوائل کے متعلّق موجود بھی تھا یا نہیں)۔ الفِہرِست، ص ۱۳۳، میں چوتھی/ دسویں صدی کے مصنّف المَرْزُبانی کی کتاب الاوائل کی بیان کردہ کیفیت کی رُو سے اس میں موجدوں سے نہیں بلکہ قدیم ایرانیوں اور مُعْتَزِلَہ کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔

تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے اواخر میں ابن قُتَیْبَہ نے تاریخ کے ضمن میں اپنی کتاب المَعَارِف (طبع وُسٹِنْفِلْڈ (Wüstenfeld)، ص ۲۷۳-۲۷۷) کا ایک باب اوائل کے لیے وقف کیا؛ [اسی طرح ابن رُستہ نے الاعلاق النفیسۃ، ص ۱۹۱-۲۰۰ میں؛] (نیز الثَّعالبی: کتاب مذکور، ص ۳-۱۷ [طبع مصر، ص ۵-۲۳])۔ ادبی ضمن میں چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں ایک باب البَیْہَقی کی کتاب المحاسِن (طبع Schwally) ص ۳۹۲-۳۹۶، میں ملتا ہے۔ تقریبًا اسی زمانے میں مذہبی اوائل کے موضوع پر ابوعَرُوبَہ [رَکّ بآن] اور [سلیمان بن احمد] الطَبَرانی (م ۳۶۰ھ/ ۹۷۱ء؛ براکلمان: تکملہ، ۱:۲۷۹) نے کتابیں لکھیں۔

ادبی تصانیف میں اس موضوع کا مخصوص مطالعہ سب سے پہلے ابو ہِلال [حسن بن عبداللہ] العَسْکَری (م ۳۹۵ھ/ ۱۰۰۵ء) کی کِتاب الاَوَائِل میں کیا گیا، جس کا دعوٰی ہے کہ اس صنف میں اس کا کوئی پیش رَو نہیں ہے۔ [یہ کتاب ۳۸۹ھ/ ۹۹۹ء میں مکمل ہوئی۔] اس نے عربوں اور مسلمانوں کی تاریخ سے حاصل کردہ مواد تک اپنے آپ کو محدود رکھا، اگرچہ کچھ حوالے اس نے ایرانی مآخذ اور اِنجیل سے بھی دیے ہیں، لیکن ''یونانی'' ثقافتی وعلمی معلومات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک معیاری کتاب کے طور پر العَسْکَری کی اس تصنیف کے بکثرت حوالے دیے جاتے رہے ہیں اور اس نوع کی متأخّر تصانیف، مثلًا آٹھویں صدی/ چودھویں صدی کی [کمال الدّین عبدالرحمٰن بن محمد] العَتائِقی اور السُّیُوطی [: الوسائل] کی کتابیں اسی پر مبنی ہیں (قب براکلمان، ۱:۱۳۲ و تکملہ، ۱:۱۹۳ ببعد)۔ [العتائقی نے اپنی کتاب مختارات من کتاب الاوائل ۷۸۸ھ/ ۱۳۸۶ء میں تالیف کی تھی۔]

ادبیاتِ اوائل کے سلسلے میں اس کے بعد کوئی دو صدیوں کا وقفہ نظر آتا ہے اور پھر کہیں ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدا میں المَوْصِلی کی غَایَۃ الوَسَائِل اِلی مَعْرِفَۃ الاَوَائِل ملتی ہے (قب براکلمان: تکملہ، ۱:۷۵۹ ببعد؛ رِٹّر (H. Ritter)، در Oriens، ۱۹۵۰ء، ص ۸۰ ببعد)۔ الاوائل کے نمونے پر ایک تاریخی کتابچہ مذکورۂ بالا المحاسن ہے، جو آٹھویں صدی/ چودھویں صدی میں

الشِّبلی نے لکھی تھی (قب براکلمان، ۲:۹۰ بعد و تکملہ، ۲:۸۲؛ F. Rosenthal: *A History of Muslim Historiography*، ص ۱۲۹، حاشیہ ۱)۔ یہ کتاب بہت پُراز معلومات ہے۔ الشِّبلی کی اس ادبی کوشش کو شاعر ابن خَطِیب دَارَیَّا نے جاری رکھا (قب براکلمان، ۲:۱۷ و تکملہ، ۲:۷؛ حاجی خلیفہ، طبع Flügel، ۱:۴۹۰)۔ اس کے برعکس نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے بعض علما کے دینی رجحان کا اظہار اوائل پر ان کی ایسی تصانیف سے ہوتا ہے جو شاید ابن حجر کی تصنیف اِقامَۃ الدَّلائِل علی مَعْرِفَۃ الاَوائِل کے تتبع میں لکھی گئیں (یہ کتاب اب تک دستیاب نہیں ہوسکی (دیکھیے حاجی خلیفہ، محلِّ مذکور)؛ چنانچہ ابوبکرُ بن زَید الجِرَاعی (نام کی یہ شکل غیر یقینی ہے؛ [نابُلس میں ایک علاقے کا نام جراع ہے؛] م ۸۸۳ھ/ ۱۴۷۸ء؛ قب السخاوی: الضوء اللامع، ۱۱:۳۲ بعد) نے اپنی کتاب الاوائل (مخطوطۂ برلن، عدد ۹۳۶۸) کم و بیش علمِ حدیث کے ابواب کے مطابق ہی مرتّب کی ہے اور یہی السُّیُوطی نے بھی اپنی علم آموز تصنیف الوَسَائِل اِلی مَعْرِفَۃ الاَوَائِل میں کیا ہے، جو کسی حد تک اَلعَسْکَری کی تصنیف پر مبنی ہے۔ اس کے بعد السُّیُوطی کی تصنیف کو [قاضی] علی دِدِہ البوسَنَوی (۱۰۰۷ھ/ ۱۵۹۸ء؛ قب براکلمان، ۲:۵۶۲ بعد و تکملہ، ۲:۶۳۵) نے [محاضرۃ الاوائل میں استعمال کیا اور] زمانۂ مابعد کے دستور کے مطابق ''اواخر'' (= آخر میں ہونے والی باتوں) کو بھی شامل کر لیا (اس سلسلے میں دیکھیے السخاوی: اِعْلان، دمشق ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰-۱۹۳۱ء، ص ۱۳؛ F. Rosenthal: کتاب مذکور، ص ۲۱۴ بعد؛ السُّیُوطی سے ایک اور استفادہ کرنے والے کے لیے قب G. Vajda، در *RSO*، ۱۹۵۰ء، ص ۳)۔ اس زمانے کے ایک مؤرّخ ابن طُولُون (م ۹۵۳ھ/ ۱۵۴۶ء) نے عُنْوان الرَّسائِل فی مَعْرِفَۃ الاَوَائِل لکھی (مخطوطۂ قاہرہ، در کتاب خانۂ تیمور، [صنف:] تاریخ، عدد ۱۴۶۷؛ قب ابن طُولُون: اَلفُلْکُ المَشْحُوْن، دمشق ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹-۱۹۳۰ء)۔

اس موضوع پر ایک منظوم تصنیف وَسَائِل السَّائِل اِلی مَعْرِفَۃ الاَوَائِل بھی تھی (قب حاجی خلیفہ (طبع Flügel)، ۶:۴۳۵)۔ یہ کتاب غالباً مخطوطے کی شکل میں قاہرہ میں محفوظ ہے (مجامع، شمارہ ۴۷۴، اوراق ۲۸ ب تا ۳۶ ب)۔ قاہرہ کے مخطوطے میں اس کتاب کے مصنّف کا نام شمس الدین محمد بن محمد بن محمد بن (ابی) اللُّطف بتایا گیا ہے، جس سے مراد یا تو بظاہر باپ ہے یا بیٹا، جنھوں نے علی الترتیب ۹۷۱ھ/ ۱۵۶۴ء اور ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء میں وفات پائی (قب ابن العماد: شذارت؛ براکلمان، ۲:۳۶۷ و تکملہ، ۲:۳۹۴)۔ اس موضوع سے علمی دلچسپی زمانۂ حال تک جاری رہی (قب الطہرانی: الذریعہ اِلی تصانیف الشیعۃ، ۲:۴۸۱)۔ [اوائل کے سلسلے میں دوقاکین زادہ الرومی (م ۱۰۱۳ھ) کی ازھار الخمائل اور محمد بن ابی القاسم الراشدی کی اسی نام کی کتاب کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن الجوزی نے تَلْقِیح میں بہت سا مواد جمع کیا ہے۔ السیوطی کی کتاب پر تنقید کے لیے قب: تذکرۃ الاوائل فی اصلاح کتاب الوسائل۔]

بعض اوائل کا علم قرآن مجید اور احادیث سے بھی ہوتا ہے، مثلاً آدمؑ سب سے پہلے مامور ہیں؛ ہابیل سب سے پہلے مقتول ہیں؛ قابیل سب سے پہلا قاتل ہے؛ خانۂ کعبہ سب سے پہلی عبادت گاہ ہے؛ قرآن مجید میں نازل ہونے والی سب سے پہلی سورۃ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ہے۔ امیر المومنین کا لقب سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے لیے استعمال ہوا؛ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اسلام لائے، عورتوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور بچوں میں حضرت علیؓ۔ اس طرح کی اَور باتیں حدیث و تاریخ سے معلوم ہوتی ہیں۔

مآخذ: R. Gosche: *Die Kitāb al-awā'il. Eine literah-istorische studie*، Halle ۱۸۶۷ء، جس میں السُّیُوطی کی تصنیف کے ایک مختصر حصّے کی طبع بھی شامل ہے؛ (۲) السُّیُوطی: الوَسائِل اِلی مَعْرِفَۃ الاَوَائِل، قاہرہ ۱۹۵۰ء۔ تصانیف اوائل میں سے ایک بھی اب تک مکمل طور پر مرتب ہو کر شائع نہیں ہوئی؛ (۳) براکلمان (Brockelmann)، ۱:۱۳۲ و تکملہ، ۱:۱۹۳ بعد، و تکملہ، ۲:۱۲۶۵ و تکملہ، ۱:۲۷۹ بعد و تکملہ، ۱:۵۹۷ بعد و تکملہ ۲:۹۰ بعد و تکملہ ۲:۸۲ و تکملہ، ۲:۲۰۳ و تکملہ، ۲:۱۹۷ و تکملہ ۲:۵۶۲ و تکملہ ۲:۶۳۵ [تعریب عبدالحلیم النجار، ۲:۲۵۳، نیز بمد اشاریہ]؛ (۴) A. J. Wensinck اور دوسرے مصنّفین: *Concordance*، ۱:۱۳۴ بعد؛ (۵) Ahlwardt: ''فہرست برلن'' عدد ۹۳۶۸-۹۳۷۶ (لیکن بہت سی تصانیف جو عدد ۹۳۷۶ کے تحت مذکور ہیں اصل میں اوائل کے موضوع پر نہیں ہیں)؛ (۶) *MMIA*، ۱۹۴۱ء، ص ۳۵۷-۳۵۹، اوائل سے متعلق اس فصل کے بارے میں جو عبدالرحمٰن البِسطامی (Brockelmann، ۲:۳۰۰ بعد و تکملہ ۲:۳۲۳ بعد) : اَلفَوائِحُ المِسْکِیَّۃ میں درج ہے؛ (۷) القَلْقَشَنْدِی: صبح الاعشٰی، ۱:۴۱۲-۴۳۶، میں کاتبِ حکومت کے فرائض تاریخ نگاری کے سلسلے میں اوائل کا ذکر موجود ہے؛ (۸) اسلامی عہد کا ایک مختصر سا سریانی متن، در زخاؤ (E. Sachau): *Verzeichniss d. syr. Hss.*، شمارہ ۳۳۱، برلن ۱۸۹۹ء؛ (۹) نجم الدّین: اوائل، در اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۳۳ء]۔

(F. ROSENTHAL [و ادارہ])

اَوَاذِلَہ: (یا عَوَاذِلَہ)، رک بہ عَوْذِلہ۔ *

اَوَار: آذری ترکی: ''آوارہ لی'' (= نااستوار، آوارہ گرد) سے؛ آبیری۔ * قفقازی قوم، جو آزاد سوویٹ اشتراکی جمہوریۂ داغستان کے پہاڑی حصّے (آندی کے دریا قُوی صُو، قُوی صُو اَوار، قَزَہ قُوی صُو اور تلی سِرُخ (Tleyserukh) کے طاسوں) اور سوویٹ اشتراکی جمہوریۂ آذربیجان کے شمالی علاقے میں آباد ہے۔ اَوَار شافعی مذہب کے سنّی مسلمان ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی تعداد کا اندازہ دو لاکھ چالیس ہزار لگایا گیا تھا، جن میں سے تخمیناً چالیس ہزار آذربیجان کے ضلع بِلْوقانی (Belokani) اور زَکاتلی (Zakatali) میں آباد تھے۔

اَوَار دو بڑے گروہوں میں منقسم ہیں، جو کسی زمانے میں قبائلی وفاق (= بُو) تھے اور اب چھوٹے چھوٹے قبیلوں (کِعِبلِع) میں بٹے ہوے ہیں: (۱) مارُولل

(Maarulal) (اَوَاری لفظ ’’مار‘‘ (maar)، بمعنی پہاڑ سے؛ روسی زبان میں تاولنستی (tawlinsti)، قومیقی لفظ تاو (taw)، بمعنی پہاڑ سے) سطح مرتفع خُونزاق کے شمال میں آباد ہے اور (۲) باگاؤلل (Bagaulal) (اَوَاری میں بمعنی اجڈ لوگ)، جو جنوبی قبائل پر مشتمل ہے۔ اَوَاروں کا دعوٰی ہے کہ انھیں عربوں نے مشرف باسلام کیا تھا۔ ایک اسطوری روایت یہ ہے کہ خُونزاق میں امیر ابُومُسلِم نے اسلام پھیلایا تھا اور ان کی قبر اور تلوار اب تک وہاں دکھائی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں امیر ابُومُسلِم اور شیخ ابُومَسلَمَہ کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ ابُومُسلِم کبھی داغِستان نہیں گئے اور ابُومَسلَمَہ کے متعلّق مشہور ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں یہاں مقیم تھے۔ واقعہ یہ کہ جب عرب داغِستان میں پہنچے تو مسیحیت بلکہ یہودیت بھی اَوَاروں کے ملک میں جڑ پکڑ چکی تھی اور اسلام وہاں آہستہ آہستہ پھیلا، اس لیے کہ گرجستانی طریق کی مسیحیت دسویں/سولھویں صدی تک کاخِیب (Kakhib) میں موجود تھی۔ بہرحال چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی میں نُتسال (Nutsal) کی اَوَار ریاست کا پایۂ تخت تنُوش ’’اَوَل‘‘ (Tanush aul)، جو ابتداءً قاضی قوموق (قبّ لاق Lak) کا باج گزار تھا، اسلام کا ایک گڑھ اور بالائی داغِستان میں عرب ثقافت کا ایک بڑا مرکز بن چکا تھا۔ اس ملک کو مسلمان بنانے کا کام ترکانِ عثمانی کے تسلّط (۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء-۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء) میں مکمل ہوا، یعنی جب اَوَار کی خانی ریاست (Khánate) قائم ہوئی، جس کے حکمرانوں کا دعوٰی تھا کہ وہ خُونزاق کے عرب والیوں کی نسل سے ہیں۔

گیارھویں-بارھویں صدی ہجری/سترھویں-اٹھارھویں صدی عیسوی میں اَوَاروں کی خانی ریاست ثقافتی اور سیاسی اعتبار سے بالائی داغستان پر مسلّط رہی۔ اس سلسلے میں اُمّو خاں اَوَار (م ۱۶۳۴ء)، جس نے اَوَاروں کے ’’عادۃ‘‘ [=رواجی قانون] کو مدوّن کیا، اور اس کے جانشین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو گرجستان کے بادشاہ اور شِرْوان، شَکّی اور دَرْبَند کے خوانین سے خراج وصول کرتے تھے۔ بہرکیف خُونزاق کے سردار اَوَارِستان کو کبھی کاملاً متّحد نہ کر سکے، چنانچہ یہ علاقہ اب تک بے شمار قبیلوں اور خاندانوں میں منقسم رہا ہے، جن میں سے بعض تو آزاد و فاقوں (بُوbo) میں مجتمع ہیں اور بعض خانی ریاست کے باج گزار۔

۱۷۲۷ء میں اواروں کی خانی ریاست نے پہلی دفعہ روسیوں کی حفاظت میں رہنا قبول کیا، لیکن جلد ہی [اپنے فیصلے کو] رد بھی کر دیا؛ تاہم یہ حفاظت دوبارہ ۱۸۰۲ء میں عُمَر خاں پر اور پھر ۱۸۰۳ء میں اس کے فرزند اور جانشین سلطان احمد خاں پر عائد کر دی گئی۔

۱۸۲۱ء میں سلطان احمد خاں کی بغاوت کے بعد روسی فوجوں نے اوارستان پر قبضہ کر لیا، لیکن انھوں نے براہِ راست عنانِ اقتدار ہاتھ میں نہ لی، بلکہ اس حکمران کے لیے فوجی مشیر مہیا کرنے پر قناعت کر لی۔ اس وقت سے خُونزاق کی سطح مرتفع روسیوں کے لیے بالائی داغستان کو فتح کرنے کا ’’تختۂ جست‘‘ بن گئی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اواروں کا ملک نقشبندی طریقے کے پیرووں کی سرگرمیوں کا میدان بن گیا، جنھوں نے ۱۸۳۰ء میں ’’کفار‘‘ [روسیوں] اور ان کے حلیف خوانین، دونوں کے خلاف ایک عوامی تحریک کو ہوا دی۔ ۱۸۳۴ء میں اِمام حَمزَہ بیگ [رکّ بآن] نے خانی ریاست کا خاتمہ کر دیا اور تھوڑی ہی مدّت کے بعد روسی بھی اَوَارِستان سے نکال دیے گئے۔ آخر جب ۲۵ اگست ۱۸۵۹ء کو امام شامِل [رکّ بآن] نے [روسیوں کے آگے] ہتھیار ڈال دیے تو امامت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور روسیوں نے اَواروں کی خانی ریاست دوبارہ قائم کر دی اور مخُتُولِن کے ابراہیم خاں کو مسندِ حکومت پر بٹھا دیا، لیکن ۲۲ فروری ۱۸۶۳ء کو ابراہیم خاں کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا اور ۱۲ اپریل ۱۸۶۴ء کو خانی ریاست ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی اور اس کا علاقہ اَوار اُوکرُگ (Okrug) سے ملحق کر دیا گیا، جس کا انتظام براہِ راست روسی حکام کے سپرد تھا۔

اکتوبر [۱۹۱۷ء] کے [روسی] انقلاب کے بعد اواروں کا ملک آزاد سوویٹ جمہوریۂ داغستان کا ایک حصّہ قرار پایا، جو روسی سوویٹ جمہوریۂ وفاقیۂ اشتراکیہ سے ملحق ہے (سپریم سوویٹ کا فرمان، مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء)۔

اَواروں کی زبان کا تعلّق آبیری-قفقازی زبانوں کے شمالی گروہ کی شمالی و مشرقی شاخ (داغستانی) سے ہے، اس کا دائرہ چِری نوٹ (Ćirinot) کے اَوَل سے لے کر آذربیجان کے نووو-زکاتلی (Novo-Zakatli) تک پھیلا ہوا ہے، جو مزید ۱۷۰ کیلومیٹر جنوب میں ہے۔ یہ زبان متعدد مقامی بولیوں میں منقسم ہے۔ (تقریباً ہر قبیلے کی ایک الگ بولی ہے)، جنھیں دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: شمالی (یا خُونزاقی) بولیاں اور جنوبی بولیاں (اَنتُسُوخ (Antsukh)، چوخ (Ćokh)، گِیدَاتلی (Gidatli)، اور زکاتلی (Zakatali)۔ ادبی زبان بُولمَتز (Bolmats) (=فوجی زبان) سے بنی، جو سولھویں صدی کے بعد سے بین القبائلی روابط کا ذریعہ رہی ہے۔ سترھویں صدی کے وسط میں اَواری زبان عربی حروف تہجّی میں لکھی جانے لگی (جن میں آبیری-قفقازی اصوات کو ادا کرنے کے لیے متعدد علامات شامل کر کے مکمل کیا گیا)۔ یہ رسم خط ’’عجم قدیم‘‘ کے نام سے موسوم ہے اور اسے بالآخر دبیر نے، جو خُونزاق کا قاضی تھا (۱۷۴۷-۱۸۲۷ء)، حدِ کمال تک پہنچا دیا۔ کُدَاتلی (Kudatli) کا محمد بن موسٰی (م ۱۷۰۸ء)، جو عربی میں لکھتا تھا اور خُونزاق کا قاضی دَبِیر، جس نے کَلِیلَۃ و دِمنَۃ کا اواری میں ترجمہ کیا، وہ ادیب ہیں جن کی بدولت اسی زمانے میں اَواری ادب کی ابتدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اس ادب میں بے شمار مذہبی و اخلاقی کتابوں کا اضافہ ہوا اور امام شامِل کے زمانے میں ہجو و تغزل کی تصانیف کا، جن کا ممتاز نمائندہ بِتُل-کاخاب روسو (Betl. Kakhabrosso) کا شاعر مَحمُود (۱۸۷۳-۱۹۱۹ء) تھا۔ یہ ادب پہلے عربی زبان میں سامنے آیا اور اس کے بعد اَواری زبان میں۔ ۱۹۲۰ء میں پرانے حروفِ تہجّی کے بجائے اڑتیس حروف پر مشتمل ایک سادہ عربی الفبا (موسومہ ’’عجم نو‘‘) رائج کی گئی۔ ۱۹۲۸ء میں اس کی جگہ ایک جدید لاطینی الفبا نے

لے لی اور ۱۹۳۸ء میں سائرِلِک (Cyrillic)، یعنی روسی حروف، رائج کر دیے گئے [یہ حروف سینٹ سائریل (St. Cyril) سے منسوب ہیں اور مشرقی کلیسا کے سلاو لوگوں میں مستعمل ہیں، بمقابلۂ گلیگولیتک Glagolitic].

موجودہ زمانے (۱۹۵۷ء) میں اَوار اپنی تعداد کے اعتبار سے داغستان کی سب سے بڑی قوم ہیں (دس لاکھ کی کل آبادی میں دو لاکھ) اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ بھی ہیں۔ ان کا اپنا ادب موجود ہے، جس کا مشہور ترین نمائندہ حَمزَت تْسادَسہ (Hamzat Ṭsadsa) (۱۸۷۳-۱۹۵۱ء) تھا، جسے ۱۹۵۰ء میں ''لینن پرائز'' ملا۔ اواری زبان کے اخبارات بھی ہیں اور پورے علاقے میں سکولوں کا جال بچھا ہوا ہے، جن میں پانچویں جماعت تک قومی زبان میں اور بڑی جماعتوں میں روسی میں تعلیم دی جاتی ہے۔

اواروں کی ادبی زبان کو اَرْچی [رک بآن] قبیلے کے علاوہ تیرہ ایسی چھوٹی چھوٹی اندی [رک بآن] اور دِیدو [رک بآن] اقوام بھی استعمال کر رہی ہیں جن کی اپنی کوئی تحریری زبان نہیں اور جو بڑی تیزی سے اَوار قوم میں جذب ہوتی جا رہی ہیں۔ اس زبان کو بالائی داغستان کی بعض دوسری قومیں بھی، جو اَواروں کی ثقافت سے متأثّر ہیں، ثانوی زبان کے طور پر استعمال کر رہی ہیں (دارغین، لاق [رک بآن])۔ بہرکیف داغستان کی سرکاری زبان بدستور رُوسی ہے۔ آذربیجان کے اوار اپنی مادری زبان کا استعمال ترک کرتے جا رہے ہیں اور اس کی جگہ آذری ترکی رائج ہو رہی ہے۔

اوارستان کے علاقے میں، جو وسطی داغستان کے پہاڑی اور دشوار گزار خطّے پر مشتمل ہے، اوار لوگ اب بھی دراصل خانہ بدوش ہیں، جن کا بڑا شغل بھیڑیں پالنا ہے اور اس کے علاوہ وہ وادیوں میں چھوٹے پیمانے پر باغبانی بھی کرتے ہیں (طبقہ بہ طبقہ میووں کے باغ)۔ پرانی صنعتیں بہت ترقی کر گئی ہیں: اونی کپڑے، قالین، تانبے کا کام (یوٹ سَتْل (Yotsatl) اور چچکی (Čičali) کے اَولوں (auls) میں) چمڑے پر کام، زرگری، لکڑی پر فنّی کندہ کاری (اُونْتْسُوکُول (Untsukul) اور بَتْسادَہ (Batsada) کے اَولوں میں) اور گھٹے ہوئے لوہے کا کام (سوگْرَاتْل (sograt)، گولوتْل (Golotl) اور کاخیہ (kakhih) کے اَولوں میں)۔ ملک کی صنعتی نشوونما کے اقدامات، جو ۱۹۳۶ء کے قریب شروع کیے گئے تھے، ابھی ابتدائی مرحلوں میں ہیں۔

مآخذ: (۱) Kozubskiy: *Pamyatnaya Knižka Dāghes-tānskoy oblasti*، تِمر خان شُورا ۱۸۹۵ء؛ (۲) وہی مصنّف: *Sbornik Materyalov dlya opisaniya mestnostey i plemen Kavkaza*، تفلس ۱۹۰۹ء، ج ۴۰؛ (۳) P. K. Uslar: *Avarskiy yazik*، در Ethnografiya Kavkaza، ج ۵، تفلس ۱۸۹۲ء؛ (۴) Z. A. Nikol'skaya: *Avarstı̊ Narodı̊ Dāghestāna*، ماسکو ۱۹۵۵ء؛ (۵) وہی مصنّف: *Istoričeskie predposı̊lki natsional'noy Konsolidatsii avartsev*، در *Sovetskaya Ethnografiya*، شمارہ ۱، ماسکو ۱۹۵۳ء؛ (۶) A. G. Peredel'skiy: *Avarskiy Okrug*، در *Kavkaz*، شمارہ ۶ و ۷، ۱۹۰۴ء؛ (۷) Kh. M. Khashaev: *Kodeks Ummu Khāna*، ماسکو ۱۹۴۸ء؛ (۸) Nazarevič: *Avarskaya literatura avarskogo Makhač-Kala*، ۱۹۴۷ء؛ (۹) Bokarev: *Gamzat Tsadasa i*، ماسکو ۱۹۴۹ء؛ (۱۰) Serdüčenko و Meshčaninov: *Kratkie Svedeniya o yazikak h Dāghestāna Yaziki Severnogo*، ماسکو ۱۹۴۹ء؛ (۱۱) A. و H. Bennigsen: *Kavkaza i Dāghestāna Une république soviétique musulmane*، Carrère d' Encausse: *le Dāghestān, Aperçu démographique* در *REI* ۱۹۵۵ء.

(A. BENNIGSEN و H. CARRÉRED' ENCAUSSE)

اَوْتاد: (ع، واحد: وَتِد)، لغوی معنی: میخیں؛ [وَتِدُہٗ کے معنی ہیں کسی چیز میں میخ لگا کر میں نے اسے مضبوط کیا۔ قرآن مجید میں پہاڑوں کو اوتاد کہا گیا ہے (۷۸ [النّبأ]: ۷)؛ نیز فرعون کو ذوالاوتاد لکھا ہے۔ مفسرین نے اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں، دیکھیے روح المعانی، البیضاوی، کشاف، ابن جریر]. ⊗ *

صوفیہ کے ہاں رجال الغیب کے نظمِ مراتب میں تیسرے طبقے کے لوگ۔ یہ نظام چار مقدّس افراد پر مشتمل ہوتا ہے، جنھیں العمود (= ستون) بھی کہا جاتا ہے [رک بہ ابدال]۔ اوتاد میں سے ہر ایک کے ذمّے (دنیا کے) چار بنیادی نقطوں میں سے ایک کی نگرانی ہوتی ہے اور اس کی اپنی جاے سکونت اسی نقطے کے مرکز میں ہوتی ہے [نیز رک بہ اولیا؛ نیز تھانوی: کشاف، بذیل مادّۂ وَتِد۔ علمِ عروض میں اس اصطلاح کے لیے رک بہ عروض].

(I. GOLDZIHER [و ادارہ])

اَوْج: رک بہ علم احکام النجوم. *

اَوْجِلَہ: اس سے مراد ایک سیراب و زرخیز خطّہ بھی ہے اور وہ تین نخلستان بھی جو بَرْقَہ (Cyrenaïca) کے جنوب میں انتیسویں اور تیسویں خطِّ متوازی کے درمیان اس مشہور کاروانی راستے پر واقع ہیں جو سِیْوَہ (مصر) اور جَرْبُوب کو مَرْدَہ اور جُفْرَہ کے ذریعے طَرابُلُس (Tripolitania) اور فِزّان سے ملاتا ہے۔ ہیرودوٹس (Herodotus) (4: ۱۷۲، ۱۸۲) اور کلاسیکی مصنّفین کے زمانے ہی سے اوجلہ اپنی کھجوروں کی افراط کے لیے اور پڑاؤ کے ایک مقام کے طور پر مشہور رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک منزل کی حیثیت سے اس کی شہرت میں عربوں کی فتح المغرب کے زمانے سے مزید اضافہ ہو گیا۔ ابن حَوقل (ترجمہ دیسلان (de Slane)، سلسلہ ۳، ۱۳: ۱۶۳) چوتھی/دسویں صدی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو حال ہی میں بَرْقَہ کے صوبے میں شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح کوئی دو سو برس بعد الاِدریسی (ترجمہ Jaubert، ۱: ۲۴۸) اور پانچویں صدی *

ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں البکری مترجمۂ دیسلان، بعنوان *Description de l' Afrique Septentrionale*، ص ۳۲) اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ایک اہم مرکز ہے جس میں کئی مسجدیں اور بازار ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اَوجِلہ ضلع کا نام ہے اور شہر کا نام اَزْرَقِیَہ ہے۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں یہاں غلّہ مصر سے درآمد ہوتا تھا (Leo Africanus: *Description de l' Afrique*، مترجمہ Épaulard، ص ۴۵۶)۔ ۱۶۴۰ء میں اَوجِلہ پر ترکوں نے قبضہ کرلیا۔ متعدد سیّاحوں نے اس کی سیر کی ہے اور یہاں کی کیفیت لکھی ہے (مثلاً ہورنمان (Hornemann) (۱۷۹۸ء)، ہملٹن (Hamilton) (۱۸۵۲ء)، بورمان (Beaurmann) (۱۸۶۲ء) اور رولفز (Rohlfs) (۱۸۶۹ و ۱۸۷۹ء)؛ قب مآخذ)۔ انیسویں صدی کے وسط سے، انتہا پسند سلسلۂ سَنُّوسِیَہ کا اقتدار بڑھا تو روزیٹا فوربس (Rosito Forbes) اور حسنین بے کے سوا، جو ۱۹۲۰ء میں وہاں گئے، بہت کم یورپی لوگوں نے وہاں کا رخ کیا۔ لوگوں نے یہاں کے حالات کا مطالعہ صرف اطالوی قبضے کے زمانے (۱۹۲۸-۱۹۴۳ء) میں کیا، بالخصوص جغرافیہ دان سکارِن (Scarin) نے۔ اس کے بعد سے یہ سلطنتِ لیبیا کا ایک حصّہ بن گیا ہے۔

[دراصل] اَوْجِلَہ کے نام کا اطلاق انتہائی مغربی نخلستان پر ہوتا ہے، بحالیکہ جالُو سے (جس کا اطلاق الاِزگ اور اللّبّہ پر ہوتا ہے؛ فاصلہ: تیس کیلومیٹر بجانب جنوب جنوب مشرق) اب وہ تمام رقبہ مراد لیا جاتا ہے جس میں جِکّرہ (یا لِشکِرّہ) کا معمولی سا نخلستان بھی شامل ہے، جو شمال کی جانب تیس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ تین نخلستان ایک ویران ریتلے اور کنکریلے (ہمرِیُر) صحرا کے وسط میں ذرا نشیبی علاقوں میں واقع ہیں، جہاں بہت کم چراگاہیں ہیں۔ ان کی آب و ہوا گرم اور بہت خشک ہے اور یہاں ہوائیں بہت کم چلتی ہیں۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان سالانہ بارش کی کل مقدار ۱۱ء۷ ملی میٹر تھی۔

پانی سطح سے کچھ زیادہ نیچے نہیں اور خاصا فراواں ہے۔ یہ چرس کے کنووں کے ذریعے (جنھیں گدھے چلاتے ہیں) اور ڈھیکلی کے کنووں سے نکالا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ تر کھجور کے درختوں، انار اور انجیر کے تھوڑے، بہت پیڑوں اور غلّے، لوسرن (lucerne) قسم کے چارے اور سبزیوں کے چھوٹے موٹے کھیتوں کی آب پاشی ہوتی ہے۔ مویشیوں کی نسل کشی بہت خراب حالت میں ہے اور تجارت کا حال اچھا نہیں، یہاں تک کہ جالُو میں بھی، جس نے کوئی ایک صدی سے سوڈان اور مصر کے درمیان ہونے والی تجارت میں اَوجِلہ کی جگہ لے رکھی ہے۔ اطالویوں نے اس اقتصادی انحطاط اور آبادی کے زوال کی، جس کا باعث نقل مکانی ہے، روک تھام کی۔ انھوں نے الاِزگ (جالو) کو اپنی جائے قیام بنایا اور کوئی دوسو ستر کیلومیٹر لمبی سڑک بنا کر ان نخلستانوں کو اَجدابیَہ سے ملا دیا (جہاں سے تقریباً ایک سو نوے کیلومیٹر لمبی ایک اَور سڑک بن غازی کو جاتی ہے)۔

خود اَوجِلہ میں، جہاں آج کل خرابی و خستہ حالی کا دور دورہ ہے، ۱۹۳۴ء میں کھجور کے اٹھارہ ہزار درخت اور ایک سو ستّر باغ تھے اور وہاں پندرہ سو باشندے آباد تھے، جو اب تک بربر زبان بولتے ہیں۔ یہ لوگ چار گروہوں میں منقسم ہیں اور ایک دوسرے سے ملحق چار مختلف بستیوں یا محلّوں میں آباد ہیں: اِلسُّوبکہ (Es-sobka)؛ اِلسَّرَحْنَہ (Es-sarahna)؛ اِلْہَتی (El-Hati) اور اِلزِّگگْنَہ (Ez-Zegagna)۔ ان کے علاوہ ایک چھوٹا سا گروہ اَور بھی ہے، جو مُجبَرہ کہلاتا ہے، عربی بولتا ہے اور نخلستان میں منتشر صورت میں آباد ہے۔ جالو میں، جو اس حد تک زوال پذیر نہیں ہوا، پچاس ہزار کھجور کے درخت اور ایک سو تینتیس باغ ہیں اور وہاں کی آبادی دو ہزار سات سو ہے، جو ایک سو چوالیس خاندانوں میں منقسم ہے۔ یہ لوگ دو موضعوں، یعنی الاِزگ (جس کی آبادی کسی قدر منتشر ہے) اور اللّبّہ (جو زیادہ گنجان آباد ہے) اور کئی دوسری بستیوں میں آباد ہیں، جو پورے نخلستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ مُجبَرہ کہلاتے ہیں، جن میں سے بہت سے پہلے خانہ بدوش تھے اور بعد ازاں عربی تمدّن میں رنگ گئے۔ انھیں تجارت کا شوق ہے۔ جِکّرہ محض ایک نخلستان ہے (تیرہ ہزار درخت)۔ اس کی آب پاشی بھی کسی باقاعدہ طریقے سے نہیں ہوتی۔ اس میں چند نہایت غریب گھرانے رہتے ہیں (کل تعداد چار سو)۔ کھجوروں کے موسم میں شمال مغرب میں واقع وادی فارِغ (Ouadi Fareg) کے زوئیَہ خانہ بدوش یہاں آتے ہیں۔ ان بستیوں کے مکان بڑی بڑی کچی اینٹوں کے اور کہیں کہیں بن جڑے پتھروں کے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں اوپر کی منزلیں نہیں ہیں اور یہ پیچ در پیچ اندھی گلیوں میں قطار در قطار چلے جاتے ہیں۔ وہ مکان جو ان سے الگ باغوں میں واقع ہیں اور جن میں عام طور سے سابق غلام رہتے ہیں کھجور کی جھونپڑیوں (زریبہ) کی شکل میں ہیں۔ مسجدوں کی تعداد، جو بالکل دیہاتی نمونے کی ہیں، سلسلۂ سَنُّوسِیَہ کی تعلیمات کے زیرِ اثر بہت بڑھ گئی ہے۔ اَوجِلہ کی مسجدوں میں کئی گنبد ہوتے ہیں۔ جِکّرہ کی مسجد مینار سمیت کھجور کے درختوں سے بنائی گئی ہے۔

مآخذ: (۱) F. Hornemann: *The Journal of Frederick Hornemann's travels from cairo to Mourzouk...*، لنڈن ۱۸۰۲ء؛ (۲) Pacho: *Relation d'un voyage dans la Marmarique et la Cyrenaique et les oasis d'Audjilah to Maradeh*، پیرس ۱۹۲۷ء؛ (۳) ہملٹن (J. Hamilton): *Wanderings in North Africa*، لنڈن ۱۸۵۶ء؛ (۴) Beurmann: *Moritz von Beurmann's Reise von Bengasi nach Udschila und von Udschila nach Marzuk*، Petermann's Mitt.، Ergänzung-band، ۲، گوتھا ۱۹۶۳ء؛ (۵) G. Rholfs: *Von Tripolis nach Alexandrien*، Bremen ۱۸۷۱ء؛ (۶) *Reise von Tripolis nach der oase kufra*، لائپزگ ۱۸۸۱ء؛ (۷) حسنین بے (Hassenein-bey): *The lost oasis*، لنڈن ۱۹۲۵ء؛ (۸) E.de Agostini: *'Notizie sulla zona de Augila-Gialo*، بن غازی ۱۹۲۷ء؛ (۹) E. Scarin: *La oasi cirenaiche del 29° parallelo*، فلورنس ۱۹۷۳ء۔

ابھی تک اس بربری زبان کا پوری طرح مطالعہ نہیں کیا گیا جو اوجلہ میں بولی جاتی ہے۔ اس بولی کے متعلق جزوی

مطالعات کے لیے دیکھیے: (۱۰) A. Basset: *La langue Berbère*، در *Handbook of African Languages*، اوکسفرڈ ۱۹۵۲ء، ص ۶۹-۷۰.

(J. DESPOIS)

---

* **الاَوْحَد:** (المَلِک الاَوْحَد، نَجْم الدِّین اَیُّوب) رک بہ ایوبیہ.

---

* **اَوْحَدِی:** [مراغی] رُکن الدّین، فارسی شاعر، ۶۸۰ھ/۱۲۸۱-۱۲۸۲ء کے قریب [بعہدِ ارغون ایلخان] مَراغہ میں پیدا ہوا، جو آذربیجان کا ایک شہر ہے۔ [وہ اصفہانی بھی کہلاتا ہے کیونکہ وہ] کئی سال تک اصفہان میں رہا، [اسی بنا پر] صاحبِ ہفت اقلیم کو دھوکا ہوا کہ اوحدی اصفہان کا رہنے والا تھا۔ اس کی زندگی کے متعلّق ہمارے پاس کچھ زیادہ معلومات نہیں لیکن اس میں شُبہہ نہیں کہ اس نے [بعہدِ غازان خان] ۷۳۸ھ/۱۳۳۷-۱۳۳۸ء میں وفات پائی اور اپنے مولد [مراغہ] ہی میں دفن ہوا، جہاں اس کا سنگِ مزار اب بھی موجود ہے.

رکن الدین نے اوحدی تخلّص اپنے مرشد شیخ اوحدالدّین کرمانی کی نسبت سے اختیار کیا۔ وہ ایک دیوان کا مصنّف ہے، جو چھے سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ [رضا قلی خاں: مجمع الفصحاء، طبع براؤن، ص ۹۷، ۹۸؛ دولت شاہ نے اشعار کی تعداد دس ہزار بتائی ہے۔ تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن، ص ۲۱۰]۔ اس میں بعض ایسے قصائد بھی ہیں جو اس نے اپنے مربّیوں — ابوسعید ایلخان اور اس کے وزیر غیاث الدّین محمد بن رشید الدّین فضل اللہ — کی مدح میں لکھے۔ ایک نظم میں اس نے اپنے ہم عصر سَلْمان ساوجی کی تعلیمات پر طنز کی ہے.

شاعر کی حیثیت سے اوحدی میں جدّت وندرت بہت کم ہے۔ فارسی کے اکثر نقّاد اوحدی کی بعض شاعرانہ خامیوں اور کم زوریوں کی بنا پر اسے دوسرے درجے کا شاعر شمار کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اس کے کلام کے بیشتر حصّے میں، جو اگرچہ شاعرانہ حسن سے یکسر معرّا نہیں، تکلّف اور آورد موجود ہے اور وہ اپنے خیالات اس نازک خیالی کے ساتھ پیش کرنے سے قاصر ہے جو بہترین فارسی شاعری کا طرّۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے [لیکن شبلی نعمانی کی راے میں اوحدی نے ''غزل کو جذبات سے لبریز کر دیا'' اور ''زبان میں نزاکت، صفائی، روانی اور سلاست بھی پیدا کی''].

اوحدی کا بہترین کلام اس کی دو مثنویاں دہ نامہ اور جام جم ہیں۔ دہ نامہ کو بعض مخطوطات میں مَنْطِق العُشّاق بھی لکھا گیا ہے۔ اس میں دس منظوم خط ہیں، جو ایک خیالی عاشق کی طرف سے اس کی محبوبہ کو لکھے گئے ہیں۔ شاعرانہ اعتبار سے یہ مثنوی کسی ممتاز مرتبے کی حامل نہیں۔ اوحدی نے اسے ۷۰۶ھ/۱۳۰۶-۱۳۰۷ء میں نصیرالدین طوسی کے پوتے وجیہ الدین کے نام مُعَنْوَن کیا۔ مثنوی جام جم قدرے طویل اور نسبۃً زیادہ معروف ہے۔ یہ مثنوی پختگیِ ذوق کی مظہر ہے اور جب یہ لکھی گئی اور لوگوں کے ہاتھ آئی تو اسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی [چنانچہ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چار سو نقلیں تیار ہوئیں اور اچھی قیمت پر فروخت ہو گئیں]۔ سنائی کی حَدِیقَۃ الحَقِیْقَۃ کی طرح یہ بھی علمِ اخلاق کے بہت سے مسائل سے بحث کرتی ہے۔ اس میں اخلاقی نظم وضبط، تربیتِ اطفال، شہری ذمّے داریوں کے بارے میں پند ونصیحت اور حکم رانوں کو عدل وانصاف کی تلقین کی گئی ہے، لیکن مثنوی کے آخری حِصّے میں موضوع بدل گیا ہے اور طریقِ تصوّف اور اس سے متعلّقہ مضامین پر بحث آ گئی ہے۔ جام جم ۷۳۳ھ/۱۲۳۲-۱۲۳۳ء میں لکھی گئی اور غیاث الدّین محمد کے نام معنون ہوئی.

مآخذ: (۱) دولت شاہ [: تذکرۃ الشعراء]، ص ۲۱۰؛ (۲) براؤن [Browne: *A Literary History of Persia*]، ۳: ۱۴۱-۱۴۶؛ (۳) رضا قلی خاں: مجمع الفصحاء؛ (۴) Ethé، در *GIP*، ۲: ۲۹۹؛ (۵) جام جم، تہران ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸، ۱۹۲۹ء؛ (۶) دیوان، طبع A. S. Usha، مدراس ۱۹۵۱ء؛ [(۷) شبلی نعمانی: شعر العجم، طبع سوم، لکھنؤ ۱۹۲۲ء، ۵: ۲۹؛ (۸) محمود شیرانی: تنقید شعر العجم، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۴۲ء، ص ۳۴۹].

(G. MEREDITH و OWENS)

---

* **اَوْدَغْوُسْت:** (یا اَوْدَغْوشْت)، افریقہ کا ایک شہر جو اب نابود ہو چکا ہے۔ بقول البَکْری یہ شہر سیاہ فام لوگوں کے ملک اور سِجِلْماسَہ کے درمیان اس نخلستان سے کوئی اکاون روز اور غَانَہ سے پندرہ روز کی مسافت پر واقع تھا۔ بارتھ (Barth) کا خیال ہے کہ اس کا محلِّ وقوع یقیناً ۱۰ درجہ ۱۱ دقیقہ طول بلد مغربی اور ۱۸ درجہ ۱۹ دقیقہ عرض بلد شمالی میں رہا ہوگا اور قُصَار اور بَرْکَہ سے کچھ زیادہ دور نہیں ہوگا، یعنی مَوْرِیْتانیا (Mauritania) کی فوجی چوکی تِجِکْجَہ کے جنوب مغرب میں.

اس شہر کے متعلّق کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ ایک تجارتی نوآبادی ہوگی، جسے زِناگہ (صَنْہاجَہ) قبیلے نے سلطنتِ غانہ کی شمالی سرحد پر قائم کیا۔ چوتھی/دسویں صدی کے آخر میں جب زِناگہ نے غانہ کی سلطنت کا بہت سا حصّہ فتح کر لیا تو اَوْدَغوسْت ایک زبردست ریاست کا پاے تخت بن گیا۔ ۳۵۰ھ/۹۶۱ء سے ۳۶۰ھ/۹۷۱ء تک اس کا بادشاہ ایک صَنْہاجی تھا اور تقریباً تیس سیاہ فام بادشاہ اس کے باج گزار تھے۔ اس کی سلطنت کی مسافت طولاً وعرضاً ساٹھ دن میں طے ہوتی تھی۔ آئندہ صدی میں ابن یاسین نے، جو خاندانِ المرابطون کا بانی تھا، اودغوست پر حملہ کر کے اسے فتح کیا تو قتل وغارت کا بازار گرم ہوا اور باشندوں کو تہ تیغ کر دیا گیا (۴۴۶ھ/۱۰۵۴-۱۰۵۵ء)۔ اس دن سے زناگہ کے اقتدار کو بتدریج زوال آنا شروع ہوا۔ ساتویں/تیرھویں صدی کے شروع میں ان کی سلطنت پر سُوسُو نے حملہ کیا؛ چنانچہ انھیں اپنا ملک چھوڑنا پڑا یا ان کی حیثیت محض باج گزاروں کی سی رہ گئی.

البَکْری کے زمانے (پانچویں/گیارھویں صدی) تک بھی اَوْدَغْوسْت ایک بارونق شہر تھا۔ یہاں اچھی خاصی آبادی تھی، جو المغرب اور افریقیہ کے عربوں، بربروں (بِرْکَجِنَّہ، لَوَاتَہ، زَنَاتَہ، نَفُوسَہ، بالخصوص نَفْزاوَہ) اور بلاشبہہ سیاہ فام لوگوں پر بھی

مشتمل تھی۔ شہر کے گرد اور مضافات میں باغوں اور نخلستانوں کی کثرت تھی۔ اس میں مسجدیں اور مدرسے تھے، شان دار سرکاری عمارتیں تھیں، خوش نُما مکان تھے اور بارونق منڈیاں تھیں۔ غلے اور پھل کی تجارت کا مال، جو مسلم ممالک سے آتا تھا، یہاں خوب بکتا تھا۔ عنبر بحر اوقیانوس کے ساحل سے آتا تھا۔ تانبے کی مصنوعات اور زری کے تاروں کی تجارت ہوتی تھی اور ریگِ زر (gold-dust) بطورِ سکّہ استعمال ہوتی تھی۔ الادریسی کے زمانے (چھٹی/بارھویں صدی) میں زوال کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ آبادی نہایت قلیل تھی، تجارت کم ہوگئی تھی اور لوگوں کی بسر اوقات کم وبیش اونٹ پالنے پر منحصر رہ گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطنتِ زناتہ کی بربادی کے ساتھ ساتھ اَوْدَغُوسْت بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگیا۔

مآخذ: (۱) البکری (ترجمۂ دیسلان (de slane): *Description de l'Afrique septentrionale*، ص ۳۴۹ و مواضع کثیرہ؛ (۲) الادریسی، مترجمۂ ڈوزی (Dozy) وڈخویہ (De Geoje)، ص ۳۴؛ (۳) بارتھ (Barth): *Reisen*، ج ۴، ضمیمہ ۹، ص ۶۰۲-۶۰۴ (بمطابق سعدی: تاریخ السودان)؛ (۴) P. Laforgue: *Notes sur Audaghost*، در *Bull. Soc. Géog. Oran.*، ۱۹۴۳ء؛ (۵) R. Mauny: *Les ruines de Tegdaost et la question d'Audaghost*، در *Notes Africaines* (*IFAN*)، اکتوبر ۱۹۵۰ء.

(G. YVRES)

---

* اُوْدُفُو: (یا اُوْدُتُفُو) رک بہ اَدُفُو.

---

*⊗ اَوَدْھ: بھارت کا ایک علاقہ، جو پہلے صوبہ جاتِ متّحدۂ آگرہ واَوَدْھ کی ایک انتظامی وحدت شمار ہوتا تھا اور اب اُتّر پَردیش [دارالحکومت: لکھنؤ] کا ایک حصّہ ہے۔ یہ ۲۵ درجہ ۳۴ دقیقہ اور ۲۸ درجہ ۴۲ دقیقہ عرض البلد شمالی اور ۷۹ درجہ ۴۱ دقیقہ اور ۵۳ درجہ ۸ دقیقہ طول البلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۲۳۹۶۶ مربع میل ہے [اتر پردیش کا کل رقبہ: ۱۱۳۶۵۴] اور آبادی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رُو سے ۱۵۵۱۴۹۵۰ ہے [اُتّر پَردیش کی کل آبادی ۱۹۶۱ء میں: ۷۳۷۴۶۴۰۱].

زمانۂ قدیم ہی سے اَوَدْھ اور اس کے مضافات شمالی ہندوستان کے وسیع اور زرخیز میدان کا حصّہ رہے ہیں اور یہ ہندو تہذیب کا بڑا مرکز رہا ہے۔ اودھ [فارسی تواریخ میں عیوض] اور اس کے اردگرد کے علاقے کے متعلّق جو نیم تاریخی، نیم افسانوی روایتیں مشہور ہیں وہ سب یہاں کے قدیم شہر اجودھیا [فیض آباد] ہی سے متعلّق ہیں، جو دریاے گھاگھرا پر واقع ہے، بلکہ اجودھیا ہی کے نام سے اس علاقے کا نام اودھ پڑ گیا۔ اجودھیا کوشلیا کا پایۂ تخت تھا، جو سورج بنسی خاندان کے راجا دشرتھ کی سلطنت تھی۔ راجا دشرتھ رام چندر جی کے پِتا تھے، جن کے کارنامے رامائن میں درج ہیں۔ یہاں بھی برہمنوں کے تقدّس اور ان کی برتری کے خلاف بہت سے مذہبی ردِّعمل ہوے۔ اودھ میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں بے شمار یاتری مقررہ ایام میں رامائن کی روایات کے مطابق یاترا کے لیے جاتے ہیں.

اودھ میں بدھ مت کے بھی کئی متبرّک مقامات موجود ہیں اور [کسی زمانے میں] یہاں اس مذہب کے پیرو بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ بارھویں یا تیرھویں صدی سے متعلّق بدھ مت کا ایک کتبہ بھی ست مہت (ضلع گونڈہ) سے دستیاب ہوا ہے۔ اودھ کے متعلق مگدھ دیش میں گپت خاندان کے عروج سے قبل کے حالات ہمیں بہت کم معلوم ہیں.

منائچ (Manaič) پر محمود غزنوی کی یلغار اور سالار مسعود غازی کے [تاریخی اعتبار سے] مبہم کارناموں سے قطعِ نظر، جن کا ذکر مرآۃ مسعودی، از عبدالرحمٰن چشتی، میں آتا ہے، مسلمان فاتحین دسویں/بارھویں صدی کے آخری عشرے (یعنی عہدِ قُطب الدّین ایبک [رک بآن] میں) اودھ پر قابض ہو گئے تھے اور انھوں نے اس صوبے کو سلطنتِ دہلی میں شامل کر لیا تھا۔ ۱۱۹۴ء میں قنّوج کے راجا جے چند نے مسلمانوں سے شکست کھائی اور یہ مملکت بھی تہ و بالا ہو گئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی بھار قوم کے سیاہ فام لوگوں نے، جو ملک کے اصلی باشندے اور نیچ ذات کے تھے، اس علاقے کے قرب وجوار میں رہنے کی وجہ سے جنوبی اودھ اور بندیل کھنڈ میں بڑی اہمیّت حاصل کر لی، مگر انھیں ۱۲۴۷ء میں کچل دیا گیا۔ اس کے بعد کوئی پانسو برس تک اس ملک کی تاریخ سلطنتِ دہلی کی تاریخ ہی سے وابستہ رہی.

یہ صوبہ قطعی طور پر محمد تغلق کی وسیع وعریض مملکت کا حصّہ تھا، لیکن چودھویں صدی کے آخر میں جون پور کی شرقی سلطنت [رک بہ شرقی] میں مدغم ہو گیا، لودھیوں کے عہد میں [رک بہ لودی] یہ پھر ایک دفعہ سلطنتِ دہلی میں شامل ہوا.

۱۵۲۷ء میں جب بابر وسطِ ہند سے واپس آیا تو اس نے لودھی خاندان کے افغانوں کو شکست دے کر اَوَدْھ کو سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیا۔ بابر کی وفات کے بعد اودھ پر شیر شاہ سُوری نے قبضہ کر لیا اور ہمایوں کو اس ملک سے راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ متواتر پانچ سال تک یہاں اَمن وامان رہا۔ ۱۵۴۵ء میں شیر شاہ کی وفات پر اس کی افغان سلطنت پراگندہ ہوگئی۔ آخر اودھ مستقل طور پر سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیا گیا.

اکبر کے عہد میں تمام مملکت کو صوبوں میں تقسیم کرنے کی تجویز عمل میں آئی۔ بقولِ ابوالفضل اودھ کو ایک علٰیحدہ صوبہ بنا دیا گیا، جس میں پانچ سرکاریں یا قسمتیں تھیں اور ان میں اڑتیس محال یا پرگنے تھے۔ صوبائی عساکر میں ۷۶۴۰ سوار، ۱۶۸۲۵۰ پیادہ فوج اور ۵۹ ہاتھی تھے (آئین اکبری، ۲: ۱۷۰-۱۷۷، مترجمۂ Jarret، *Bibliotheca Indica*، ۱۸۹۱ء)۔ اودھ کے متعلّق مقامی روایتیں مسلمان مؤرّخوں کے بیانوں سے کچھ مختلف ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راجپوت سردار عملی طور پر پورے عہدِ مغلیہ میں بااختیار و بااقتدار رہے (W. C. Bennet: *The Chief Clans of the Roy Bareilly District*، ۱۸۹۵ء.

آئندہ ڈیڑھ سو برس تک مغلوں کے ماتحت اودھ میں کوئی خاص واقعہ پیش

نہ آیا، بلکہ اس دوران میں ملکی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز دکن ہی بنا رہا، جہاں بغاوت اور سرکشی کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔

شاہ جہاں کی جانشینی کے سلسلے میں جو جنگیں اورنگ زیب کو پیش آئیں ان میں اودھ نے کوئی خاص حِصّہ نہیں لیا۔ جب سلطنتِ مغلیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں معرضِ وجود میں آ گئیں اور ان کے حکمران تقریباً خودمختار ہو گئے۔ ایسی ریاستوں میں اودھ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اس نئی صورتِ حال کا آغاز ۱۷۲۴ء سے ہوتا ہے، جب محمد امین کو، جو نیشاپور کے ایک معزّز سیّد خاندان سے تھا (خافی خاں: منتخب اللباب، ۲:۹۰۲)، سعادت خاں اور برہان الملک کے القاب سے اودھ کا صوبے دار مقرّر کیا گیا۔ محمد امین پہلے خراسان میں تجارت کرتا تھا۔ وہ بہادر سپاہی ہونے کے علاوہ بڑا منتظم اور مدبّر بھی تھا۔ اس نے اجودھیا سے مغرب کی طرف چند میلوں کے فاصلے پر ایک محل تعمیر کرایا، جہاں رفتہ رفتہ ایک شہر (فیض آباد) آباد ہو گیا۔

سعادت خاں نے ملک میں امن و امان قائم رکھا اور اپنے صوبے کی حدّیں اتنی وسیع کر لیں کہ اس میں بنارس، غازی پور، جون پور اور چُنار بھی شامل ہو گئے۔ اس کے جانشین صفدر جنگ (۱۷۳۹-۱۷۴۵ء) کو، جو اس کا بھتیجا بھی تھا اور داماد بھی، ۱۷۴۸ء میں مملکتِ مغلیہ کا وزیر مقرّر کیا گیا۔ ان دونوں حکمرانوں کے عہد میں اودھ کو بڑی خوش حالی نصیب ہوئی۔ جدید قلعے، کنویں اور پُل تیار ہوئے۔ یہ وہی حکمران تھا جس نے روہیلوں کے مقابلے میں مرہٹہ قوم سے امداد طلب کی تھی۔ اس سلسلے میں جو جنگیں ہوئیں ان کی بنا پر بعد میں مرہٹوں نے روہیل کھنڈ پر اپنے حقوق کا دعویٰ کیا۔ اس کے بیٹے اور ولی عہد نواب وزیر شجاع الدّولہ (۱۷۵۴-۱۷۷۵ء) کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرنا پڑا اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر اسے شکست فاش ہوئی، جس کے باعث اودھ کا صوبہ کمپنی کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۷۶۵ء کے عہد نامۂ الٰہ آباد کی رو سے کان پور، فتح پور اور الٰہ آباد کے سوا اودھ کا باقی علاقہ شجاع الدّولہ کو واپس دے دیا گیا۔ اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ وہ پچاس لاکھ روپے کی رقم انگریزوں کو دے گا۔ عہد نامۂ بنارس کی رو سے، جس کی تکمیل ۱۷۷۳ء میں ہوئی، یہ رقم بادشاہ دہلی کو ادا کی گئی تاکہ وہ اپنا وقار و اقتدار قائم رکھ سکے۔ اس کے بعد اس درمیانی (buffer) ریاست پر، جو مرہٹوں اور بنگال کے درمیان حائل تھی، انگریزوں نے اپنا اثر اَور بھی بڑھا لیا اور وہ یوں کہ انگریزی افواج کے اخراجات دو لاکھ دس ہزار روپے ماہوار مقرر ہو کر ریاست ہی پر ڈالے گئے؛ اس کے علاوہ کڑہ اور الٰہ آباد کے اضلاع [جو شاہ دہلی کے قبضے میں تھے] نواب اودھ کے ہاتھ پچاس لاکھ روپے کے عوض فروخت کر دیے گئے، کیونکہ بادشاہ دہلی نے کمپنی سے قطع تعلّق کر لیا تھا اور یہ اضلاع مرہٹوں کے حوالے کر دیے تھے۔

آصف الدّولہ (۱۷۷۵ء - ۱۷۹۷ء) مسند نشین ہوا تو وارن ہیسٹنگز کی کونسل کی مخالف اکثریت نے اس کا خراج دو لاکھ ساٹھ ہزار روپے ماہوار تک بڑھا دیا اور نئے نواب کو مجبور کیا کہ وہ بنارس، جون پور اور غازی پور کے اضلاع کے شاہی حقوق مکمل طور پر کمپنی کے حق میں منتقل کر دے۔ ۱۷۸۱ء میں معاہدۂ چُنار کے موقع پر وارن ہیسٹنگز نے نواب کے نظامِ حکومت میں اصلاح کرنے اور انگریزی فوج کی تعداد صرف ایک بریگیڈ اور ایک پلٹن تک محدود کر دینے کی کوشش کی۔ جب وارن ہیسٹنگز کے خلاف انگلستان میں مقدمہ چلایا گیا تو اس پر جاگیروں اور بیگماتِ اودھ کے خزانوں کی ضبطی کے الزامات بھی عائد کیے گئے تھے۔ آصف الدّولہ نے ۱۷۹۷ء میں وفات پائی۔

۱۸۰۱ء میں لارڈ ولزلی (Wellesley) نے آصف الدّولہ کے سوتیلے بھائی اور اس کے جانشین نواب سعادت علی خاں (۱۷۹۸-۱۸۱۴ء) کو مجبور کیا کہ وہ پورا روہیل کھنڈ اور دوآب کا ایک حصّہ انگریزوں کے حوالے کر دے، چنانچہ اس علاقے کی تمام آمدنی انگریزی افواج کے خرچ کے لیے وقف کر دی گئی۔ سعادت علی خاں کی وفات پر اس کا سب سے بڑا بیٹا غازی الدین حیدر (۱۸۱۴-۱۸۲۷ء) وارثِ تخت ہوا۔ یہ پہلا حکمران تھا جس نے شاہِ اودھ کا لقب اختیار کیا۔ اودھ کے دوسرے بادشاہ یہ تھے: ناصر الدّین حیدر (۱۸۲۷ء - ۱۸۳۷ء)؛ محمد علی شاہ (۱۸۳۷-۱۸۴۲ء)؛ امجد علی شاہ (۱۸۴۲-۱۸۴۷ء) اور واجد علی شاہ (۱۸۴۷-۱۸۵۶ء)۔

۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی (Dalhousie) نے اودھ کے صوبے کا الحاق انگریزی علاقے سے کر لیا۔ واجد علی شاہ کا وظیفہ مقرّر ہو گیا اور اسے کلکتے میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت مل گئی، جہاں ۱۸۸۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور اودھ کی بادشاہت بھی اس کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اودھ کے الحاق کے بعد اس کا انتظام ایک چیف کمشنر کے سپرد ہوا، تا آنکہ ۱۸۷۷ء میں آگرہ اور اودھ دونوں صوبوں کو ایک ہی نظام کے ماتحت کر دیا گیا۔ ان صوبوں کے حاکم کو لفٹننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ جات و چیف کمشنر اودھ کہتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں صوبہ جات متّحدہ کے قیام پر چیف کمشنر کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں اس صوبے کو گورنر کے صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ تقسیمِ برّصغیر کے بعد یہ صوبہ اُتّر پَردیش کا حصّہ ہے [اور ریاست رام پور اور گڑھوال کے علاقے بھی اس میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ اُتّر پَردیش کا نام اسے ۱۹۵۰ء میں دیا گیا]۔

الحاق کے بعد اس علاقے کے پہلے بندوبست کے موقع پر یہاں کے بڑے بڑے تعلقہ داروں کا پورا خیال نہ رکھا گیا اور ان میں سے کئی ایک کو ان کی جاگیروں سے بے دخل کر دیا گیا۔ بہرحال جنگِ آزادی [۱۸۵۷ء] کے بعد لارڈ کیننگ (Canning) نے دوبارہ تعلقہ داری بندوبست کا طریقہ اختیار کیا اور اسناد عطا کر کے تعلقہ داروں کے حقوق کی توثیق کر دی۔

اودھ کے جن جن علاقوں پر مسلمان پہلے سے متصرّف تھے وہ اب بھی وہاں ہیں۔ وہ شہری زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ امر اس سے بھی واضح اور ثابت ہوتا ہے کہ ان کی بیشتر تعداد شہروں ہی میں ملتی ہے۔

اگرچہ آبادی میں اکثریت اور غلبہ ہندوؤں ہی کو حاصل ہے، تاہم مسلمانوں کی تعداد دس سال میں ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھی ہے اور وہ تقریباً دگنے ہوگئے ہیں جب کہ ۱۹۵۱ سے ۱۹۶۱ء تک پورے صوبے کی آبادی میں ۱۶٫۷ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد پورے صوبے میں ۱۰۷۸۸۰۸۹ بتائی گئی ہے۔

مآخذ: ان تصانیف کے علاوہ جو متنِ مقالہ میں مذکور ہیں: (۱) C. U. Atchison: *Treaties, Engagements and Sanads*، ج ۱، کلکتہ ۱۹۰۹ء؛ (۲) W. Crooke: *The Tribes and Castes of the North Western Provinces and Oudh*، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۹۶ء؛ (۳) C. A. Elliot: *Chronicles of Oonao*، الٰہ آباد ۱۸۶۲ء؛ (۴) M. R. Gubbins: *The Mutinies in Oudh*، لنڈن ۱۸۵۸ء؛ (۵) تفضیح الغافلین، مترجمہ W. Hoey، الٰہ آباد ۱۸۸۵ء؛ (۶) محمد فیض بخش: تاریخ فرح بخش (مترجمہ W. Hoey، بعنوان *Memoires of Delhi and Faizabad*)، ۲ جلد، الٰہ آباد ۱۸۸۸-۱۸۸۹ء؛ (۷) H. C. Irwin: *The Garden of india*، لنڈن ۱۸۸۰ء؛ (۸) W. Knighton: *The Private Life of an Eastern King*، اوکسفرڈ ۱۹۲۱ء؛ (۹) خیرالدین خاں محمد: تُحفۂ تازہ (بلونت نامہ)؛ (۱۰) W. Oldham: *Historical and Statistical Account of Ghazeepoor District*، الٰہ آباد ۱۸۷۰ء؛ (۱۱) *Papers relating to Land Tenures and Revenue Settlement in Oudh*، کلکتہ ۱۸۶۵ء؛ (۱۲) *Papers respecting a reform in the administration of the government of... the Nawab Wazir*، لنڈن ۱۸۲۴ء؛ (۱۳) *Parliamentary Papers, Oudh*، ج ۴۳، ۱۸۵۷-۱۸۵۸ء؛ (۱۴) *Report on the Administration of the United Provinces of Agra and Oudh*، مطبوعہ الٰہ آباد (ہر سال طبع ہوتی ہے)؛ (۱۵) W. H. Sleeman: *A Journey through the Kingdom of Oudh in 1849-1850*، ۲ جلد، ۱۸۵۸ء؛ (۱۶) سُریواستوا (A. L. Srivastava): *The First two Nawabs of Oudh*، لکھنؤ ۱۹۳۳ء؛ (۱۷) وہی مصنّف: *Shuja-ud-Daulah*، ۲ جلد، کلکتہ ۱۹۳۹-۱۹۴۵ء؛ (۱۸) نجم الغنی: تاریخ اودھ، مراد آباد ۱۹۰۹ء؛ (۱۹) کرتم علی: تاریخ مالوہ؛ (۲۰) محمد شفیق: مرآت جہان نما؛ (۲۱) وہی مصنّف: مرآت واردات؛ (۲۲) آنند رام مخلص: بدائع وقائع؛ (۲۳) روھیلکھنڈ گزیٹیر؛ (۲۴) الفنسٹن: تاریخ ہندوستان؛ (۲۵) ولیم ارون: تاریخ فرخ آباد، فتح گڑھ ۱۸۸۷ء؛ (۲۶) سیّد ولی اللہ: تاریخ فرخ آباد؛ (۲۷) گورسہائے: تاریخ اودھ؛ (۲۸) کرنل جیمس ٹاڈ: ٹاڈ نامۂ راجستھان، لکھنؤ ۱۹۰۵ء؛ (۲۹) ذکاء اللہ: تاریخ ہند؛ (۳۰) قدرت اللہ شوق: جام جہان نما؛ (۳۱) محمد ابوالحسن قطبی: آئینۂ اودھ؛ (۳۲) کمال الدین: قیصر التواریخ؛ (۳۳) تصدّق حسین: بیگماتِ اودھ؛ (۳۴) امیر علی خاں: وزیر نامہ، کان پور، ۱۲۹۳ھ۔

(C. COLLIN DAVIES [و قاضی سعید الدین احمد و ادارہ])

اَوَر: (اَوار Avars) رک بہ اَوْ راس. *

اَوْرَاد: رک بہ وِرْد. *

اَوْرَاس: (Aurés؛ Aúράστον ὄρος، درفروقفیوس Procopius: *De bello vand*، ۱: ۸ و ۲: ۱۲-۱۳، ۱۹-۲۰)، الجزائر کے اونچے پہاڑوں کا گٹھا ہوا سلسلہ، جو افریقہ کے مشرقی صحرائے اعظم کے سلسلۂ کوہستانِ اَطْلَس (Atlas) کا ایک حصّہ ہے۔ لفظ اوراس کا [صحیح] مفہوم اب تک معلوم نہیں ہوسکا. *

تہ بہ تہ، اونچے، گٹھے ہوئے پہاڑوں کا یہ سلسلہ آٹھ ہزار مربع کیلومیٹر کے رقبے میں اس نشیب سے جو باتنہ سے بِسکَرَہ تک چلا گیا ہے، خِنچِلَہ (Khenchela) اور وادی العَرَب تک پھیلا ہوا ہے اور جنوبی قُسنطِینَہ (سُباخ) کے اونچے میدانوں اور زبان کے صحرائی نشیب کے درمیان واقع ہے۔ اس کی چوٹیاں (جبال چِیلِیَہ Chélia [۲۳۲۷ میٹر] اور کِف مَخمَل [۲۳۲۱ میٹر]، جو الجزائر میں سب سے اونچی ہیں) اور اس کی کمریں ''جنوبی اَوْ رَاسی'' نشیب سے تقریباً ایک ہزار میٹر اوپر بلند ہیں۔ مغربی اَوْ راس تین لمبے پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے، جو جنوب مغرب اور شمال و مشرق کی طرف جاتے ہیں اور جنھیں عَبدی [ابدی؟] کی عمیق وادیاں اور العبود (ابیود؟) کی پہاڑی ندّیاں ایک دوسرے سے علٰیحدہ کرتی ہیں، جو تنگ گھاٹیوں میں سے گزر کر صحرا میں جا کر ختم ہوجاتی ہیں۔ مشرقی اَوْ راس کا سلسلہ نسبۃً زیادہ گٹھا ہوا ہے۔ ارتفاع اور رُخ کے اختلافات سے متعدّد مختلف بیوجغرافیائی (biogeographical) منطقے بلندیوں اور حالتوں کے فرق کی بنا بن گئے ہیں، تاہم شمالی اور شمال مغربی ڈھلانوں پر، جو چھوٹی چھوٹی اور سیدھی ہیں، بارش خاصی ہوتی ہے اور بغیر آب پاشی کے کاشت کی جاسکتی ہے۔ یہ ڈھلانیں سدا بہار شاہ بلوط (holm-oak) کے جنگلات سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ ان چوٹیوں پر جہاں اکثر برف رہتی ہے دیودار کے جنگل اور گھاس کے کشادہ پہاڑی میدان ہیں۔ جنوبی ڈھلانیں، جو بہت زیادہ طویل اور خشک ہیں، تین خطّوں پر مشتمل ہیں، جن میں طبقہ بر طبقہ کھیتوں میں فصلیں کاشت کی جاتی ہیں: ایک سرد خطّہ، جس کی بلندی ڈیڑھ ہزار میٹر سے زیادہ ہے، اکثر برف سے ڈھکا رہتا ہے اور اپنے سدا بہار شاہ بلوط کے جنگلوں، چراگاہوں، موسم گرما کی فصلوں اور اخروٹ کے درختوں کے باعث دوسرے خطّوں سے ممتاز ہے؛ ایک درمیانی خطّہ، جس میں کہیں کہیں صنوبر حلبی (Aleppo pine) اور عرعر (juniper) کے جنگل ہیں، جو بہت بے توجہی کی حالت میں پڑے ہیں اور دامنِ کوہ کی پہاڑیوں میں موسم سرما (جَو اور گیہوں) اور موسم گرما (مکئی اور باجرے) کی فصلیں، نیز انجیر اور خوبانیاں پیدا ہوتی ہیں؛ آٹھ سو میٹر سے نیچا حصّہ، جہاں پہلے کھجور کے درخت دیکھنے میں آتے ہیں جو ندّیوں کے کنارے اُگتے ہیں اور ان ڈھلانوں کے دامن میں، جہاں کہیں کہیں محض عرعر، الفا گھاس کے جھنڈ اور انتہا درجے کی ناقص چراگاہیں پائی جاتی ہیں.

اَوْراس کے باشندوں کی گزر اوقات اناج، پھلوں اور ترکاریوں پر ہے (اناج پہاڑوں پر شمالی اور جنوبی ڈھلانوں کے دامن میں بویا جاتا ہے) یا مویشیوں کی پرورش پر۔ بھیڑوں کے مقابلے میں بکریاں زیادہ پالی جاتی ہیں۔ فصلوں کی کاشت کے لیے یہ لوگ شمالی ڈھلانوں سے صحرا کی طرف چلے جاتے ہیں۔ سرمائی نقلِ وطن کا تعلّق، جس میں ریوڑوں کو بلند منطقے سے دامنِ کوہ کی طرف لے جاتے ہیں، ان خاندانوں سے ہے جو نیم خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مشرقی علاقے کے سوا، جہاں لوگ جنگلوں میں ادھر ادھر بکھری ہوئی گوربیوں (gourbis) پر مشتمل چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے ہیں، اَوْراس کے باشندے دیہاتی ہیں۔ ان کے گاؤں اکثر پہاڑوں کے پہلوؤں پر واقع ہیں اور ان میں مکانات طبقہ بر طبقہ بنے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات سب سے بلند جگہ پر ایک گوئیلا (guella) (= قلعہ، قلعہ بند کھلیان) ہوتا ہے، سرحدی علاقوں کے سوا، جہاں عربی بولنے والے قبیلے آباد ہو گئے ہیں، اَوراس کے لوگ (ایک لاکھ پندرہ ہزار) ابھی تک بربری زبان بولتے ہیں۔

عرب ان بربر لوگوں کو شاوِیَہ کہتے ہیں۔ ان کی عورتیں اب بھی بربری زبان بولتی ہیں، اگرچہ مردوں نے گھر کے باہر بول چال کے لیے عربی اختیار کر لی ہے۔

تراشے ہوئے پتھروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوراس میں قدیم متأخّر حجری (Neolithic) زمانے سے آبادی چلی آ رہی ہے۔ شکستہ حوضوں، آبپاشی کی خندقوں، کولھو کے پتّھروں وغیرہ سے رومی اثرات کا پتا چلتا ہے۔ بوزنطیوں نے اَوْراس کے شمالی رُخ کے دامن کے ساتھ ساتھ قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کرنے پر اکتفا کیا۔ جب عقبہ بن نافعؓ [رک بآن] المغرب میں داخل ہوئے تو بربروں نے انھیں سخت نقصانات پہنچائے۔ اَوْراس کے قریب ہی تہُوذہ کے مقام پر عقبہؓ نے اپنی المغرب کی مہمِ عظیم سے واپس آتے وقت شہادت پائی تھی۔ کُسَیلہ [رک بآن] کی حکومت کے برباد ہونے پر اَوْراس مسلمانوں کے خلاف مزاحمت کا مرکز بن گیا اور وہ کہیں دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں جا کر ان خون ریز معرکوں کے بعد، جن سے الکاہِنَہ [رک بآن] کا قصّہ متعلّق ہے، اس مزاحمت کو دبا سکے۔ ان جنگوں کے بعد طرابلس اور جنوبی افریقہ کے بربر اَوْراس میں آ کر آباد ہو گئے [اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں اِباضی مذہب اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں نکّاری عقیدے کا چرچا ہوا]۔ ابو یزید، جس نے ایک مختصر عرصے کے لیے فاطمی سلطنت کو معرضِ خطر میں ڈال دیا تھا، نکّاری عقیدے کا پیرو تھا۔ ہلالی حملے نے ان گنجھے ہوئے پہاڑوں کے سلسلے کے تمام رقبے کو عربی رنگ میں سمو دیا، لیکن وہاں کے باشندے اپنی خود مختاری محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے، یعنی پہلے انھوں نے بنوحَفْص [رک بآن] کی حکومت سے خلاصی حاصل کر لی اور پھر ترکوں کے تسلّط سے؛ لیکن مؤخّر الذکر نے اس نواح میں کچھ ایسے سردار مقرّر کر دیے جو ان کی حکمت عملی کے پابند تھے۔ گو ان سرداروں کا اقتدار ہمیشہ خطرے میں رہتا تھا۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی سے مَرّاکُش کے اقصاے جنوب کے مبلّغوں نے اَوْراس کے اسلام کو وہ شکل وصورت دے دی جو ۱۹۳۵ء تک قائم رہی، یعنی اسے ایک ایسا مذہب بنا دیا جو معاشرے کی ایک مخصوص وضع قطع سے گہرا تعلّق رکھتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں الجزائر کے علما نے مداخلت شروع کی، خاص طور سے اولیا پرستی کے خلاف۔

اَوْراس کے باشندوں نے اپنی قدیم سیاسی تنظیم ہمیشہ قائم رکھی ہے، جس کی بنیاد گاؤں پر ہے، یعنی ایک حقیقی بلدی جمہوریہ، جس کا نظم ونسق عوام کی ایک مجلس یا جماعۃ (جامعہ) کے ہاتھ میں ہے، انھیں سے مشابہ ــــ اگرچہ کسی قدر زیادہ سرسری ــــ شرائط کے ساتھ جو قبائلیہ میں موجود تھیں۔ ۱۸۴۵ء میں ڈیوک داومالہ (Duc d' Aumale) مَشُونیش پر قابض ہو گیا اور اسی اثنا میں بیدو (Bedeau) نے بڑے قبیلوں سے فرانسیسی حکومت کو تسلیم کرا لیا، لیکن اس کے بعد ۱۸۴۸، ۱۸۴۹ اور ۱۸۵۰ء میں ہنگاموں کو فرو کرنے کے لیے مہمّات کی ضرورت پیش آئی۔ ۱۸۵۹ اور ۱۸۷۹ء میں جب دوبارہ ہنگامے ابھرے تو فرانسیسی فوج کو پھر مداخلت کرنا پڑی۔ ۱۸۶۶ء میں اَوْراس میں مالکی فقہ رائج کی گئی اور وہاں قاضی بھیجے گئے، لیکن اسلامی قانون اور فرانسیسی تعزیری قانون کے ساتھ ساتھ مقامی رواجی قانون بھی مروّج رہا۔

مآخذ: (۱) E. Fallot: *Étude sur les Monts Aurès*، در *Bull. de la Soc. de Géog. de Marseille*، ۱۸۸۶ء؛ (۲) Col. C.: *Monographie de l'Aurès*، قسنطینہ ۱۹۰۴ء؛ (۳) de Lartigue: *Les Monts Aourès*، در *Bull. de la Soc. de Géog. de Paris*، ۱۸۸۰ء؛ (۴) A. Papier: *La Guelâa de Kebaïch et l'oasis de Mechounech*، پیرس ۱۸۹۴ء؛ (۵) M. Besnier: *Plaine d' Arris*، در *Ann. de Géog.*، ۱۸۹۹ء؛ (۶) E. Masqueray: *Formation des cités chez les populations sédentaires de l'Afrique septentrionale*، پیرس ۱۸۸۶ء؛ (۷) وہی مصنّف: *De Aurasio monte sur l'Aurés*، در *R. Afr.*، ۱۸۷۷ء؛ (۸) وہی مصنّف: *Documents hist. Voyage dans l'Aouras*، در *Bull. de la Soc. de Géog. de Paris*، ۱۸۷۶ء؛ (۹) وہی مصنّف: *Tradition de l' Aouras oriental*، در *Bull. de Corr. Afr.*، ۱۸۸۵ء؛ (۱۰) وہی مصنّف: *Das Schawi*، ڈرسڈن ۱۸۷۱ء؛ (۱۱) Sierakowski: *Lettre du Mal de St. Arnaud sur ses campagnes dans l' Aurés*، پیرس ۱۸۵۵ء؛ (۱۲) Cne de Margon: *Insurrections dans la province de Constantine. de 1870 à 1880*، پیرس ۱۸۸۳ء؛ (۱۳) G. Mercier: *Moeurs et traditions de l' Aurès*، در *JA*، ۱۹۰۰ء؛ (۱۴) F. Stuhlmann: *Ein Kulturgesch-ichtlicher Ausflug in den Aures*، ہمبرگ ۱۹۱۲ء؛ (۱۵) Hilton Simpson: *The Berbers of the Aurès Mountains*، M. W. (۱۶)

در Scottish Geog. Mag.، ج ۳۸، ۱۹۲۲ء؛ (۱۷) G. Rozet: L'
(۱۸) G. Surdon: Aurès, escalier du désert، الجزائر ۱۹۳۴ء؛
Institutions et coutumes des Berbérs du Maghreb، طبع ثانی،
طنجہ-فاس ۱۹۳۸ء؛ (۱۹) M. Gaudry: La Femme chaouia de l'
(۲۰) R. Lafitte: Études géologique Aurés، پیرس ۱۹۲۹ء، مع مآخذ؛
Les sociétés ber-: G. Tillion (۲۱)؛ الجزائر ۱۹۳۹ء، de l' Aurés
J. (۲۲)؛ ۱۹۳۸ء، در Africa، bères dans l' Aurès mèridional
Riviére: l' Habitation chez les Ouled Abderrahman، در
Africa، ۱۹۳۸ء؛ (۲۳) G. Marcy: Observ. sur l'évolution
politique et sociale de l'Aurés، Politique étrangère در
۱۹۳۸ء؛ (۲۴) وہی مصنّف: Cadre géog. et genre de vie en pays
J. Faublée، T. (۲۵)؛ ۱۹۴۲ء، Éduc. algérienne، در chaouia
و M. Faublée-Urbain، Jour. Soc. African، ۱۹۴۲،
۱۹۴۳، ۱۹۵۱ و ۱۹۵۵ء؛ (۲۶) P. Rognon: La basse vallée de l'
Trav. de l' Inst. de Rech. Sahar. در oued Abdi، ۱۹۵۴ء؛ نیز رک بہ
الجزائر، اطلس و برابرہ۔

(G. YVER)

---

* **اوراق واَسناد:** (Archives) رک بہ باش وکالت ارشوی، وثیقہ۔

---

* **اُورامار:** رک بہ اُرامار۔

---

* **اُوران:** (Oran)، رک بہ وَہران۔

---

* **اُورخان:** یا اُرخان (اُر-خان؟)، امیر عُثمان [رک بآن]، بانیِ خاندانِ عُثمانیہ، کا سب سے بڑا بیٹا۔ اس کی والدہ مَلْ [یا مَالی] خاتون شیخ اِدِہ بَالی کی بیٹی تھی، جو اِسکی شہر کے قریب اِیْت بُوزْنُو گاؤں کا رہنے والا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں بلکہ اس کے عہد میں جو واقعات رونما ہوے ان کی ترتیبِ زمانی بارے میں بھی بہت کچھ دریافت طلب ہے۔ عثمانی مآخذ کا کہنا ہے کہ وہ یکم محرّم الحرام ۶۸۷ھ/۶ فروری ۱۲۸۸ء کو پیدا ہوا، مگر دوسرے ذرائع کے مطابق اس کی ولادت یکم محرّم ۶۸۰ھ/ ۲۲ اپریل ۱۲۸۱ء کو ہوئی [سامی بک: قاموس الاعلام، بذیلِ مادّہ]۔ پہلی تاریخ کے حق میں، جو سب سے پہلے غالباً حاجی خلیفہ کی تقویم میں ملتی ہے، بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس کے لڑکپن کے بہت کم حالات معلوم ہیں۔ وہ بمشکل بارہ سال کا تھا جب اس کی شادی ۶۹۹ھ/ ۱۲۹۹ء میں یارحِصار کے حکمران کی بیٹی نیلُوفر خاتُون [رک بآن] کے ساتھ کر دی گئی۔ یہ ایک یونانی لڑکی تھی، جس کی نسبت بِلوکومہ (بِیْلِہ جِک) کے حکمران سے ہو چکی تھی۔ [شادی کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔] اس شادی سے دوسری اولاد کے علاوہ اورخان کا جانشین [سلطان] مُراد [اوّل] اور سُلَیمان پاشا پیدا ہوے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اَورخان تقریباً چالیس سال کا تھا جب وہ رمضان ۷۲۶ھ/ اگست ۱۳۲۶ء میں تخت نشین ہوا۔ ایک روایت یہ ہے کہ اورخان نے اپنے بھائی علاء الدین علی (جو عموماً محض علاء الدین کہلاتا ہے؛ قب Isl، ۱۱: ۲۰، حاشیہ ۳) کو آبائی مقبوضات کا ایک حِصّہ پیش کیا، مگر کہتے ہیں کہ وہ وزارت ہی پر قانع رہا۔ یہ روایت قرآن مجید کے قصۂ موسیٰؑ و ہارونؑ (۲۰ [طٰہٰ]: ۳۰ [وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ھٰرُوْنَ اَخِی]) سے بہت گہری مشابہت رکھتی ہے اور غالباً منصبِ وزارت کے لیے ایک تاریخی بنیاد مہیّا کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے۔ پاشا [رک بآن] کا خطاب بھی سب سے پہلے علاء الدین علی ہی نے اختیار کیا، جو بعد میں اورخاں کے بیٹے سُلَیمان کی طرف منتقل ہو گیا اور اس سے ورثے میں قَرَہ خَلِیل کو ملا۔

اورخاں کا عہد حکومت دو زمانوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) [۷۲۶ھ/ ۱۳۲۶ء-۷۴۵ھ/ ۱۳۴۴ء]، جب وہ ایشیاے کوچک میں عُثمانی طاقت کی مضبوطی، ایک فوج کی تشکیل اور سلطنتِ عثمانیہ کی بنیاد جمانے میں مصروف تھا؛ (۲) [۷۴۵ھ/ ۱۳۴۴ء-۷۶۱ھ/ ۱۳۵۹-۱۳۶۰ء (جو اس کا سالِ وفات بھی ہے)]، جب کہ وہ تَرَاکیا (Thrace) اور مَقْدُونِیَہ (Macedonia) میں قدم جمانے اور سرزمینِ یورپ میں اپنی حکومت وسیع کرنے کی فکر میں تھا۔ آلِ عُثمان کی سلطنت کی بنیادیں اسی نے رکھیں اور وہی اس کا اصل بانی متصوّر ہونا چاہیے۔

اُورخان نے ایک فاتح کی حیثیت سے اپنی قابلیت کا ثبوت اپنے والد کی زندگی ہی میں دے دیا تھا، جس نے ستّر سال کی عمر میں بعارضۂ نقرس وفات پائی تھی۔ اس سے کچھ عرصہ قبل اورخان نے بروسہ (بروصہ) پر خون بہائے بغیر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ شہر اب ملک کا دارالحکومت بن گیا۔ اس کے بعد ترکی فوجوں نے نِیقیا (Nicaea) [=اِزْنِیق] اور نِیقومِدْیہ (Nicomedia) [=اِزْمِید] کا رُخ کیا۔ اورخان کو بہت سے قابل سرداروں کی معاونت حاصل تھی، جن میں مشہور ترین گُوسہ میخال [رک بہ میخال اوغلی]، آقْچہ قوجہ، قوتُر آلپ، عبدالرحمٰن غازی، قَرَہ علی اور قَرَہ مُرسَل تھے۔ ان کی امداد سے اس نے اپنے سارے کام بڑی کامیابی سے انجام دیے۔ ان دو شہروں کو لینے سے قبل اورخان نے سب سے پہلے اقصاے شمال کے جزیرہ نما بِیتِنْیا (Bithynia) پر قبضہ کر لیا، جو شمال میں بحیرۂ اسود، جنوب میں خلیج نِیقُومِدْیَہ اور مشرق میں باسفورس سے محصور ہے۔ سمندرہ اور ایدوس کے مضبوط قلعوں کو، جو قسطنطنیہ سے نیقومدیہ جانے والی سڑک کی حفاظت کرتے تھے، سر کر لیا گیا۔ سمندرہ کا شہر اور علاقہ سپہ سالار آقْچہ قوجہ کو جاگیر کے طور پر دے دیا گیا اور یہ علاقہ آئندہ سے قوجہ اِیلی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ان دو مضبوط قلعوں کے سقوط کے بعد خلیج نیقومدیہ کے دونوں طرف کے ساحلوں پر کئی چھوٹے چھوٹے قصبے تصرف میں آ گئے، جن میں سب سے زیادہ مزاحمت قلعہ ہِرِکِہ (Hereke) نے پیش کی۔ قَرَہ مُرسَل نے یالَوَہ (Yalowa) پر قبضہ کرنے کے بعد، جو اپنے طبّی خواص [گندھک] کے چشموں کے لیے مشہور تھا، جنوبی ساحل کے علاقوں اور

قَرَہ مُرسَل کے ضلع کو بھی فتح کرلیا۔ یہ ضلع اسی نام سے موسوم ہے۔ اورخان کے باج گزار کی حیثیت سے اس نے ساحل کی حفاظت کے لیے ایک چھوٹا سا بحری بیڑا رکھنے کا عہد کیا، جس کی وجہ سے قُسطُنطِینِیَہ اور نیقو مدیہ [=ازمید] کے درمیان بحری مواصلات کا سلسلہ بالکل ختم ہوگیا۔ اب اورخان نیقو مدیہ پر چڑھائی کے لیے بذاتِ خود میدان میں آگیا۔ قویُون حِصار کے پہاڑی قلعے کے سقوط کے بعد اس شہر پر بغیر کسی خاص دقّت کے قبضہ ہوگیا۔ اگرچہ بادشاہ اَنڈرونِیکوس (Andronikos) نے نیقو مدیہ سے ہاتھ اٹھالیا تاہم اس نے پالیولوجی (Palaeologi) کے قدیم دارالحکومت نِیقیا کی مدافعت کی تیاری شروع کردی۔ ۱۳۳۰ء کے شروع میں بوزنطی ایشیائی ساحل کی طرف بڑھے اور میزُوثِینِیَہ (Mesothynis) میں فِیلوکرِین (Philokrene) کے چھوٹے سے ساحلی قصبے کے قرب وجوار میں، جواب تَوشَنجِل کہلاتا ہے، ایک لڑائی لڑی گئی، جس کے متعلق ترکی مآخذ میں کوئی بیان نہیں ملتا۔ دوسری طرف بوزنطی مؤرّخین (یعنی Kantakuzenos، مطبوعۂ بون، ۱: ۴۴۱ ببعد؛ Nikophoros Gregoras، مطبوعۂ بون، ۱: ۴۳۴؛ نیز قب Phrantzes اور Chalcocondyles) کے بیانات میں صریح غلطیاں پائی جاتی ہیں اور انھوں نے واقعات کو جان بوجھ کر مسخ کیا ہے۔ فیلوکرین کے مقام پر بوزنطیوں کی شکست کا مطلب یہ تھا کہ نِیقیا کو بچانے کی سب امیدوں کا خاتمہ ہوگیا، حتّٰی کہ باشندوں نے کسی خاص مزاحمت کی کوشش تک نہ کی بلکہ جلدی سے اورخان کی وفاداری کا حلف اٹھالیا۔ یہ شہر، جہاں اورخان نے دل کھول کر دولت صرف کی، اپنے دورِ ابتلا کے بعد سلطنت عثمانیہ کا ایک نہایت ترقی پذیر اور بارونق شہر بن گیا۔ نِیقیا، جواب اِزنِیق [رک بآں] کہلاتا ہے، خصوصًا اپنے مدارس کی بدولت مسلمانوں کی علمی و فکری سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اورخان کے بیٹے سلیمان نے ۱۳۳۳ء میں اس علاقے پر، جو [دریاے] سَقَارِیَہ (سَنگَرِس sangaris) کے شمال میں تھا اور اب تک خود مختار چلا آرہا تھا، چڑھائی کردی۔ اس میں کُوینِک (Goinik)، مدرنی (Modrene) اور تَرَکجی (Tarakdji) کے شہر واقع تھے، جن پر قریب قریب کوئی ضرب لگائے بغیر ہی اس کا قبضہ ہوگیا۔ اورخان نے اب تک اپنی تمام تر کامیابیاں اور فتوحات یونانیوں کے مقابلے ہی میں حاصل کی تھیں اور ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے جنگ کا کوئی موقع پیش نہیں آیا تھا جو سلجوق سلطنت کے اندر قائم ہوچکی تھیں۔ سب سے پہلے ہمسایہ ملک قَرَہ سی [رک بآں] کی باری آئی، جہاں ۱۳۳۵ء میں دو بھائیوں کے درمیان جانشینی کا جھگڑا رونما ہونے کے بعد چھوٹا بھائی طُرسُون، اُورخان کے دربار میں رہنے لگا تھا۔ طُرسُون نے اپنے بڑے بھائی (تیمورخان) کے خلاف اورخان کی امداد چاہی، جس نے قول وقرار کے بعد قرہ سی پر حملہ کردیا۔ راستے میں اس نے اُدُلُوباد، کِرمَاسْتی [رک بآں] اور مِیخالِیچ، نیز کویلسوس (koilsos) اور آیلسوس (Ailos) کے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ بالیکسری کو بغیر جنگ کیے اُورخان کے حوالے کردیا گیا اور جو بھی مزاحمت ہوئی صرف بُرغَمہ میں کی گئی؛ لیکن یہ شہر بھی جلد ہی ترکوں کے ہاتھ میں آگیا اور یہ اُورخان کے اس نرم سلوک کی بدولت تھا جو اس نے قَرَہ سی کے فرمانروا کے ساتھ کیا تھا، جب کہ اس نے بڑی غدّاری سے ۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء میں اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کروادیا تھا۔ حاجی اِیلبِگی کو، جو قَرَہ سی کے آخری فرمانروا کا وزیر تھا، نئے مفتوحہ علاقے کا انتظام سپرد کردیا گیا اور اِجہ بیگ اور اِدرِنوس [رک بآں] اس کے مشیر مقرر کیے گئے۔ بُرغَمہ کی فتح کے بعد اورخان باقاعدہ قوانین کے ذریعے اپنی حکومت مضبوط کرنے اور عُثمانی سلطنت کے انتظام کی طرف متوجہ ہوگیا، جو اب خاصی وسیع ہوچکی تھی۔ بظاہر وہ پہلا شخص ہے جس نے اناطولیہ کی سرزمین پر اپنی حکومت منظّم کی (اس موضوع پر قب Zinkeisen کا مفصّل بیان، در *GOR*، ۱: ۱۱۸ ببعد)۔ اس کام میں اس کے بھائی علاء الدین علی نے اپنی وفات ([۷۳۳ھ/] ۱۳۳۳ء، در قاموس الاعلام، ۷۳۷ھ/۱۳۳۶-۱۳۳۷ء]) تک بڑا اہم حصّہ لیا۔ اس کے بعد اس کے بھتیجے سلیمان [بن اُورخان] نے اس کی جگہ لے لی۔ کہا جاتا ہے کہ ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء میں علاء الدین نے اپنے بھائی کو (بقول سعد الدین) سب سے پہلی ٹکسال قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ اس سال اورخان کے نام کے سونے اور چاندی کے سکّے مضروب ہوے۔ ان سکّوں نے سلجوقیوں کے سکّوں کی جگہ لے لی، جو اس سے پہلے پوری سلطنتِ عثمانیہ میں رائج تھے۔ لباس کے متعلّق ایک حکم کے ذریعے مختلف طبقوں اور مراتب کے لوگوں کے درمیان سختی سے امتیاز قائم کردیا گیا اور چِنڈِرہ لی خَلِیل [رک بآں] نے ساری فوج نئے حالات کے مطابق ازسرِنو منظّم کی۔ ۱۳۳۰ء میں یَنی چری [رک بآں] کی فوج بنائی گئی۔ یہ ترکیہ کی وہ پیدل فوج تھی جو عیسائی نژاد نوجوانوں پر مشتمل اور حاجی بَکتاش [رک بآں] سے منسوب تھی۔ بے قاعدہ پیدل فوج کی بھی اصلاح کی گئی، جو عَزَب [عزبلر=نوجوان، ناکتخدا لوگ] کہلاتی تھی اور جاگیردارانہ سوار فوج آقِنجِی [=چھاپہ مار] کی شکل بھی نئی سلطنت کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لی گئی۔ علاوہ ازیں اُورخان نے بہت سی مسجدیں، خانقاہیں اور مدرسے تعمیر کیے۔ مذہبی امور کے ساتھ اس کی گہری دل چسپی ان اوقاف سے ثابت ہوتی ہے جو اس نے نئے مفتوحہ علاقوں میں ہر جگہ قائم کیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ درویشی سلسلے کو، جو اس زمانے میں اپنے عروج پر تھا، اس کی سرپرستی حاصل تھی، (معلوم ہوتا ہے کہ بکتاشی سلسلہ اُورخان کے عہد ہی میں پیدا ہوا)۔ اس کا ثبوت زہّاد کے ان لاتعداد زاویوں اور خانقاہوں سے ملتا ہے جو اس کے دارالخلافہ بروسہ میں پائی جاتی تھیں۔ یہ لوگ اس کے عہد میں مشرق کی طرف سے آئے اور عثمانی سلطنت میں انھیں مأمن ملا۔ اورخان کے عہد کی اسلامی زندگی ــــ جس پر شیعی نہیں تو گہری علوی چھاپ تھی ــــ تاریخِ مذہب کے نہایت قابل توجہ مظاہر میں سے ہے، جس کے بنیادی پہلوؤں کی مخصوص مطالعات کے ذریعے توضیح کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

اُورخان کے عہد میں ترکانِ آلِ عثمان اور بوزنطیوں کے درمیان دوستانہ اور پُرامن تعلّقات کا آغاز ہوا، اگرچہ اس کے ساتھ ہی صلح و جنگ اور دشمنی و آشتی کی متبادل حالتیں بھی نظر آتی ہیں (قب J. V. Hammer، در *GOR*، ۱: ۱۲۶)۔

عثمانی افواج کو بار بار بوزنطی بادشاہوں کی مدد کے لیے بلایا جاتا رہا اور جب اورخان تخت نشین ہوا تو اس وقت تک ترکی لشکر تین دفعہ آبنائے کو عبور کر چکے تھے (قب J. V. Hammer، در *GOR*، ۱: ۱۲۰ ببعد؛ Zinkeisen، در *GOR*، ۱: ۱۸۴ ببعد)۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان یورشوں کا مقصد دَردانیال کے اس پار سلطنتِ عثمانیہ کا قیام نہ تھا اور اسی کے لیے بوزنطی بادشاہ ان کی طرف بہت کم توجہ کرتا تھا، لیکن مرورِ ایام سے یہی بے قاعدہ جولانیاں اناطولیہ کے چھوٹے چھوٹے رئیسوں کی پیش از پیش منظّم مہمّوں میں تبدیل ہوگئیں، مثلاً آیدین اِیلی [رک بآں] کا فرمانروا اُمُور بیگ، جو اس عہد کا ایک درخشاں، اگرچہ غیر معروف، فرد تھا، یقیناً سرزمینِ یورپ پر اپنے بار بار کے حملوں کو باقاعدہ طور پر کچھ اَور آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خود اورخان نے [۷۳۳ھ/ ۱۳۳۳ء] میں نیقومدیہ کے محاصرے کے وقت بادشاہ اندرونیکوس سے عہد کیا تھا کہ وہ بوزنطیوں کے زیرِ سیادت ایشیائے کوچک کے شہروں میں رخنہ اندازی نہیں کرے گا (قب Kantakuzenos، مطبوعۂ بون، ۱: ۴۴۶)، مگر بعض اسباب نے جلد ہی ایسے کسی معاہدے کے استحکام کو ختم کر دیا۔ اورخان ۷۳۳ء ہی میں چھتّیس بحری جہازوں کے ساتھ قسطنطینیہ کے قریب اترنے کی کوشش کر چکا تھا؛ لازمًا اس کا مقصد یہ ہوگا کہ دارالسلطنت پر حملہ کرے اور تراکیا (Thrace) پر اپنا اقتدار قائم کر لے، لیکن ترکوں کو زبردست شکست ہوئی اور وہ صرف ایک جہاز بچا کر لا سکے۔ اس کے بعد جلد ہی قسطنطینیہ میں جانشینی کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے اور دُمستِقِ اعلیٰ (Grand Domesticos) کانتاکوزینوس (Kantakuzenos) بادشاہ بن گیا اور جان پیلیوغوس (John Palaelogus) کے ساتھ مشترکہ حکمران قرار پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُورخان اور کانتاکوزینوس کے درمیان مصالحت ہوگئی۔ اُمُور بیگ نے یورپ کی سرزمین پر قدم جمانے کی کوششیں پھر جاری کر دیں، مگر آدمیوں اور جہازوں کے صَرف کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس عرصے میں اورخان چوکتا رہا اور جب اسے نوجوان بادشاہ پیلیولوغوس کی ماں قیصرہ اینا (Anna) نے اپنے حریف کانتاکوزینوس کے خلاف مدد کے لیے ایک فوج بھیجنے کی ترغیب دی تو کانتاکوزینوس نے بھی یہ بڑھتا ہوا خطرہ بھانپ لیا اور جب یہ فوج بُری طرح ختم ہوگئی تو اس نے اپنی پوری قوت کے ساتھ اُورخان کو اپنے مقاصد کا حامی بنانے کی کوشش کی؛ چنانچہ جنوری ۱۳۴۵ء میں اس نے چھے ہزار سپاہیوں کے عوض اپنی بیٹی تھیوڈورا (Theodora) کو، جو ابھی نابالغ تھی، اورخان کے حرم میں داخل کرنے کی پیش کش کی (قب Kantakuzenos، ۳: ۳۱، مطبوعۂ بون، ص ۴۹۸؛ Dukas، ص ۹، مطبوعۂ بون، ص ۳۳ ببعد؛ Chalcoc، ۱: ۲۴)۔ یہ شادی مئی ۱۳۴۶ء میں بمقام سلیمبر یا (Selymbria) بصد شان و شوکت منعقد ہوئی (Kantakuzenos، ۳: ۹۵، ۵۸۵ ببعد؛ Nikeph. Gregoras، ۱۵/ ۵: ۷۶۲ ببعد؛ Dukas، ۹: ۳۵)۔ بقول Nikeph. دلہن کا نام ماریا (Maria) تھا (قب ۱: ۷۶۲)، جو یقیناً غلط ہے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اُورخان کی بیوی نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا بلکہ پکّی عیسائی رہی (قب Kantakuzenos، مطبوعۂ بون، ص ۵۸۸؛ Zinkeisen، در *GOR*، ۱: ۲۰۱ ببعد)۔ اس نے عیسائی غلام خریدے اور انھیں آزادی دے کر اور اپنے وطن روانہ کر کے بڑی نیک نامی حاصل کی۔ شہزادہ خلیل چلپی، جو بعد ازاں اہلِ جینوا کے ہاتھوں اسیر ہوا اور جس نے آغازِ شباب ہی میں بادشاہ جان (John) پنجم کی بیٹی سے شادی کر لی تھی، غالباً اسی کے بطن سے تھا (قب Jorga، در *GOR*، ۱: ۲۰۱)۔ کانتاکوزینوس نے ترکوں کے ساتھ جو رشتہ داری قائم کی تھی وہ آگے چل کر اسے مہنگی پڑی۔ جب شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اورخان نے اسے سربی فرمانروا استیفان دوشان (Stjepan Dusan) کے خلاف مدد کے طور پر دس ہزار سپاہی روانہ کیے تو یہ ترک بوجوہ بوزنطیوں ہی کے خلاف پلٹ پڑے۔ بایں ہمہ ۱۳۴۹ء میں کانتاکوزینوس نے اپنے داماد سے ایک بار پھر اعانت طلب کی.....، لیکن اس دفعہ بھی بیس ہزار افراد پر مشتمل فوج کو غیر متوقع طور پر واپس بلا لیا گیا۔ یورپ پر ان دو حملوں کے علاوہ، جو کانتاکوزینوس کی درخواست پر عمل میں آئے، اناطولی لشکروں کی یورشوں کا سلسلہ جاری رہا اور تراکیا کے لوگوں کے مصائب ناقابلِ برداشت ہوتے گئے۔ اورخان نے اس غیر متیقّن صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا اور یورپ میں عثمانی طاقت کے مستقل قیام کے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اس نے ۱۳۵۶ء میں اپنے لڑکے سلیمان پاشا کو دَرّۂ دانیال عبور کرنے کا حکم دیا۔ دَرّۂ دانیال کو قلعۂ تزیمپہ (Tzympe) (جدید: جمِن لِک) کے مقام پر کامیابی کے ساتھ عبور کر لیا گیا۔ ۷۵۹ھ/ ۱۳۵۷ء میں کالی پولیس (Kallipolis) پر (جسے اب گیلی پولی (Gallipoli) کہتے ہیں) ترکوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۷۶۰ھ/ ۱۳۵۸ء میں فاتح سلیمان پاشا کی بے وقت موت سے، جو بروسہ میں نہیں بلکہ تراکیا میں بُلَیر (Bulair) کے مقام پر دفن ہے، وقتی طور پر ترکوں کی مزید پیش قدمی رک گئی۔ یہ صحیح ہے کہ حاجی اِیل بکی اور اِجہ بیگ نے اندرون ملک میں یورشیں کیں۔ لیکن ترکی اقتدار کو توسیع دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اورخان، سلیمان کی وفات کے بعد بہت جلد وفات پا گیا۔ ہمیں اس کی تاریخ وفات وثوق سے معلوم نہیں۔ سب سے قرین قیاس بیان وہ ہے جس میں اس کی تاریخ وفات ۷۶۱ھ (جس کا آغاز ۲۳ نومبر ۱۳۵۹ء سے ہوتا ہے) کے اوائل میں بتائی جاتی ہے۔ یہ بیان (جو J. K. Jireček نے کسی سلافی تاریخ سے لیا ہے) کہ اورخان مارچ ۱۳۶۲ء، یعنی ادرنہ (Adrianople) پر قبضے کے بعد تک زندہ رہا کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا (قب *Archiv für slav. Phil.*، (۱۸۹۲ء) ۱۴: ۲۶۰)، اگرچہ Oskar Halecki: *Un Empereur de Byzance à Rome* (وارسا ۱۹۳۲ء = *Travaux historiques de la société des Sciences et des Lettres de Varsoive*، ج ۸)، ص ۴۷، حاشیہ ۳ — مبنی بر C. Jireček: کتاب مذکور، نیز *Byz. Zeitschr*، (۱۹۰۹ء) ۱۸: ۵۸۲ ببعد — کا رجحان یہ نظر آتا ہے کہ اورخان کی تاریخ وفات

۱۳۶۱ء ہی قرار دی جائے۔ یہ امر مسلم ہے کہ بوزنطی وقائع (قب خصوصاً ص ۳۹۲)، جن کی تدوین Jos. Müller نے *Sitzungsber. d. k k. Ak. d. wiss.*، وی انا ۱۸۵۳ء، جلد ۹، میں کی ہے، قطعی طور پر اس قیاس کے حق میں ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ فلورنس کا مؤرّخ وِلانی (Matteo Vilani) (قب Muratori: *Rerum Ital. Script*، ۱۴: ۶۷۲ ببعد) بھی ''اَورکم'' (یعنی اُورخان) کے ابتدائی اقدام کو نومبر ۱۳۶۱ء ہی میں ظاہر کرتا ہے۔ اگر مُراد اوّل کو بجا طور پر ادرنہ کا فاتح قرار دیا جائے تو پھر اس کے والد، یعنی اُورخان کا سالِ وفات ۱۳۶۱ء سے پہلے ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اب یہ طے شدہ بات ہے کہ ادرنہ کی تسخیر اسی سال کے موسم بہار میں ہو چکی تھی (دریں بارہ قب F. Babinger، در *MOG*، ۲: ۳۱۱ ببعد؛ نیز یہ امر بھی، جس کا اندراج *MOG* میں نہیں ہے، کہ بقول O. Halecki: کتاب مذکور، ص ۷۵، وینس میں ادرنہ کی تسخیر کا علم ۱۴ مارچ ۱۳۶۱ء کو ہوا)۔ اورخان کو بروسہ میں اس کے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا (قب فان ہامر (J. v. Hammer)، در *GOR*، ۱: ۱۵۷ ببعد، جس میں اس کی مبیّنہ شکل وشباہت کے متعلّق تفصیلات دی گئی ہیں)۔

مآخذ: ہم عصر ترکی مآخذ ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے۔ بوزنطی مؤرّخین میں اہم ترین (۱) اورخان کا خسر کانتا کوزینوس (Kantakuzenos) ہے، تاہم اس کے تعصّب کی بنا پر اس کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کرنا چاہیے؛ (۲) نیقوفوراس جریجوراس (Nikephoras Gregoras) اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ معتبر ہے؛ چودھویں صدی میں ترکوں کے داخلۂ یورپ پر (۳) John Draesecke نے *Neues Jahrbuch für das klassische Altertum*، ۳۱: ۷، میں تنقیدی نظر ڈالی ہے؛ اُورخان کے پورے دورِ حکومت پر زمانۂ حال میں (۴) H. A. Gibbons (م ۱۹۳۴ء) نے بعنوان *The Foundation of the Ottoman Empire*، اوکسفرڈ ۱۹۱۶ء، ص ۵۴-۱۰۹، تبصرہ کیا ہے، لیکن اس کی رائے ہمیشہ قابل اعتبار نہیں؛ مزید مآخذ J. v. Hammer، Zinkeisen اور Jorga کی تصانیف میں مذکور ہیں۔

[اُورخان ایک اُورترک شہزادے کا نام بھی تھا، جو سلطان بایزید کے بیٹے سلیمان کا پوتا تھا۔ وہ بادشاہ قسطنطینیہ کے پاس پناہ گزیں ہو گیا تھا، جس پر سلطان محمد ثانی نے اس کی جاگیر اور وظیفہ ضبط کر لیا۔ فتح قسطنطینیہ (۲۹ مئی ۱۴۵۳ء) کے موقع پر اس نے ایک بلند دیوار سے کود کر خودکشی کر لی (قب سامی بک: قاموس الاعلام، بذیلِ مادّہ)].

(FRANZ BABINGER[واداره])

⊗ **اُوْرخان وَلی کانک:** (۱۹۱۴-۱۹۵۰ء) اس کا شمار ترکی زبان کے بلند پایہ ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ استانبول میں پیدا ہوا تھا۔ اور اسی شہر کی مشہور درس گاہ غَلَطَہ سَرای لِیسہ سی (Galatasaray Lisesi) کے علاوہ انقرہ اِزکیک لِیسہ سی (Ankara Erkek Lisesi) اور استانبول یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اسے بچپن ہی سے شعر وشاعری کے ساتھ لگاؤ تھا اور انقرہ اِزکیک لِیسہ سی کی طالب علمی کے دوران ہی میں ادبی دنیا میں متعارف ہو گیا تھا۔ اسی مدرسے میں اس کی دوستی اُوکتای رِفعت (Oktay Rifat) اور مِلیح جِوْدِت (Melih Cevdet) سے ہو گئی اور ان تینوں کا ایک ایسا حلقہ بن گیا جس نے عہد عثمانی کے قدیم شاعروں کی طرح سیاسی، سماجی اور معاشی قدروں سے جی چرانے کے بجائے الفاظ کا رشتہ حقیقت سے جوڑنے کی ضرورت محسوس کی اور زندگی کے تمام سماجی، معاشی اور تہذیبی پہلوؤں کو امکانی حد تک واقعیت پسندانہ اور فنکارانہ طور پر بیان کرنے کی کوشش کی۔ اُورخاں ولی کانک کے اس دور کے اشعار غَرِیب (*Garip*) نامی کتاب میں موجود ہیں، جو پہلی بار ۱۹۴۱ء میں مع ایک تفصیلی مقدمے کے شائع ہوئی تھی اور جس میں اُوکتای رِفعت اور مِلیح جِوْدِت کا کلام بھی موجود ہے۔ انھیں تینوں دوستوں نے مل کر ۱۹۴۹ء میں ایک ادبی رسالہ یَپراق (*Yaprak*) بھی نکالنا شروع کیا تھا، جس میں انھیں خیالات کی ترجمانی ملتی ہے۔

اُورخاں ولی کانک کو فرانسیسی زبان وادب سے بھی شغف تھا۔ اس ادب کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے شہ پاروں کا ترجمہ کر کے ترکی دنیا کو فرانسیسی ادب اور اس کے رجحانات سے گہری اور قریبی واقفیت بخشنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس نے نصر الدین خوجہ پر بھی لکھا ہے۔ خوجہ ترکی زبان میں طنز ومزاح کا مشہور نمائندہ اور بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ اُورخاں ولی کانک نے اس کے قصّوں کو اپنے زمانے کی سادہ اور عام فہم ترکی زبان میں بیان کیا ہے۔

اُورخان ولی کانک کا انتقال چھتّیس سال کی عمر ہی میں ہو گیا، لیکن اس کا کلام عرصے تک عوام میں مقبول رہے گا۔ اس کی نظمیں ہیئت اور اندازِ بیان کے نقطۂ نظر سے بڑی جاندار ہیں۔ اس نے اپنے کلام میں تعمیری اور معاشرتی رجحانات کی بھی ترجمانی کی ہے اور زبان کی سادگی اور مکالمانہ اندازِ بیان کے ذریعے اس میں شاعرانہ حسن پیدا کیا ہے۔ غریب (*Garip*) کے علاوہ اس کے کلام کے مجموعے وَزْ گِچْمِہ دِغِم (*Vazgeçmediğim*) (۱۹۴۵ء)، دِسْتان گِبِی (*Destan Gibi*) (۱۹۴۶ء)، یِنِی سِی (*Yenisi*) (۱۹۴۷ء)، کَرْشہ (*Karşa*) (۱۹۴۹ء) اور بُوطُون سُورلری (Bütün Sürleri) (۱۹۵۱ء) شائع ہو چکے ہیں، جو قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

مآخذ: (۱) مصطفٰی اوزون (Mustafa N. Özon): سون اثر تورک ادبیاتی تاریخی (*Son Aser Türk Edebiyate Tarihe*)، استانبول ۱۹۵۶ء؛ (۲) سَن یُوسِل: یِنِی تُورکیِہ (*Yeni Türkiye*)، انقرہ ۱۹۵۶ء؛ (۳) اکویوجولرن حاضر لدیغی ینی تورک شوری انطولوجیسی (*Okuyucularin Hazirladiği Yeni Türk Şüri Antolojisi*)، (یدی تپہ یین لری *Yeditepe Yayenlare*، استانبول ۱۹۵۶ء)؛ (۴) اکمل ایّوبی: ترکی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ادارۂ علومِ اسلامیہ، ۱۹۶۳ء)؛ (۵) وہی مصنّف: جدید ترکی ادب (مقالہ، در فکر ونظر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جلد ۵، شمارہ ۲)۔

(اکمل ایّوبی)

---

* اَوُرشلیم: [یروشلم] رک بہ القدس.

---

* اَوُرفہ: (Orfa)، رک بہ الرُّہا.

---

* اُوُرگنج: (Urgenč)، رک بہ خوارزم.

---

* اَوُرمُز: (Ormuz)، رک بہ ہُرمُز.

---

* **اَورَنگ آباد:** بھارت کے صوبۂ بمبئی کا ایک ضلع اور شہر، جس کی آبادی ۱۹۵۱ء میں ۱۱۷۹۴۰۴ تھی۔ علاء الدّین خلجی کے عہدِ حکومت میں ملک دکن کے اس حصّے کے ہندو حکمران مسلمانوں کو خراج دینے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۳۴۷ء میں یہ علاقہ بہمنی سلطنت میں شامل کر لیا گیا اور اس سلطنت کے زوال و انتشار کے بعد نظام شاہی سلطنتِ احمد نگر کا ایک حصّہ بن گیا۔ ملک عنبر ایک قابل حبشی وزیر تھا۔ جس کی قیادت میں احمد نگر نے مغل حملہ آوروں کا زبردست مقابلہ کیا، لیکن ۱۶۲۶ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا مغلیہ سلطنت سے الحاق ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل میں مغلیہ سلطنت کے زوال پر اورنگ آباد کو نظام کی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۹۵۶ء سے یہ شہر احاطۂ بمبئی کی حکومت میں شامل ہے.

اورنگ آباد کا پہلا نام کھڑکی تھا اور ملک عنبر کے زمانۂ حکومت میں یہ احمد نگر کا پایۂ تخت رہا۔ مغلیہ فوجوں نے ۱۶۱۲ء میں اسے جلا کر خاک کر دیا، لیکن اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا اور اورنگ زیب کے نام پر اس کا نام اورنگ آباد رکھا گیا، جس نے دوسری بار دکن کا صوبے دار مقرّر ہونے پر وہاں اقامت اختیار کر لی تھی۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر خُلد آباد میں ملک عنبر، اورنگ زیب اور مملکتِ آصفیہ کے بانی آصف جاہ کے مقبرے ہیں۔ ایک زمانے میں یہ شہر کمخواب و زربفت بنانے کے لیے مشہور تھا، لیکن اب یہ اور اس کے علاوہ دوسری صنعتیں زوال پذیر ہو چکی ہیں.

اسی نام کا ایک اور چھوٹا سا قصبہ ریاست بہار کے ضلع گیا میں بھی واقع ہے [قب *Imperial Gazetteer of India*، ۶: ۱۴۰-۱۵۰].

(C. COLLIN DAVIES)

---

* **اورنگ آباد سیّد:** اُتّر پَردیش (بھارت) کے ضلع بلند شہر کا ایک چھوٹا سا قصبہ۔ اسے سیّد عبد العزیز نے، جو سیّد جلال الحسین بخاری کی اولاد میں سے تھے، ۱۷۰۴ء میں بسایا تھا.

(C. COLLIN DAVIES)

---

* **اورنگ زیب:** رک بہ عالمگیر.

---

* **اُوُرنُوس:** (غازی اِوُرنوس) کا نام تاریخ میں اس وقت سامنے آیا جب قَرَہ سی کی امارت پر ترکوں نے قبضہ کر لیا (۷۳۵ھ/ ۱۳۳۴-۱۳۳۵ء کے بعد) اور سلطان اُورخان نے اسے بطور ''تیمار'' [رک بآن] اپنے سب سے بڑے بیٹے سلیمان پاشا کو عطا کیا، جس کی ملازمت میں امارت قَرَہ سی کے ''بیگ''، یعنی حاجی ایل بکی، اِجہ بیگ، غازی فاضل اور اِوُرنوس آ گئے۔ اس خاندان کے شجرۂ نسب کی رو سے، جس کی ایک وقف نامے (نشر از برکان Ö. L. Barkan، در وقفلر دِرگِسی، انقرہ ۱۹۴۲ء، ۲: ۳۴۲-۳۴۳) سے تصدیق ہوتی ہے، اور نوس کے باپ کا نام عیسٰی بیگ بتایا گیا ہے، جو آگے چل کر ''پُرنگی'' کے نام سے اس لیے موسوم ہوا کہ اس کی وفات اسی نام کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی، جہاں اس کے فرزند نے اس کا مقبرہ تعمیر کرایا اور ایک وقف قائم کیا۔ اورنوس کا نام اس مددگار فوج کی فہرست میں مل سکتا ہے جو اُورخان نے اپنے بیٹے کے زیرِ قیادت کانتا کوزینوس (Kantacuzenos) کی مدد کے لیے بھیجی تھی، جو جان پنجم پیلیولوغوس (John V Palaelogus) سے برسرِ پیکار تھا؛ لیکن عثمانی مؤرّخوں کے نزدیک غازی اورنوس کی تاریخ کا تسلسل کے ساتھ آغاز خاص طور پر اس وقت ہوتا ہے جب سلیمان پاشا (م ۷۵۹ھ/ ۱۳۵۸-۱۳۵۹ء) نے درّۂ دانیال عبور کیا۔ جب گیلی پولی کے قریب قلعۂ قونیر حصاری میں حاجی اِیل بکی کے ساتھ اس کا تقرّر ہو گیا تو اورنوس بھی اِیل بکی کے ساتھ ان حملوں میں شریک ہوا جو اس نے دِیمتوقہ (Dimetoka) [رک بآن] کے علاقے پر کیے اور کیشان کو تسخیر اور ایپصالہ کو تاراج کر کے ذاتی طور پر بڑا نام پیدا کیا۔ اس زمانے سے اس کا نام فتح روم ایلی کی تاریخ سے مربوط نظر آتا ہے، کیونکہ یہیں اس نے اپنی یورشوں کی بدولت شہرت حاصل کی۔ اُورخان کی وفات کے بعد اورنوس نے حاجی ایل بکی کے ساتھ مل کر اس معرکے میں حصّہ لیا جس میں مُراد اوّل (۷۶۳ھ/ ۱۳۶۲ء) نے ادرنہ پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد مُراد اوّل نے اسے فوراً شہر ایپصالہ اور گُومُلجِنہ (Gümüldjina) (کوموتینی Komotini) پر، جو تراکیا (Thrace) میں ہے، قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور مفتوحہ علاقوں کا اُج بیگی مقرّر کر دیا۔ وہ سِیرپ صیندیغی (Sîrp-Ṣindîghî) کی لڑائی میں موجود تھا۔ پھر ۷۷۲ھ/ ۱۳۷۱ء میں جنگِ چرمن (چرنومن Tchernomen) یا جنگ ماریتزہ (Maritza) میں بھی شریک رہا، جو اہلِ سربیا اور ان کے حلیفوں کے لیے سخت تباہ کن ثابت ہوئی اور ترکوں کے لیے فتحِ مقدونیہ کی راہ ہموار ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۷۷۲ھ/ ۱۳۷۱ء میں اورنوس کو فِرِجِک (Pherrai) فتح کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ اس کے بعد جب ایک طرف کوالا (Kavala)، زِشنہ (Zichna)، سیرِس (Serres) اور یَنِیجۂ واردار (Yenidje-i-Vardar) (قرہ فِریہ Karaferya) پر ترک قابض ہو گئے تو دوسری طرف اورنوس نے پُوری (Peritheorion)، اِسکِجہ (Xanthi) اور عورت حصاری (Maronia) کے علاقوں پر قبضہ کر کے وہاں خراج عائد کر دیا (۱۳۷۳ء)۔ سلطان نے انعام کے طور پر اسے سیرس کا علاقہ دے دیا، جو خود اس

نے زیر کیا تھا اور جس کا وہ اُج بیگی ہو گیا تھا (۷۸۴ھ/ ۱۳۸۲ء یا ۷۸۷ھ/ ۱۳۸۵ء)۔ اس کے بعد اس نے مقدونیۃ العظمٰی کی تسخیر میں حصّہ لیا اور ینیچۂ واردار اور مُناستر (Monastir) فتح کرنے کے علاوہ البانیا کے بادشاہ بلشا (Balsha) دوم کے خلاف وزیر چندرلی خیرالدین پاشا کے زیرِ قیادت اس مہم میں شرکت کی جس کا خاتمہ بادشاہِ مذکور کی وفات پر ہوا (۱۳۸۵ء)۔ اس سے فراغت پا کر اورنوس فریضۂ حج ادا کرنے گیا اور واپسی پر اسے سلطان نے ایک اہم جاگیر عطا کی۔ اس موقع پر مُراد اوّل نے اسے جس فرمان سے نوازا تھا وہ ایک مدت تک غلطی سے جعلی تصوّر کیا جاتا رہا۔ اس موضوع پر متعدد کتابوں میں بحث ہوتی رہی ہے (Diez: *Denkwürdigkeiten von Asien*، برلن ۱۸۱۵ء، ۲: ۱۰۱-۱۳۲؛ قب فریدون: منشآت السلاطین، ۱: ۸۷-۸۸)۔ مُراد اوّل کی آخری مہم میں اورنوس سلطان کا مشیر تھا۔ اس نے اسکوب (Skoplje) پر قبضہ کر کے امتیاز حاصل کیا اور مزید براں قوصوہ (Kossova) کی مہم سے قبل دشمن کو ایک درّۂ کوہ میں کچل کر رکھ دیا، چنانچہ اسی کی بدولت ترک مورَاوَا (Morava) کو عبور کر سکے۔ اس موقع پر بایزید اوّل (۱۳۸۹-۱۴۰۲ء) نے ایک ''بِرات'' مؤرخہ محرّم ۷۹۳ھ/دسمبر ۱۳۹۰ء کی رُو سے اس جاگیر پر اورنوس کے قبضے کی توثیق کی جو اس کا باپ اسے قبل ازیں عطا کر چکا تھا۔ نئے سلطان کے لیے اورنوس نے وُودِینَہ اور کِتْرُوس (Kitros) پر قبضہ کیا اور البانیا پر متعدد یورشوں کی قیادت کی۔ ۱۳۹۱ء میں اس نے المورہ کی مہم میں شرکت کی۔ ۱۳۹۶ء میں وہ جنگ نکوبولی (Niğobolu) (نیقوپولس Nicopolis) میں موجود تھا اور آقنجیوں کا قائد تھا۔ پھر نکوبولی فتح ہو جانے کے بعد اس نے البانیا میں آگے کی طرف یلغار کی اور ہنگری اور ولاشیا (Wallachia) پر حملوں میں حصّہ لیا اور یہاں اسے بایزید نے دشمن سے صلح کی بات چیت کرنے کے لیے روانہ کیا: اس کے بعد وہ یعقوب بیگ کی معیت میں المورہ (Morea) کے اندرونی علاقوں میں بڑھتا چلا گیا اور کُورِنْث (Corinth) اور قلعۂ اَرْغُوس (Argos) (۱۳۹۷ء) پر قبضہ کر لیا۔ وہ جنگ انقرہ میں شریک تھا۔ بعد ازاں عبوری دور میں اس نے سلیمان چلبی کی ملازمت اختیار کر لی اور اسے قَرَہ مان اوغلی کے مقابلے میں مدد دی، جس کا اس نے آق سرائے میں محاصرہ کر لیا۔ سلیمان کی وفات کے بعد موسٰی چلبی کی انتقامی کارروائیوں کے خدشے کے پیشِ نظر وہ یَنِیچۂ واردار میں پناہ گزیں ہو گیا اور اندھا ہونے کا بہانہ کر لیا۔ جب دونوں بھائیوں، یعنی موسٰی اور محمد میں کشمکشِ اقتدار شروع ہوئی تو اورنوس اور روم ایلی کے بیگوں نے، جو موسٰی سے غیر مطمئن تھے، محمد کا ساتھ دیا اور اسے اپنے بھائی کو مغلوب کرنے میں مدد دی۔ اورنوس ۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء میں بڑی عمر پا کر یَنِیچۂ واردار میں، جو اس کے خاندان کا مسکن بن گیا تھا، وفات پائی (یَنِیچۂ واردار کا نام اِوْرِنُوس بیگ یورِہ سی (Evrenos Beg Yoresi) پڑ گیا؛ قب اولیا چلبی، ۹: ۴۷)۔ مُراد اوّل کے عہد سے پہلے ہی اورنوس مملکتِ عثمانیہ کے سب سے بڑے جاگیرداروں میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس کی مملوکہ زمین کی وسعت افسانوی حیثیت رکھتی ہے (عالی: کُنہ، ۵: ۷۵؛ Beauséjour: *Tableau du commerce de la Grace*، ۱: ۱۱۱ بعد)۔ عثمانی مؤرّخ اس کی بے انتہا فیاضی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس نے اپنی دولت کا بڑا حصّہ خیراتی کاموں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ مِیخَال اوغُلُکری، ملقوچ اوغلری اور تُورا خان اوغُلُکری کے ساتھ، اورنوس کے اخلاف [اورنوس اوغلری] آلِ عثمان کے جنگ جُو اشراف کے چار قدیم خاندان قرار پائے۔

مآخذ: متنِ مقالہ میں محولہ تصانیف کے علاوہ (۱) عاشق پاشا زادہ، طبع عالی، ص ۵۱، ۵۳، ۵۴، ۵۷، ۵۸، ۶۰، ۶۱، ۶۳، (=عثمانلی تاریخلری، استانبول ۱۹۴۶ء، ۱: ۱۲۵-۱۲۸، ۱۳۰-۱۳۲، ۱۳۵)؛ (۲) نِشری، طبع Unat و Köymen، ج ۱ و ۲، بمواضع کثیرہ؛ (۳) *Die altosmanischen anonymen Chroniken*، مترجمۂ F. Giese، ص ۲۵، ۳۰، ۳۱، ۳۴، ۳۵، ۶۸، ۷۰؛ (۴) Chalcocondyles، مطبوعۂ بون، ص ۷۹-۸۰، ۹۷-۹۹، ۱۷۵، ۱۸۱؛ (۵) Ducas، مطبوعۂ بون، ص ۵۰؛ (۶) Phrantzes، مطبوعۂ بون، ص ۶۲-۶۳، ۸۳؛ (۷) *Epirotica*، مطبوعۂ بون، ص ۲۳۴، ۲۳۶؛ (۸) حمیدو ہبی: غازی اورنوس بیگ، در مشاہیرِ اسلام، استانبول ۱۳۰۱-۱۳۰۲ھ، ص ۸۰۱-۸۴۰؛ (۹) عثمان فرید: اورنوس بیگ خاندانینه عائد تملیک نامۂ همایون، در *TOEM*، (۱۹۱۵ء) ۶: ۴۳۲-۴۳۸؛ (۱۰) N. Jorga، در *GOR*، ج ۱، گوتھا ۱۹۰۸ء؛ (۱۱) دانشمند (I. H. Danişmend): ازاهلی عثمانلی تاریخی کرونولوجیسی (*Izahli Osmanli tarihi kronolojisi*)، استانبول ۱۹۷۴ء، ۱: ۱۲، ۲۷، ۳۹-۴۰، ۴۷، ۵۶، ۶۴، ۷۷، ۹۵، ۱۰۸، ۱۱۲، ۱۵۶، ۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۵، ؛ (۱۲) (آت، بذیل مادّۂ اورنوس (از I. H. Uzunçarşili)؛ (۱۳) گورک بلگن (T. Gokbilgin): *XV-XVI asirlarda Edirne ve Paşa livâse*، استانبول ۱۹۵۲ء، ص ۲۳، ۶۹، ۱۵۵، ۲۲۰، ۲۶۹، ۲۷۱، ۳۶۴.

(I. MÉLIKOFF)

اِوْرِنُوس اوْغُلُکری: غازی اورنوس کے سات لڑکے تھے (جن کے نام وقائع ✱ ناموں اور دستاویزاتِ وقف میں درج ہیں) اور متعدّد لڑکیاں، جن میں سے ایک کی شادی وزیر اعظم چندرلی خلیل پاشا سے ہوئی تھی۔ یہ لڑکی بایزید ثانی کے وزیر اعظم چندرلی ابراہیم پاشا کی ماں بنی، جس کے دولڑکے علی اور عیسٰی تاریخ میں مشہور ہوے۔ علی پہلے پہل اپنے باپ کے ماتحت آقنجیوں کا سربراہ مقرر ہوا اور پھر سنجاق بیگی ہو گیا۔ جس زمانے میں تختِ سلطانی خالی پڑا تھا اس نے موسٰی چلبی کی حمایت کی۔ موسٰی چلبی نے اسے اس کے باپ کے پاس بھیج دیا، جو ان دنوں یَنِیچۂ واردار (Yenidje-i-Vardar) میں عزلت گزیں تھا؛ لیکن اورنوس کے مشورے سے اس نے محمد چلبی کی ملازمت اختیار کر لی۔ محمد کی وفات کے بعد روم ایلی کے دوسرے بیگوں کی طرح اورنوس کے بیٹے بھی مدعیِ تختِ مصطفٰی دوزمہ [رک بآں] کے حامی ہو گئے، لیکن اُلُوباد (Ulubad) کے مقام پر اسے چھوڑ کر مُراد ثانی سے جا ملے۔ سلطان نے ان کا قصور معاف کر کے ان کا قبضہ اس جاگیر پر بحال کر دیا جو مُراد اوّل نے اورنوس کو عطا کی تھی۔ ۸۳۳ھ/ ۱۴۳۰ء میں جب مُراد ثانی نے سالونیکا پر یورش کی تو علی بیگ نے حملہ آوروں کو مالِ غنیمت دینے کا وعدہ کر کے [زیادہ شدت

کے ساتھ لڑنے پر] اکسایا اور ناموری حاصل کی۔ ۸۳۸ھ/ ۱۴۳۴-۱۴۳۵ء میں اس نے البانیا پر چڑھائی کی قیادت کی اور وہاں سے بہت سا مالِ غنیمت لے کر لوٹا۔ ۱۴۳۷ء میں اسے آقنجیوں کے ساتھ ہنگری میں قراولی کے لیے بھیجا گیا، جہاں سے وہ کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ ایک ماہ بعد واپس آیا اور سلطان کو ہنگری پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ۸۴۵ھ/ ۱۴۴۱ء میں اس نے بلغراد کا محاصرہ کر لیا، مگر ہنگرویوں نے آقنجیوں کو شکست دی اور ترکوں کو واپس آنا پڑا۔ جب اہل البانیا نے جارج [یا کرک] قاستریوتی (George Castriotes) اسکندر بیگ [رک بآں] (۱۴۴۳ء-۱۴۶۸ء) کے زیرِ قیادت علمِ بغاوت بلند کیا تو علی کو کئی بار ترکی فوجوں کا سالار بنا کر باغیوں کے مقابلے کو بھیجا گیا۔ ۸۶۶ھ/ ۱۴۶۲ء میں اس نے مع اپنے دو بیٹوں احمد اور اورنوس کے ولاشیا (Wallachia) پر لشکر کشی میں حصّہ لیا، جس میں وہ آقنجیوں کا سردار تھا۔ اس تاریخ کے بعد اس کی وفات ہو گئی، اس کی قبر بینیجۂ وار دار میں ہے۔

اس کا بھائی عیسٰی بیگ بھی اسی کی طرح آقنجیوں کا سردار تھا۔ ۸۲۶ھ/ ۱۴۲۳ء میں جب کہ مراد ثانی البانیا اور المورہ (Morea) پر فوج کشی کرنے والا تھا اس نے عیسٰی بیگ کو قراولی کے لیے البانیا بھیجا۔ اس نے البانیا میں کئی چھوٹے چھوٹے حملوں کی قیادت کی، مثلاً ایک دفعہ ۸۴۱ھ/ ۱۴۳۸ء میں اور دوسری دفعہ ۸۴۶ھ/ ۱۴۴۲ء میں۔ ۸۴۷ھ/ ۱۴۴۳ء کو وہ جَلْوَتَرْ (Jalovats) کی جنگ میں موجود تھا۔ محمد ثانی کے عہدِ حکومت میں اس نے ۸۵۸ھ/ ۱۴۵۴ء میں سربیا پر چڑھائی میں حصّہ لیا اور ایک چھوٹے سے قلعے تِرِبَجِہ (Tirebdje) پر قبضہ کر لیا۔ اس کے اگلے سال اسے البانیا میں فوج دے کر روانہ کیا گیا، جہاں اس نے بِرات (Berat) کے مقام پر اسکندر بیگ کو مغلوب کیا۔ ۸۶۷ھ/ ۱۴۶۳ء میں وہ المورہ میں پیش آنے والے ان واقعات میں شریک تھا جو ترکی اور وینس کے درمیان چھڑ جانے پر منتج ہوئے۔ ۸۸۴ھ/ ۱۴۷۹ء میں اس نے علی اور اسکندر میخال اوغلی اور بالی مَلْقوچ اوغلی کی معیّت میں ٹرانسلوانیا پر فوج کشی کی، جس کا خاتمہ ترکوں کے قتلِ عام پر ہوا۔ ترک مالِ غنیمت جمع کر رہے تھے کہ حریف ان پر اچانک بے خبری میں آ پڑا اور وائیوود (voīvode) سٹیفن باتھور (Stephen Bàthore) نے انھیں کچل کر رکھ دیا۔ اس تاریخ کے بعد اس کی وفات ہو گئی۔ اس کی قبر بینیجۂ وار دار میں ہے اور یہیں اس کی تعمیر کردہ مسجد اور ایک عمارت بھی ہے۔

علی اورنوس اوغلی کے دو بیٹے شمس الدین احمد اور اورنوس اپنے باپ کے ساتھ ۸۶۶ھ/ ۱۴۶۲ء میں ولاشیا کی مہم میں شریک تھے۔ اورنوس کو مولداوہ (Moldavia) کی سرحد پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ شمس الدین احمد، جس کا متعدّد سرکاری دستاویزات میں ذکر آتا ہے، ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۶ء میں تِرِکَلَہ (Trikkala) اور پھر سِمَنْدِرِیَہ کا سنجاق بیگی مقرّر رہا۔ ۸۸۳ھ/ ۱۴۷۸ء میں اس نے البانیا میں شکودُرَہ کے محاصرے میں حصّہ لیا اور بعد ازاں اسے اس قلعے کی محافظ فوج کا سردار بنا دیا گیا۔ اپنی وفات (۹۰۳ھ/ ۱۴۹۸ء) سے ایک سال قبل اس نے ایک وقف قائم کیا، جس کا متولّی اس نے اپنے بیٹے موسٰی کو مقرّر کیا۔ اس کے دوسرے دو بیٹے عیسٰی اور سلیمان ۸۹۳ھ/ ۱۴۸۸ء میں مملوکوں کے خلاف لڑتے ہوئے جنگِ آغا چایری میں کام آ چکے تھے۔

نویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اورنوس کے اخلاف میں جن لوگوں کے نام ملتے ہیں ان میں سب سے نمایاں نام عیسٰی بن اورنوس کے بیٹے محمد کا ہے، جو اِیلْبَصان (Elbasan) کا سنجاق بیگی تھا اور اس نے ۹۰۷ھ/ ۱۵۰۲ء میں دُراج (Durazzo) پر قبضہ کیا تھا۔ ایک اَور ممتاز نام خضر شاہ بن اورنوس کے پوتے یوسف کا ہے، جو سلیم اوّل کی مصر پر فوج کشی میں شریک تھا۔ خاندان اورنوس نے روم ایلی پر حملوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا، لیکن یہ لوگ دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے وسط کے بعد قائدینِ عساکر کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو بیٹھے۔ اس خاندان نے عثمانی سلطنت کے عروج میں بڑا حصّہ لیا اور اس کی پُوری تاریخ کے دوران میں یہ اس اعتبار سے انتہائی سربرآوردہ خاندان رہا کہ ایک تو اس کے قبضے میں وسیع املاک تھیں اور دوسرے اس کے اندر بہت سے سیاست دان پیدا ہوتے رہے۔

[اس خاندان کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے:]

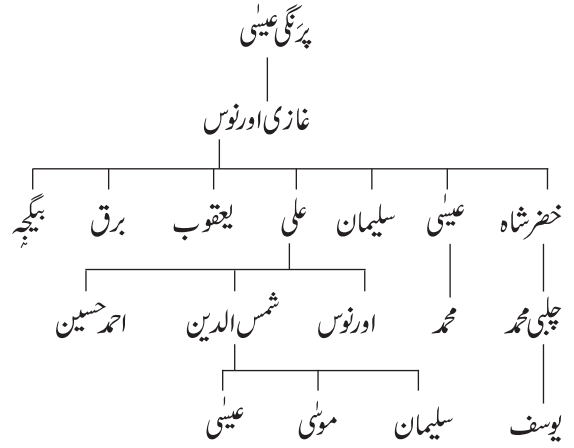

مآخذ: (۱) عاشق پاشا زادہ، طبع عالی، ص ۸۴، ۱۰۶، ۱۱۸، ۱۲۳-۱۲۴، ۱۶۲، ۲۲۴ (=عثمانلی تاریخ لری، استانبول ۱۹۴۶ء، ۱: ۱۴۸، ۱۵۷-۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۴، ۱۷۳، ۱۷۶-۱۷۷، ۱۹۶)؛ (۲) نشری، Unat و Köymen، ۲: ۵۵۷، ۵۶۱، ۵۶۳، ۵۶۷، ۵۷۹، ۶۱۱، ۶۲۱-۶۲۳؛ (۳) *Die altosmanischen anonymen Chroniken*، مترجمۂ F. Giese، ص ۷۵، ۷۹، ۸۸-۸۹؛ (۴) ابن کمال: تواریخِ آلِ عثمان، دفتر ہفتم، طبع ش-توران، انقرہ ۱۹۵۴ء، ص ۲۱۵، ۲۱۹، ۶۰۸-۶۰۹؛ (۵) Dursun Beg: تاریخِ ابو الفتح، در *TOEM* ضمیمہ، استانبول ۱۳۳۰ء، ص ۱۰۵؛ (۶) Chalcocondyles، نسخۂ بون، ص ۱۸۱، ۲۱۷-۲۱۹، ۲۴۷، ۲۵۰-۲۵۱، ۲۵۷، ۳۰۸، ۴۳۲، ۴۴۸-۴۵۰؛ (۷) Ducas، نسخۂ بون، ص ۱۹۷؛ (۸) حمید وہبی: اورنوس زادہ علی بیگ، در مشاہیر اسلام، استانبول ۱۳۰۱-۱۳۰۲ھ، ص ۹۴۵-۹۴۶؛ (۹) N. Jogra، در *GOR*، ج ۱ و ۲، گوتھا ۱۹۰۸-۱۹۰۹ء؛ (۱۰)

L. Albanie et l' invasion turque au XVe siécle: A. Gegaj، پیرس ۱۹۳۷ء؛ (۱۱) دانشمند (I. H. Danismend): از اهلی عثمانلی تاریخی کرونولوجوسی (Izahli osmanli Tarihi Krono-lojisi)، استانبول ۱۹۴۷ء، ۱: ۱۸۹، ۱۹۰، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۶، ۲۰۹، ۲۲۰، ۲۷۵، ۲۷۹، ۲۸۱، ۳۰۲، ۳۴۱، ۳۴۳، ۴۱۰؛ (۱۲) آ، ت، بذیل مادّۂ اورنوس اوغللری، از اوزون چرشلی.

(I. MELIKOFF)

---

* **اُورُوج**: ایک قدیم عثمانی مؤرّخ، جو عادل نامی ریشم کے ایک تاجر کا بیٹا تھا اور پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں غالباً اِدِرنہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی زندگی کے متعلّق ہم ابھی تک فقط اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ غالباً اپنے آبائی شہر میں بطورِ کاتب ملازم تھا۔ وہ کہاں اور کب فوت ہوا؟ یہ کہیں مذکور نہیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کی جن منثور تواریخ کا اب تک علم ہوسکا ہے ان میں سے قدیم ترین تاریخ کا مصنّف اُوُروج بن عادل ہے۔ اس کی اس تصنیف میں، جو تواریخ آلِ عثمان کے نام سے موسوم ہے، عثمانی تاریخ کے حالات ابتدا سے سلطانِ فاتح محمد ثانی کے عہدِ حکومت تک دیے گئے ہیں۔ [اس کتاب میں] وہ جہاں اپنے چشم دید حالات بیان نہیں کرتا وہاں قدیم تر مآخذ پر اعتماد کرتا ہے، جن میں ہمارے نزدیک اہم ترین ماخذ بَخشی فَقِیہ کا مناقِب نامِہ ہوگا۔ چونکہ اس تاریخ کے متن کی بہت سی عبارتیں کسی بعد کے نامعلوم مصنّف کی تاریخ آلِ عثمان سے لفظ بلفظ ملتی ہیں لہٰذا دونوں کتابوں کا ماخذ غالباً ایک ہی ہے۔ محمد ثانی کے عہدِ حکومت کے واقعات کا بیان نسبتاً زیادہ مکمل ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قریب کے شہر ادرنہ میں رہتے ہوئے ذاتی طور پر ان واقعات میں سے گزرا تھا۔ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ اس نے اپنے تاریخی وقائع آخر میں کہاں تک لکھے تھے؟ کیونکہ وہ مخطوطہ جو ۱۹۲۷ء میں F. Babinger نے بوڈلین لائبریری (Rawl. Or.، عدد ۵) میں دریافت کیا تھا آخر میں ناقص ہے اور دوسرا مخطوطہ بھی، جو بعد میں اگرم (Agram) کی جنوبی سلاف اکیڈمی (South Slav Academy) میں دریافت ہوا تھا (Coll. Babinger، عدد ۶۷۳، جلد اوّل)، قبل از وقت منقطع ہوجاتا ہے۔ [مخطوطۂ] اوکسفرڈ کے متن کا ایک اڈیشن F. Babinger نے کیمبرج کے ایک دوسرے نسخے کے ساتھ Quellenwerke desislamischen schrifttums، جلد ۲، ۱۹۲۵ء، میں بعنوان Die frühosmanischen Jahrbücher des Urudsch، شرح (Nachtrag) (ہانوور ۱۹۳۶ء) اور تصحیحات و ترمیمات کے ساتھ شائع کیا ہے.

مآخذ: F. Babinger، در GOW، ص ۲۳ ببعد، جہاں مزید تفصیلات دی ہوئی ہیں.

(FRANZ BABINGER)

---

* **اَورِیُس** (Aurès)، رک بہ اَوراس.

---

* **الاَوزَاعی**: ابوعمرو عبدالرحمٰن بن عمرو، [تولّد ۸۸ھ/ ۷۰۷ء] شام میں فقہ اسلامی کے سب سے بڑے نمائندے۔ ان کی نسبت دمشق کے ایک نواحی قصبے الاَوزاع سے ہے، جس کا یہ نام [غالباً] جنوبی عرب کے کسی قبیلے یا مجموعۂ قبائل (اَوزاع) کے نام پر ہوگیا تھا جو وہاں آباد تھا (ابن عساکر: تَأرِیخ دمشق، طبع المُنَجِّد، ۱۹۵۴ء، ۲: ۱۴۴؛ یاقوت، ۱: ۴۰۳ ببعد)، [لیکن بقول ابن حزم وہ قبیلۂ الاوزاع میں سکونت کی وجہ سے الاوزاعی مشہور ہوے، حالانکہ اس قبیلے میں سے نہ تھے (جَمْہرۃ انساب العرب، ص ۴۳۵، و ۴۳۷)۔] اُن کے اجداد میں سے ایک شخص یمن میں قیدی بنا لیا گیا تھا (المسعودی: مُرُوج، ۶: ۲۱۴)۔ بظاہر وہ دمشق میں پیدا ہوے تھے [بعلبک، قب الاعلام، ۴: ۹۴، طبع دوم] اور انھوں نے اپنی تعلیم کا کم از کم کچھ حصّہ یَمامَہ میں مکمّل کیا اور وہیں وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ بعد میں وہ بیروت چلے گئے اور وہیں ۱۵۷ھ/ ۷۷۴ء میں تقریباً ستّر سال کی عمر پا کر فوت ہوے۔ انھیں بیروت کے نواحی گاؤں حَنْتُوس میں دفن کیا گیا، جہاں زائرین اب بھی ان کے مزار پر جاتے ہیں (Haffening، ص ۱۴۸، حاشیہ ۴)۔ [الاوزاعی نے امام زُہری اور مفتیِ مکہ عطاء بن رباح سے حدیث بیان کی، اور امام مالک بن انسؒ اور سفیان الثوریؒ نے ان سے حدیث روایت کی.]

الاَوزَاعی کی تصنیفات، جنھیں وہ اپنے شاگردوں کو لکھوا دیتے تھے اور جن میں سے کِتاب السُّنَن فِی الفِقْہ اور کِتاب المَسَائل فی الفِقْہ کا تذکرہ الفِہرِست میں آیا ہے، اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہیں۔ ان کی مُسْنَد (حاجی خلیفہ، طبع فلوگل (Flügel)، شمارہ ۱۲۰۰۶) اس نوع کی دوسری تصانیف کی طرح غالباً بعد کے زمانے میں تالیف ہوئی، تاہم الاَوزاعی کی آرا حسب ذیل کتب میں بکثرت منقول ہیں: (۱) ابو یوسف: الرَّدّ عَلٰی سِیَرِ الاَوْزَاعی (طبع قاہرہ ۱۳۵۷ھ؛ نیز الشافعیؒ کے ملاحظات کے ساتھ، جو ان کی اپنی تصنیف کتاب الاُمّ، طبع بولاق ۱۳۲۵ھ، ۷: ۳۰۳-۳۳۶ میں درج ہیں؛ قب حاجی خلیفہ، طبع فلوگل (Flügel)، شمارہ ۲۵۱)۔ یہ کتاب ان خیالات کے ردّ میں ہے جو الاَوزاعی نے [امام] ابوحنیفہؒ کی بعض آرا کے متعلق ظاہر کیے تھے۔ الاَوزاعی کی کتاب السِّیَر کا ایک اصلی نسخہ، جو ان کے ایک شاگرد نے تیار کیا تھا، گیارھویں/سترھویں صدی عیسوی میں بھی موجود تھا (Haffening، ص ۱۴۹ ببعد)؛ (۲) الطَّبَری: کتاب اِختِلاف الفُقَہاء (طبع کِرن (F. Kern)، قاہرہ ۱۹۰۲ء و طبع J. Schacht، لائڈن ۱۹۳۳ء).

الاوزاعی کی آرا میں بالعموم [فقہی مسائل کے] وہ قدیم ترین حل ملتے ہیں جو آگے چل کر فقہا نے اختیار کر لیے تھے۔ ان کے مذہب کی قدیم نوعیت سے — اگرچہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے ہم عصر تھے — یہ گمان گزرتا ہے کہ انھوں نے اپنے سے ایک پشت پہلے کے ان پیش رووں کی تعلیمات کو محفوظ رکھا ہے جن کے ہم محض ناموں سے واقف ہیں۔ ان کا منظّم طریقِ استدلال بہت واضح ہے، ان کے استدلال پر ''تواترِ سنّت'' کے اصول کا غلبہ نظر آتا ہے۔ ''تواترِ سنّت'' سے ان کی مراد وہ تعامُل ہے جو حضرت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وقت سے شروع ہوا

اور جسے خلفاے راشدینؓ نے قائم رکھا اور ان کے بعد بھی قائم رہا۔ یہی سنتِ رسولؐ ہے، خواہ وہ رسول اللہؐ سے مروی با قاعدہ احادیث میں مذکور ہو یا نہ ہو...۔

الاَوْزاعی سارے اموی عہد کو خیر القرون میں شمار کرتے ہیں۔ سنّت کے اس تصوّر اور بعض دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے الاَوْزاعی کا مذہب قدیم عراقی فقہا کے مسلک کے بہت قریب آجاتا ہے۔

الاَوْزاعی کے ہاں بنواُمیّہ کی مخالفت کا وہ میلان کہیں نظر نہیں آتا جو بنو عبّاس کے عہد میں بہت عام ہوگیا تھا، بلکہ اس کا امکان ہے کہ بنوعبّاس کی جانب الاَوْزاعی کا رویّہ سرد مہری کا رہا ہو (قب Barthold، در *Isl.*، ۱۸: ۲۲۴)۔ انھیں بنوعبّاس کے زمانے میں بھی احترام نصیب تھا، خصوصًا المہدی کے ہاں۔ وہ درخواستیں جو الاَوْزاعی نے سیاسی قیدیوں کی طرف سے المہدی کو اس کے زمانۂ شہزادگی میں یا خلیفہ المنصور اور دربارِ عبّاسی کے دوسرے بارسوخ اشخاص کے نام لکھیں (ابن ابی حاتم: تَقْدِمة المَعْرِفَة، ص ۱۸۷ بعد) بلاشبہہ اصلی ہیں۔ اس بیان کو کہ ابن سُراقہ (اموی خلیفہ ولید ثانی اور عبّاسی خلیفہ عبداللہ بن علی کے عہد میں والی دمشق؛ قب الصَّفَدی: اُمَراء دمشق، طبع المُنَجِّد، دمشق ۱۹۵۵ء، ص ۵۵) نے الاَوْزاعی کو بیروت سے دمشق بلایا تھا (ابن ابی حاتم: وہی کتاب، ص ۱۸۷) ان قلیل معلومات سے مطابقت دینا دشوار ہے جو ہمیں الاوزاعی کے سوانح حیات کے بارے میں حاصل ہیں۔

یاقوت (۱: ۷۸۵ بعد، بذیل بیروت) نے الاوزاعی کے کئی شاگردوں کا ذکر کیا ہے، جن میں الولید بن مَزْیَد (م ۲۰۳ھ) کو امتیاز حاصل ہے۔ جس طرح فقہ اسلامی کے دوسرے دبستان ائمہ سے منسوب ہوے اسی طرح قدیم شامی فقہ کا دبستان الاوزاعی کے نام سے منسوب ہوا۔ یہ مذہب نہ صرف شام بلکہ المغرب حتّٰی کہ اندلس میں بھی رائج ہوگیا، تا آنکہ مالکی مذہب نے المغرب میں تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کے وسط میں اور شام میں چوتھی/دسویں صدی کے آخر میں اس کی جگہ لے لی (J. Lopez Ortiz: *La recepeiòn de la escuela malequi en espeña*، میڈرڈ ۱۹۳۱ء، ص ۱۶ بعد؛ R. Castejon: *Los juristas hispano-musulmanes*، میڈرڈ ۱۹۴۸ء، ص ۳۲، ۴۳ بعد؛ Haffening، ص ۱۴۸؛ Barthold، وہی کتاب)۔ [الاوزاعی کے فتوے اندلس میں حکم بن ہشام کے زمانے تک چلتے رہے۔ اندلس میں ان کا نام امالے کے ساتھ اوزیعی (Auzü یا Aowzei) لیا جاتا تھا (قب بحوالۂ سابق)۔]

مآخذ: (۱) ابن سَعْد، ۷/ ۲: ۱۸۵؛ (۲) الفہرست، ۱: ۲۲۷؛ (۳) ابن قُتَیبہ: المعارف، طبع وُسٹنفِلڈ (Wüstenfeld)، ص ۲۴۹؛ (۴) الطَّبَری، ۳: ۲۵۱۴؛ (۵) ابن ابی حاتم الرَّازی: تَقْدِمَة المَعْرِفَة، حیدرآباد (دکن) ۱۹۵۲ء، ص ۱۸۴ بعد؛ (۶) وہی مصنّف: کتاب الجَرْح و التَعْدِیل، حیدرآباد (دکن) ۱۹۵۳ء، ۲/ ۲: ۲۶۶ بعد؛ (۷) اَبُونُعَیم: حِلْیَة الاَوْلیاء، قاہرہ ۱۹۳۶ء، ۶: ۱۳۵ بعد؛ (۸) السَمْعَانی، ورق ۵۳ راست؛ (۹) ابن عساکر: تاریخ دِمَشْق، (مخطوطہ، قب یُوسُف العِشّ: فِهْرِس مَخطُوطات دَار الكُتُب الظاهرية (تاریخ)، دمشق ۱۹۴۷ء، ص ۱۱۳؛ (۱۰) النَّوَوی: تَہذِیب الاَسماء، طبع وُسٹنفِلڈ، گوٹنگن ۱۸۴۲ - ۱۸۴۷ء، ص ۳۸۲ بعد؛ (۱۱) ابن خَلّکان: وَفَیات الاَعْیان، بذیل مادّۂ عبدالرحمٰن [۱: ۲۷۵]؛ (۱۲) الذَّہبی: تَذْکرة الحُفّاظ، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۳ھ، ۱: ۱۶۸ بعد؛ (۱۳) ابن کَثِیر: البِدایَة وَ النِّہایَة، قاہرہ ۱۳۵۱ - ۱۳۵۸ھ، ۱۰: ۱۱۵ بعد؛ (۱۴) ابن حَجَر العَسْقَلانی: تَہذِیب التَّہذِیب، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۶ھ، ۶: ۲۳۸ بعد؛ (۱۵) نامعلوم مصنّف: مَحاسِن المَساعِی [فی مناقب الاوزاعی]، طبع شَکِیب اَرْسلان، قاہرہ ۱۳۵۲ھ (دیکھیے O. Spies، در *ZS*، ۱۹۳۵ء، ص ۱۸۹ بعد؛ (۱۶) W. Haffening: *Dasislamische Fremdenrecht*، ہانوور ۱۹۲۵ء، ص ۱۴۸ بعد؛ (۱۷) O. Spies: *Beiträge zur arabischen Literaturgeschichte*، لائپزگ ۱۹۳۲ء، ص ۵۲ بعد؛ (۱۸) J. Schacht: *The Origins of Muhammadan Jurisprudence*، طبع ثانی، اوکسفرڈ ۱۹۵۳ء، اشاریہ، بذیل مادّۂ اوزاعی؛ [(۱۹) شذرات، ۱: ۱۴۱؛ (۲۰) احمد امین: ضحی الاسلام ۲: ۹۸ - ۱۰۱؛ (۲۱) براکلمان، تعریب، ۳: ۳۰۷ و ۳۰۸].

(J. SCHACHT و [ادارہ])

اُوْزُون حَسَن: [امیر کبیر ابوالنَّصر حَسَن بیگ]، ترکمانوں کے ایک خانوادۂ شاہی آق قویُونلو (جس کا بانی بایَنْدُر تھا) کا ایک امیر، ۸۵۸ھ [/ ۱۴۵۴ء] سے دِیارِ بَکْر کا حاکم اور بعد ازاں (۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷-۱۴۶۸ء] - ۸۸۲ھ [۱۴۷۷-۱۴۷۸ء] ایک طاقتور ریاست کا بادشاہ، جو اَرْمینیا، الجزیرہ (میسوپوٹیمیا Mesopotamia) اور ایران پر مشتمل تھی۔ حسن بیگ بن علی بیگ بن قَرہ عثمان [= قرہ یُولُوق] کا عرف اس کے قد و قامت کی بنا پر اُوْزُون (= طویل القامت) ہوگیا۔

اُوْزُون حسن کا دورِ حکومت نہایت اہم ہے، لیکن اس کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں۔

ترکمان قبائل کی باہمی رقابت: خانوادۂ بایَنْدُر کے امرا اور ان کے ترکمان قبیلے آق قویُونلو (= سفید بھیڑوں والے) ابتداءً (تیمور کے عہد سے بھی پہلے سے) دِیارِ بَکْر میں تھے۔ وہاں سے یہ لوگ مغرب، شمال اور مشرق کی طرف پھیل گئے۔ شروع شروع میں آق قویُونلو کے سب سے بڑے حریف قرہ قویُونلو [= کالی بھیڑوں والے] قبیلے کے ترکمان تھے۔ مذہبی اختلاف کی بنا پر ان کی باہمی رقابت میں اَور بھی اضافہ ہوگیا تھا، کیونکہ آق قویونلو سنّی تھے اور قرہ قویونلو شیعہ۔

قرہ عُثمان نے، جو بڑا عالی ہمت اور مستعد شخص تھا، ۸۳۸ھ/ ۱۴۳۴-۱۴۳۵ء میں وفات پائی۔ اس کے بیٹے علی بیگ نے اپنا دورِ حکومت اپنے بھائی حمزہ سے جنگ و جدال میں گزارا اور اس سلسلے میں عثمانی سلطان مُراد ثانی اور مصر کے سلطان [الملک الظاہر اَبُوسَعِید] چَقْمَق سے بھی امداد طلب کی۔ ان دونوں بھائیوں کے انتقال کے بعد جہانگیر بن علی نے قرہ قویونلو کے خلاف پھر جنگ جاری کردی، لیکن اس کے رویّے سے اس کا بھائی اُوْزُون حسن، چچا قاسم بیگ (جسے

Hammer v.، ۱: ۵۰۶، نے حسن لکھا ہے) اور ارزِنجان کا حاکم قلیچ آرسلان بن پیر علی ناراض ہو گیا۔ جہانگیر کے ساتھ جھگڑے کے باوجود اُوزُون حسن نے اس کے دونوں حریفوں کو شکست دی اور اس کے بعد کردستان کے بیگوں کی ''کثیر تعداد'' کو بھی مغلوب کر لیا۔ اُوزُون حسن نے جب سنا کہ جہانگیر اپنی موسم گرما کی چھاؤنی آلا طاغ کی طرف روانہ ہو گیا ہے (غالبًا اس نام کا اشارہ اس پہاڑ کی طرف ہے جو قدیم ایام میں مازیوس (Masius) کہلاتا تھا اور دیار بکر اور مارِدِین کے درمیان واقع ہے) تو وہ بھیس بدل کر قلعۂ دِیار بکر (آمد) میں داخل ہو گیا اور یوں جہانگیر کو مارِدِین [رک بآن] میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ واقعہ ۸۵۸ھ/ ۱۴۵۴ء کا ہے۔ حسن نے جلد ہی الرُّھا پر قبضہ کر کے مارِدِین کا محاصرہ کر لیا (قب عاشق پاشازادہ، ص ۲۴۷-۲۴۹؛ منجم باشی، ۳: ۱۵۷)۔

حسن کی والدہ ایک مدبّر خاتون تھی اور اس نے واقعاتِ مابعد میں بھی نمایاں حصّہ لیا۔ اس کی دخل اندازی کے باعث اُوزُون حسن دِیار بکر لوٹ جانے پر مجبور ہو گیا۔ حسن نے اس کی تلافی کی خاطر قرہ قویونلو کے علاقے (ارزِ روم، اَوِنیک اور بایبورد) پر چڑھائی کر دی، لیکن ارزِنجان فتح کرنے میں ناکام رہا اور دیار بکر واپس ہو گیا۔

ارزنجان کے دوبارہ محاصرے کے وقت اوزون حسن اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور بری طرح مجروح ہو گیا۔ جہانگیر نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر آمد کے قرب و جوار کو لوٹ لیا، لیکن حسن کی واپسی پر وہ قرہ قویونلو جہان شاہ کے پاس پناہ گزیں ہو گیا۔ اس کی والدہ نے اس بار پھر حسن کو دِیار بکر میں متمکن کر دیا اور جہانگیر کو مارِدِین میں؛ لیکن جلد ہی یہ کشمکش دوبارہ بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی۔ حسن نے ارزِنجان اور تُرجان پر حملہ کر کے اپنے بھائی کے عامل عربشاہ کو وہاں سے نکال دیا اور پھر خراسان اور (دِیار بکر کے شمال مغرب میں) قرہ جہ طاغ پر حملہ کیا۔ قرہ قویونلو جہان شاہ نے اپنے امیروں کو جہانگیر کی امداد کے لیے بھیجا، لیکن اُوزُون حسن نے انھیں ۸۶۱ھ/مئی ۱۴۵۷ء؟) (قب ابن تغری بردی، طبع Popper، ۷: ۴۸۵) میں شکست دی اور جہانگیر نے اپنا بیٹا بطور یرغمال اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے ایک دوسرے بھائی (اویس الرُّھاوی) نے بھی اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اوزون حسن نے امیر خورشید بیگ کو (جو غالبًا اس کا ابنِ عم تھا؛ قب منجم باشی، ۳: ۳۷۶) ارزِنجان کا حاکم بنا دیا۔ یہ قلعہ سطح مرتفع اَرزِنجیا کی کلید تھا۔ اسی زمانے میں اوزون حسن نے قرہ قویونلو حسن علی کو اپنے ہاں پناہ دی، جس نے اپنے باپ جہان شاہ کے خلاف بغاوت کی تھی، لیکن جلد ہی اس کے ملحدانہ عقائد کی بنا پر اپنے ہاں سے نکال دیا۔ یہ واقعات ۸۵۸ھ [/ ۱۴۵۴ء] سے ۸۶۱ھ [/ ۱۴۵۶-۱۴۵۷ء] تک رونما ہوئے۔ اس کے بعد بڑی سرعت کے ساتھ حسن کے عروج اور قرب و جوار کے علاقوں میں اس کے اثر و رسوخ کے پھیلنے کا دور شروع ہوتا ہے۔

کُردستان میں فوجی کارروائیاں: اوزون حسن نے دریاے دجلہ کے کنارے قلعۂ حصن کَیفا امیّو بی خاندان کے کُرد ملکوں (قب شرف نامہ، ۲: ۱۴۹-۱۵۵) سے چھین کر اپنے فرزند خَلیل کو دے دیا۔ اس کے بعد سِعِرت اور بِتْلِس (علاقۂ بختان) پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا (قب نیز شرف نامہ، ۲: ۹)۔

اوزون حسن قَرہ مان اور طَرابُزون میں: اوزون حسن کو جو کامیابیاں مغربی علاقوں میں حاصل ہوئیں ان کی بنا پر اس کا تصادم عثمانی ترکوں سے بھی ہو گیا، جو حال ہی میں [سلطان] محمد ثانی کی زیرِ قیادت ایشیائے کوچک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مغلوب کر کے فارغ ہوئے تھے۔ قَرہ مان [رک بآن] کے امیروں نے، جنھیں ترکوں کی طرف سے بہت خطرہ تھا، اپنے مشرقی ہمسائے اوزون حسن سے اتّحاد کی کوشش کی، لیکن اس وقت اوزون حسن طرابزون کی مملکت کے معاملات میں الجھا ہوا تھا، جو اب قریب قریب ختم ہو رہی تھی۔ ۱۴۵۸ء میں طرابزون کے آخری بادشاہ ڈیوڈ نے اوزون حسن کو اپنی بھتیجی، یعنی اپنے بھائی اور پیش رو بادشاہ کالو ایوانس (Kalo-loanes) کی بیٹی کیتھرائن (Catherine) بیاہ دی (جو یورپ میں اکثر اپنے لقب ڈسپینا (Despina) سے معروف ہے؛ قب وینسی سیّاحوں کے نوشتے)۔ طرابزون کا علاقہ گرجستان سے منسلک تھا اور وینس اور روم کی حکومتیں ان دونوں مسیحی ریاستوں کے احوال پر بڑی کڑی نظر رکھتی تھیں... (نیز قب W. Miller: *Trebizond , the last Greek Empire*، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ Uspensky: *Očerki po istorii Trapez. imperii*، لینن گراڈ ۱۹۲۹ء)۔

اوزون حسن نے ۱۴۵۷ اور ۱۴۶۰ء میں جو سفارتی وفود قُسطنطِینیہ بھیجے ان سے سلطان پر اپنے حریف کے عزائم واضح ہو گئے (قب Hammer v.، ۱: ۴۶۴-۴۶۶)۔ اوزون حسن نے اس کا عملی ثبوت بھی جلد ہی پیش کر دیا اور وہ یوں کہ اس نے اچانک یورش کر کے قلعۂ قویُونلو حِصار (یا قویُلحصار، جو نِیکسار [موجودہ قیساریہ] کے شمال میں کِلکِیت صُو کے کنارے واقع تھا) فتح کر لیا اور ساتھ ہی توقات [= توقاد] اور اماسیہ کے نواح کو بھی تاراج کر دیا (قب مُنجّم باشی، ۳: ۳۷۶)۔

سلطان محمد ثانی نے سِنوپ کے حاکم اِسفَنْد یار اُوغْلُو [رک بآن] کو مغلوب کر کے اپنی توجہ طرابزون اور قویُونلو حِصار کی طرف منعطف کی۔ اوزون حسن نے اپنی فوجیں کِمَاخ کے قریب جمع کیں، لیکن جو دستہ جبالِ مُنْزُور (سعد الدین، ۱: ۴۷۶، میں کوہِ مندز؟) کی طرف بھیجا گیا تھا اسے احمد پاشا نے شکست دے دی۔ اس پر اوزون حسن نے اپنی والدہ کو گفت و شنید کے لیے بھیجا اور اس کی التجا پر سلطان نے بُلْغَار طاغ کی طرف رخ کر دیا (جو گِرْجَانِس کے مشرق میں کِلکِیت صُو اور فرات کے مابین واقع ہے)۔ سَارَہ خاتون کی (جسے سلطان ماں کہتا تھا) بار بار التجا کے باوجود اور یہ کہنے پر بھی کہ طرابزون اس کی بہو کی ملکیت ہے، سلطان نے ۸۶۵ھ/ ۱۴۶۱ء میں اس شہر پر قبضہ کر لیا اور کومنی نوی (Comme-Noi) (شاہانِ طرابزون کا لقب) کو معزول کر کے جلا وطن کر دیا؛ طرابزون کے مالِ غنیمت کا ایک حصّہ سَارَہ خاتون کو دے دیا گیا (عاشق پاشازادہ، ص ۱۵۹-۱۶۰؛

سَعْدالدّین و مُنَجِّم بَاشی، ۳:۳۷۶).

یہ صلح تھوڑی مدت کے لیے قائم رہ سکی، کیونکہ بقول مُنَجِّم بَاشی (۳:۱۶۰-۱۶۱) اوزون حسن نے قویُونْلو حِصار پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور سِیْو اس کے مضافات تک بڑھتا چلا گیا، لیکن عثمانیوں نے اس کی ان فوجوں کو شکست دے دی جو ایشیاے کوچک میں داخل ہوگئی تھیں۔ اوزون حسن نے ترکمان قیدیوں کو چھڑانے کے لیے خورشید بیگ کو فدیہ دے کر قسطنطینیہ بھیجا اور سلطان سے گزارش کی کہ وہ طرابزون سے دست بردار ہوجائے (!؟)۔ کہا جاتا ہے کہ ''اقتضاے وقت'' کے تحت یہ درخواست منظور ہوگئی (!؟) اور اوزون حسن اِرْزِنْجان اور وہاں سے دیاربَکْر کو واپس چلا گیا (اس مقام پر ۱۴۶۱ء کے واقعات کے بارے میں مُنَجِّم بَاشی کا بیان قدرے مختلف انداز کا نظر آتا ہے).

جِہان شاہ اور ابوسعید تیموری کی وفات: اوزون حسن کو بہت جلد نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ۸۷۱ھ/۱۴۶۶-۱۴۶۷ء میں اس کا حریف جہان شاہ قَرَہ قویُونْلو، جو اس وقت پورے ایران کا مالک تھا، دیاربَکْر پر حملہ آور ہوا۔ اس کے عزائم کا اندازہ اس خط سے ہوتا تھا جو اس نے [سلطان] محمد ثانی کو بھیجا تھا (فَرِیْدُون بے، ۱:۲۷۳)۔ اوزون حسن نے اپنی فوجیں جمع کیں۔ ادھر مارْدِیْن سے بھی کمک آپہنچی۔ یکم ربیع الثانی ۸۷۲ھ کو جِہان شاہ، مُوش اور چَپَاخ چُور پہنچ چکا تھا۔ یہاں اوزون حسن کے بیٹے خلیل نے اس کی ہَراوَل فوج کو شکست دی۔ چونکہ جِہان شاہ نے سخت سردی کی بنا پر اپنی فوج کے بیشتر سپاہیوں کو ان کے گھر واپس کر دیا تھا، اس لیے وہ کِیْغِی کی طرف ہٹ گیا، جہاں سے اس کا ارادہ اِرْزِنْجان اور وادی بالا رُوْد (کِلْکِیْت؟) کی طرف بڑھنے کا تھا، لیکن اوزون حسن نے ۱۳ ربیع الثانی ۸۷۲ھ/۱۱ نومبر ۱۴۶۷ء کو اچانک اس پر حملہ کر دیا اور جِہان شاہ فرار کی کوشش میں تھا کہ مارا گیا۔ اس طرح مشرق کی طرف میدان صاف پا کر اوزون حسن نے وہ علاقے فتح کرنے شروع کر دیے جن کا اب کوئی مالک نہ رہا تھا۔ وہ موصل ہوتا ہوا بَغْداد پہنچا اور چالیس روز تک اس کا محاصرہ کیے رہا۔ اُدھر آذربیجان میں جِہان شاہ کے بیٹے حسن علی نے ایک کثیر فوج (بروے حبیب السِّیَر، ۳: ۲۳۴، ایک لاکھ اسّی ہزار) اکٹھی کرلی تھی۔ مزید براں اس نے (سلطان) ابوسَعِیْد تِیْمُوری سے بھی استمداد کی، چنانچہ وہ بھی خراسان سے شعبان ۸۷۲ھ/اپریل ۱۴۶۸ء میں چل پڑا اَور اس نے پورے عراقِ فارس کے لیے عمّال کا تقرّر کر دیا۔ حسن علی کی جو فوجیں مَارَنْد میں پڑی ہوئی تھیں وہ اس کے بعض امرا کی غدّاری کی وجہ سے منتشر ہوگئیں اور اُوْزُوْن حسن اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر قَرَہ باغ [رَکْ بآن] تک بڑھ گیا۔ اس اثنا میں اس نے بار بار تیموریوں کے ساتھ آق قویونلو قبیلے کی قدیم نیازمندی کا ذکر کر کے دوستی کی التجا کی، لیکن اس کے باوجود ابو سعید میَانَہ پہنچ گیا، جہاں اسے موسمِ سرما نے آلیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ قَرَہ باغ ہی میں سردی کے دن گزارے، جہاں سے وہ اوزون حسن کو نکال دینا چاہتا تھا، لیکن دریاے جیحون (Araxes) کی طرف پیش قدمی اس کے لیے بڑی تباہ کن ثابت ہوئی اور مَحْمُود آباد (قبؔ مُوْقَان) میں اُوْزُوْن حسن نے اس کی ناکہ بندی کر دی۔ (سلطان) ابوسَعِیْد کی والدہ نے مصالحت کی طرح ڈالی، مگر بے سود۔ ابوسَعِیْد بھاگ نکلا، لیکن ۱۶ رجب ۸۷۳ھ/۱۱ فروری ۱۴۶۹ء کو گرفتار ہوگیا۔ دو دن کے بعد اوزون حسن تخت پر متمکّن ہوا اَور قیدی کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا؛ لیکن ۲۲ رجب کو ابوسعید کو اس کے حریف شہزادے یَادِگار محمد بن سلطان محمد بن بایْسُنْغُر کے سپرد کر دیا گیا، جس نے اسے قتل کرا دیا۔ ابوسعید کے امرا بھی یَادِگار کی کمان میں دے دیے گئے اور اس نے اوزون حسن کی مدد سے حسین بایْقَرا کے خلاف جدوجہد شروع کر دی؛ چنانچہ مؤخّر الذکر کو عارضی طور پر ہِرات سے نکال بھی دیا (۶ محرّم ۸۷۵ھ)۔ بایں ہمہ اوزون حسن کے بیٹوں (یعنی اولانگ رادکان میں خلیل اور قوہستان میں زین العابدین کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے یادِگار کے خلاف بغاوت پھیل گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان حسین بایْقَرا کے حکم سے اسے معزول کر کے قتل کر دیا گیا.

ابوسعید کی وفات کے بعد تیموری امرا کی حیثیت خراسان میں بالکل مقامی ہوکر رہ گئی اور اوزون حسن کے امرا نے بقیہ ایران پر قبضہ کرلیا، جس میں کِرْمان، فارْس، لُورِسْتان (لُرِستان)، خوزِستان اور کُرْدِسْتان کے علاقے شامل تھے (قبؔ جاگیروں وغیرہ کی تقسیم کے متعلّق قیمتی تفصیلات کے لیے اوزون حسن کے مکتوبات بنام [سلطان] محمد ثانی، فریدون بے، ۱: ۲۷۵ و ۲۷۶؛ قبؔ حبیب السّیر، ۳:۳۳۰)۔ قَرَہ قویُونْلو حَسَن علی، ہَمَذان کی طرف ہٹ گیا تھا۔ اس پر اچانک اوزون حسن کی فوجوں نے ۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء میں حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا (قبؔ *The History of the Ḳuṭb-shāhs*، فارسی مخطوطہ، در Bibl. Nat.، عدد ۱۷۴، ورق ۱۶ ب)۔ قریب قریب اسی زمانے میں بغداد پر بھی مَوصِل کے طاقتور امیر خلیل بیگ نے قبضہ کرلیا تھا (قبؔ فریدون بے، ۲:۲۷۶).

ان عظیم فتوحات کے بعد یہ امر واضح ہوگیا کہ اوزون حسن ہی ایشیا میں وہ طاقت ہے جو عثمانیوں کی پیش قدمیوں کی راہ میں حائل ہوسکتی ہے؛ چنانچہ ترکوں کے حریفوں، یعنی فرماں روایانِ قرہ مان اور مسیحیوں، بالخصوص اہل وینس، نے اس نئی طاقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی.

اہلِ وینس کی روش: ۲ دسمبر ۱۴۶۲ء کو وینس کی سینٹ (Senate) نے اوزون حسن سے اتّحاد کا ایک منصوبہ بنایا اور کُوئرینی (L. Quirini) کو اس مقصد کے تحت ایران بھیجا۔ ۱۳ مارچ ۱۴۶۴ء کو اوزون حسن کا ایلچی بھی (جو کوئی شخص مَامِنا تَزَب تھا؟) وینس آیا، جہاں وہ چھے ماہ تک رکا رہا۔ ۱۴۶۵ء میں قاسِم حسن (؟) اوزون حسن کا ایک خط لے کر یہاں پہنچا۔ گفت وشنید میں کچھ عرصہ تعطّل رہا، لیکن جب ۱۴۶۹-۱۴۷۰ء ترکوں نے اِیُّوبِیہ (Euboea) فتح کرلیا (جو دو سو چونسٹھ برس تک اہلِ وینس کے قبضے میں رہا تھا) تو ان میں سراسیمگی پھیل گئی، فروری ۱۴۷۱ء میں کُوئرینی (Quirini) ایران سے واپس آیا۔ اس کے ساتھ اوزون حسن کا سفیر مِیراث (Mirath) (یا مُراد؟) بھی تھا۔ اسی دوران میں حکومتِ

ایران کا ایک اَور نمائندہ بھی دربارِ پاپائی (Vatican) میں پہنچ گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب وینس کی سینٹ نے اپنے ایک امیر کاترینو زینو (Caterino Zeno) کو، جو اوزون حسن کی بیوی ڈسپینا کاٹرینا (Despina Catarina) کا بھانجا تھا، ایران بھیجا۔ ۲۰ اپریل ۱۴۷۱ء کو زینو تبریز میں تھا۔ اسی سال حاجی محمد (اَرَیماسِت) بھی وینس آیا اور سامانِ حرب کی استدعا کی؛ چنانچہ جیوسافا باربرو (Giosafa Barbaro) کو چھے بڑی توپیں (Bombarde)، چھے سوتوڑے دار بندوقیں (Spingarde)، تفنگیں (Schioppotti) اور گولہ بارود دے کر اوزون حسن کے پاس ایران بھیجا گیا؛ دوسو فوجی سپاہی بھی افسروں سمیت ساتھ کر دیے گئے۔ ۱۱ فروری ۱۴۷۳ء کو جو خفیہ ہدایات بازبَرو کو جاری کی گئیں ان میں یہ مذکور تھا کہ وینس اس وقت تک ترکوں سے ہرگز صلح نہیں کرے گا جب تک وہ آبنائے تک ایشیائے کوچک کے تمام علاقے سے ایران کے حق میں دست بردار ہو جانے پر مجبور نہ کر دیے جائیں۔ بازبَرو کو جزیرۂ قُبرُص میں رکنا پڑا، جہاں اس نے وینس کے بحری بیڑے کے ساتھ (جس کی کمان موسنیگو P. Mocenigo کر رہا تھا) جنگ میں حصّہ لیا۔ اس بیڑے نے قرہ مان کے امیروں کی استدعا پر سِلِفکہ اور ساحل کے دو اَور مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔

اس اثنا میں زِینو (Zeno) کی کارروائیاں بھی ایران میں جاری رہیں اور یورپی مآخذ (Jorga، ۲:۱۶۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری کومنی نُوس (Comnenos) کا بھتیجا، جس نے اوزون حسن کے ہاں پناہ لی تھی، طرابزون کے علاقے پر حملہ آور ہوا تھا۔

ایشیائے کوچک پر حملہ: قرہ مانی لوگ بھی اہلِ وینس کے دوش بدوش اوزون حسن کے بازو مضبوط کر رہے تھے۔ اسحٰق کے جانشین پیر احمد کی درخواست پر اوزون حسن نے ایک فوج تیار کی اور اس کی کمان وزیر عمر بیگ بن بکتاش (بروے زینو، ص۱۶: Amarbei Guisultan Nichenizza of Zino) اور اپنے چچازاد بھائی یُوسُف چَہ میرزا کے سپرد کی۔ یہ فوج (بقول انجیوللّو Angiollelo، ص۷۷) پچاس ہزار (اور بقول Zeno، ص۱۶، ایک لاکھ؟) افراد پر مشتمل تھی۔ اس فوج نے دیار بکر سے چل کر توقات پر حملہ کر کے اسے تاراج کیا اور پھر وہاں سے قیصریہ پر حملہ آور ہوئیں۔ یہاں بقول سَعد الدّین ''انھوں نے ترکمانی کردار کا خوب مظاہرہ کیا''۔ کاترینو زینو (ص۱۸-۱۹) ان میں سے بعض معرکوں کا عینی شاہد ہے (مصر سے بیڑا چھین لینے کی کوشش بھی غالباً اسی مہم کا ایک حصّہ تھی)۔ کچھ عرصے کے بعد عمر بیگ تو واپس دیار بکر چلا گیا لیکن یُوسُف چَہ میرزا نے قرہ مان اور حمید [ایلی] پر دوبارہ تاخت کی۔

ترکوں سے دوبارہ نبرد آزمائی: سلطان محمد ثانی کو ان واقعات اور ان سیاسی چالوں سے بہت تشویش ہوئی جن سے وہ یقیناً باخبر تھا (قب فریدون بے، ص ۲۸۵؛ ابن ایاس، ۲:۱۴۵)۔ اوزون حسن کے مراسلات کا لہجہ روز بروز تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا (قب فریدون بے، ۱:۲۷۸؛ ان میں سلطان کو ''امارت مآب'' جیسے توہین آمیز لقب سے مخاطب کیا گیا تھا؛ نیز قب ص ۲۷۸، جہاں سلطان محمد ثانی نے جواباً بے تکلف انداز میں اسے سردارِ عجم کہا ہے)۔ ۸۷۷ھ/ ۱۴۷۲ء کے موسمِ خزاں میں سلطان نے قسطنطینیہ سے کوچ کر کے ایشیا کے ساحل پر قدم رکھا، لیکن یہاں اسے موسمِ سرما کی وجہ سے رکنا پڑا۔ بہرکیف ۱۴ ربیع الاوّل ۸۷۷ھ/ ۱۹ اگست ۱۴۷۲ء کو شہزادہ مصطفٰی اور اناطولیہ کے بیگلر بیگی داؤد پاشا نے، جس کے ماتحت ساٹھ ہزار فوج تھی، قیرامیلی کے ضلع میں (جو قونیہ کے مغرب میں واقع ہے) ترکمانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔

شوّال ۸۷۷ھ/ مارچ ۱۴۷۳ء میں سلطان نے پیش قدمی کی۔ اس کی کل فوج ایک لاکھ تھی (قب سَعد الدّین، ۱:۵۲۹۔ اس کی تصدیق انجیوللّو (Angiolello)، ص ۷۹-۸۰، سے ہوتی ہے، جو اس طرح لکھتا ہے کہ گویا وہ بھی ترکی فوج میں شامل تھا)۔ شہرۂ آفاق اَقینجی [رک بآن] علی میخال اوغلو [رک بآن] نے، جسے ہَراوَل کے ساتھ بھیجا گیا تھا، کماخ کو تاراج کر کے اس علاقے کے ارمنوں کو گرفتار کر لیا۔

اوزون حسن اَواخر جولائی ۱۴۷۳ء میں اِرزِنجان کے علاقے میں آ گیا تھا۔ اس نے دریاے فرات کے بائیں کنارے کی پہاڑیوں پر پڑاؤ کیا اور جب خاص مراد پاشا نے دریا پار کرنے میں جلد بازی کی تو اس نے اس کا محاصرہ کر کے اسے شکست دے دی۔ خاص مراد تو فرات میں غرق ہو گیا اور ترکوں کے (بقول انجیوللو Angiolello) بارہ ہزار جوان کام آئے۔ کاترینو زینو، جو اوزون حسن کے خواص میں شامل تھا، اس پہلے تصادم کی تاریخ یکم اگست ۱۴۷۳ء بیان کرتا ہے۔ میدان جنگ تِرجان (ارزنجان کے اوپر) کے ضلع میں تھا۔ دریاے فرات کی نشیبی زمین، جسے خاص مراد استعمال کرنا چاہتا تھا (انجیوللو Angiolello)، پکرِج کی سطح سے شروع ہوتی ہے۔ سعد الدّین اس کی وضاحت نہیں کرتا، مگر انجیو للو (Angiolello) (اور زینو Zeno) کا قول ہے کہ ترکی فوجیں اس مہم سے دست کش ہونے کے لیے تیار تھیں، چنانچہ انھوں نے وادیِ فرات سے کوچ کیا اور بایبورد کو دائیں ہاتھ (شمال مشرق کی طرف) چھوڑتی ہوئی شمالی راہ پر طرابزون کی سمت ہو لیں۔ بظاہر ان کا ارادہ وہاں سے مغرب کی طرف رخ کرنے کا تھا، لیکن ترکی فوجیں ابھی صوبۂ (ضلع) اُچ اَغیز لِی ہی میں تھیں (غالباً ان پہاڑوں کے شمال میں جو ارزنجان کو وادیِ کِلکِیت سے جدا کرتے ہیں) کہ اوزون حسن کی فوجیں ترکی لشکر کے میمنے کی سمت کوہ اُوتلُق بیلی کی بلندیوں پر نمودار ہوئیں (جو وادیِ فرات کو چوروخ [چووق] کے منبعوں سے جدا کرتا ہے)۔ ترکوں نے مبارزت قبول کر لی اور ۱۶ ربیع الاوّل ۸۷۸ھ/ ۱۱ اگست ۱۴۷۳ء (بقول زینو ۱۰ اگست ۱۴۷۳ء) کو گھمسان کا رن پڑا، جس میں آق قویونلو کو شکست فاش ہوئی۔ اوزون حسن کا سردار کافر اسحٰق (ایک مسیحی؟ کیونکہ بقول زینو آق قویونلو فوج میں گرجستانی بھی موجود تھے) عین میدان جنگ میں مارا گیا۔ خود اوزون حسن کا بیٹا زینل [زَین العابدین] بھی کام آیا۔ اوزون حسن نے راہِ فرار اختیار کر لی، لیکن دم

دبا کر نہیں جیسا کہ سعد الدّین باور کرانا چاہتا ہے؛ کیونکہ ۱۸ اگست کے جو احوال زینو کے لکھے ہوئے ملتے ہیں انھیں اوزون حسن کے اس پڑاؤ پر قلم بند کیا گیا تھا جو ارزنجان سے چار دن کی مسافت پر کیا گیا تھا۔ بہر حال ترکوں نے (بقول زینو) اپنے آتشین اسلحہ کی بدولت بڑی شان دار فتح پائی۔ [اس جنگ میں] جو اہلِ حرفہ اور ماہرینِ فن گرفتار ہوے وہ سب قسطنطنیہ بھیج دیے گئے۔ اوزون حسن نے قرہ قویونلو کے جو افراد اپنی فوج میں بھرتی کر رکھے تھے انھیں آزاد کر دیا گیا اور باقی سب ترکمانوں کا سلطان کے حکم سے قتل عام کیا گیا۔ کلکیت صُو کے کنارے اور قویونلو حِصار کے اوپر واقع (شَبِین) قرہ حصار کے کمان دار داراب بیگ نے جب اس شکست کی خبر سنی تو اپنا قلعہ ترکوں کے حوالے کر دیا۔ وزیر اعظم محمود پاشا نے جب وہ مشکلات بتائیں جو ان علاقوں کو، جنھیں ابھی فتح کرنا باقی تھا، اپنے قبضے میں رکھنے سے پیدا ہوں گی تو سلطان نے اوزون حسن کا تعاقب چھوڑ دیا، لیکن بعد میں اسے اپنے اس فیصلے پر افسوس ہوا اور وزیر اعظم کو اپنے منصب سے برطرف ہونا پڑا (سعد الدّین، ۱:۵۲۱-۵۴۴)۔

اوزون حسن کو اس شکست سے علاقہ تو کچھ زیادہ نہ دینا پڑا لیکن اس کے سیاسی اثرات دور رس ثابت ہوئے۔ اس جنگ کے بعد اوزون حسن نے وینس کو اطلاع دی (Berchet، ص ۱۳۷) کہ وہ جوابی حملہ کرنے والا ہے؛ علاوہ ازیں اس نے کاترینو زینو کو بھی اس غرض سے بھیج دیا کہ وہ یورپ کی حکومتوں پر اس کا مقصد واضح کر کے امداد حاصل کرے۔ پولینڈ اور ہنگری کے سفر ابھی زینو کے ساتھ ہی واپس بھیج دیے گئے۔

وینس کی سینٹ (مجلسِ عاملہ) نے، جو ہمیشہ اس اتّحاد کو بڑی اہمیّت دیتی رہی تھی، اپنے معتمد اوگنِبین (P. Ognibene) کو ایران روانہ کیا۔ بارِبرو (Barbaro) بھی پاپائے روم اور صقلیہ کے بادشاہ فرڈیننڈ کے نمائندوں کو رودس (Rhodes) میں چھوڑ کر وہاں سے چل دیا اور ۱۲ اپریل ۱۴۷۴ کو تبریز پہنچ گیا۔ سب سے آخر میں ایک نیا سفیر کونتارینی (A. Contarini) بھی ۱۳ فروری ۱۴۷۴ کو وینس سے روانہ ہو کر ۱۴ اگست ۱۴۷۴ کو تبریز پہنچا اور ۴ نومبر ۱۴۷۴ کو اصفہان آ گیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بولونا (Bologna) کا نصرانی راہب لودوویکو (Lodovico) بھی اس وقت ایران میں موجود تھا اور اپنے آپ کو برگنڈی کے ڈیوک کا نمائندہ ظاہر کرتا تھا، لیکن اس دفعہ یہ سب سفیر اوزون حسن سے قطعی طور پر کچھ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

اسی زمانے میں اوزون حسن اپنے بیٹے اوغورلو محمد کی بغاوت فرو کرنے کے لیے شیراز گیا ہوا تھا۔ واپسی پر اس نے تبریز میں کونتارینی کو رخصت کیا (۲۶ اپریل ۱۴۷۵)، جو اس کی فوج (تعداد: پچیس ہزار) کا معائنہ بھی کر چکا تھا۔ اس سے کہہ دیا گیا کہ ترکوں کے خلاف فوجی اقدام آئندہ کسی وقت کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ ۸۸۰ھ میں ایران میں طاعون بڑی تباہی لایا۔ دوسری طرف اوزون حسن کی فوجوں کو اس کے بھائی اویس کے مقابلے میں میدانِ کارزار گرم کرنا پڑا۔ اویس کو شکست ہو گئی اور وہ الرُّہا کے مقام پر مارا گیا (ابن اِیاس، ۲: ۱۶۰)۔ اہلِ وینس کو جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ ان کی امیدیں عبث ہیں؛ چنانچہ اوزون حسن کے انتقال کے بعد ایک سال کے اندر اندر انھوں نے ترکوں کے ساتھ صلح نامے پر دستخط کر دیے (دسمبر ۱۴۷۸ء)۔

گرجستان سے تعلّقات: بقول منجم باشی اوزون حسن نے گرجستان پر تین بار حملہ کیا تھا، یعنی ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء میں، ۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء کی گرمیوں میں (؟) اور ترکوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد؛ جہاں آرا کے بیان کے مطابق یہ آخری حملہ ۸۸۱ھ/۱۴۷۶-۷۷ء میں ہوا تھا۔ بارِبرو (Barbaro، ص ۹۰)، جو اس کا عینی گواہ ہے، گرجیوں سے صلح کی گفت وشنید میں شامل تھا۔ خود پندرھویں صدی کے گرجی مآخذ اس بارے میں بہت مبہم ہیں (Brosset: *Histoire de la Géorgie*، ۲/۱: ۱۲، ۲۴۹)۔ معلوم ہوتا ہے کہ خَرثلِیا (Kharthlia) کے بادشاہ قسطنطین ثالث (۱۴۶۹-۱۵۰۵ء) نے اپنے حریفوں، یعنی امرثیا کے بگرات (بجرات Bagrat) اور آخال چیخ (قَوْرْقَوْرِہ قرقرۃ) کے اتابک کے خلاف آق قویونلو کی امداد حاصل کی تھی۔

مصر سے تعلّقات: اوزون حسن کی اصل ریاست (دیار بکر) اور سلاطینِ مصر کی مملکت کی سرحد تقریباً فرات کے موڑ کے قریب سے شروع ہوتی تھی۔ صرف مصری مؤرّخ (جن سے Weli: *Gesch. d. Chal.*، ج ۵، میں استفادہ کیا گیا ہے) آق قویونلو اور بُرُجی مملوکوں کے باہمی وسیع تعلّقات کا ذکر کرتے ہیں۔ ترکوں سے مخاصمانہ تعلّقات ہونے کی بنا پر اوزون حسن نے والیِ قاہرہ کے ساتھ تعلقات میں مصلحت بینی سے کام لیا (ان کے بارے میں ہمیں ۸۶۱ھ/۱۴۵۶ء سے حوالے ملتے ہیں)، لیکن دوسری طرف اسے یہ بھی ضرورت تھی کہ بحیرۂ روم میں داخلے کا راستہ ملے تا کہ اہلِ وینس سے ربط قائم رہ سکے۔ فرات کے دائیں کنارے کے علاقے مصر اور شام کی حکومتوں کی ملکیت تھے اور اس طرح اوزون حسن کی راہ میں حائل تھے؛ چنانچہ اس نے کوشش کی کہ مملوکوں کا ملحقہ علاقہ حاصل کر کے اپنی سرحدیں ہموار کر لے۔

۸۶۸ھ میں کُردوں نے قلعۂ گرگر پر (جو مَلَطْیَہ کے جنوب مشرق میں فرات کے دائیں کنارے پر ہے) قبضہ کر لیا تھا۔ اس کی کنجیاں انھوں نے اوزون حسن کے پاس بھجوا دیں، لیکن اس نے ۸۶۹ھ/۱۴۶۵ء میں گرگر والیِ حلب کے حوالے کر دیا اور اس کے بدلے میں ایک طرف تو خَرپُرت [خرپوت، حصنِ زیاد] پر قبضہ کر لیا جو اس وقت آرسلان ذوالقدر کے پاس تھا اور دوسری طرف اَلْبِستان کو تاراج کیا (قب مادّہ ہاے البستان؛ ذوالقدر)۔

۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء میں کَخْتا (کیاختا) [رئیس بآن] اور گرگر پر اوزون حسن کی فوجوں نے قبضہ کر لیا، لیکن قایت بای [رئیس بآن] نے امیر یشبک الدَوادار کو بھیجا اور اس نے آق قویونلو کو بیرہ سے نکال دیا (قب ابن اِیاس، ۲: ۱۴۰-۱۴۴ و Behnsch، تحت ۱۴۷۱ء)۔ قاہرہ میں جو ترکی سفیر بھیجا گیا تھا اس نے اوزون

حسن کے خلاف یہ کہ کر جذبات بھڑکائے کہ وہ نصاریٰ کا حلیف ہے، مگر قایت بای نے حزم واحتیاط سے کام لیا۔ امیر رستم اور قاضی احمد بن وَحِیُن نے، جو ۸۷۷ھ/ ۱۴۷۳ء میں عراق کی طرف سے امیرِ حجّ تھے، اس بات میں کامیابی حاصل کر لی کہ مدینۂ طیبہ میں خطبے میں ''الملک العادل حسن الطویل خادم الحرمین'' کا نام لیا جائے؛ مگر امیرِ مکۂ معظّمہ محمد بن بَرَکات (قب ۳: ۵۱۴) نے رستم اور اس کے ساتھی کو گرفتار کر کے قایت بای کے پاس بھیج دیا، جس نے اوزون حسن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے چند ماہ کے بعد انھیں رہا کر دیا (ابن اِیاس، ۲: ۱۴۵-۱۴۶)۔ ۸۸۰ھ میں اوغورلو محمد اپنے باپ کے ہاں سے فرار ہو گیا۔ حلبی فوجوں نے اس کی مدد کی، لیکن بری طرح شکست کھائی (کتابِ مذکور، ۲: ۱۵۲)۔ ۸۸۲ھ میں قایت بای خود فرات کے کنارے کی سرحد پر آیا اور حالات پر قابو پا لیا۔

اوزون حسن کی وفات: تِفلِس سے واپسی کے وقت اوزون حسن بیمار پڑا اور تبریز کے مقام پر پہنچ کر چوّن برس کی عمر میں (بار برو (Barbaro)، ص ۹۳ کے بیان کے مطابق) شبِ عید الفطر ۸۸۲ھ (۵-۶ جنوری ۱۴۷۸ء کی درمیانی شب) میں وفات پا گیا۔

مؤرّخین (حبیب السیر، ۳: ۳۳۰؛ جہان آرا؛ مُنجّم باشی، ۳: ۱۶۵) سب کے سب اس کے عدل وانصاف اور اتّقا کی تعریف کرتے ہیں۔ اس نے متعدد سلسلہ ہاے خیر جاری کیے۔ اس نے تبریز میں جو مسجد بنائی اس کے بارے میں رک بہ تبریز۔ دَوّانی نے اپنی کتاب اخلاقِ جلالی اوزون حسن کے نام سے معنون کی (قب Rieu: *Catalogue*، ص ۴۴۳ الف)۔ علی قوشجی اوزون حسن کے دربار کا مُنجّم تھا اور اسے قسطنطنیہ کے دربار میں بطورِ سفیر بھی بھیجا گیا تھا (Rieu: *Catalogue*، ص ۴۵۶ ب؛ منجم باشی، ص ۱۶۴)۔

خاندان: قبیلۂ آق قویونلو بہت مخلوط النسل ہو گیا تھا۔ ابتدا سے دیکھا جائے تو قرہ عثمان کی والدہ ماریہ طرابزون کی شہزادی تھی (قب Michael Panaretos: *Chronicle*، طبع Fallmerayer)۔

ڈسپینا (Despina)، جس سے اوزون حسن نے چونتیس برس کی عمر میں شادی کی تھی، یقیناً اس کی پہلی بیوی نہ تھی اور جب ۱۴۷۱ء میں ڈسپینا کا بھانجا کاترینو زینو (Caterino Zeno) اس سے ملنے آیا تو وہ دربار سے بہت دور خرپوت میں رہتی تھی۔ وہ مذہباً مسیحی رہی اور دیار بکر کے ایک مسیحی قبرستان ہی میں دفن کی گئی (بار برو (Barbaro)، ص ۸۴)۔ انجیولّو (Angiolello)، ص ۷۳، کے قول کے مطابق اس کے بطن سے اوزون حسن کا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک بیٹے (یعقوب؟) کو اس کے بھائیوں نے باپ کی موت کے بعد گلا گھونٹ کر مار ڈالا (؟)۔ ڈسپینا کی بیٹی مارتھا (Martha) (جسے سلسلۃ النسب صوفیہ (برلن ۱۸۴۳ء، ص ۶۸، میں بیگی آقا کہا گیا ہے، حبیب السیر میں حلیمہ بیگی آقا اور منجّم باشی نے عالم شاہ بیگم لکھا ہے) کی شادی شیخ حیدر، والی اردبیل، سے ہوئی تھی، جس کے بطن سے شاہ اسمٰعیل اوّل صفوی پیدا ہوا (شیخ حیدر کی ماں خدیجہ بیگم اوزون حسن کی ہم شِیر تھی)۔

اوزون حسن کا سب سے بڑا فرزند محمد ایک کُرد امّ ولد کے بطن سے تھا (قب ابن اِیاس، ۲: ۲۶۰؛ زینو (Caterino Zeno)، ص ۳۶؛ کونتارینی (Contarini)، ص ۱۷۳)۔ اس نے شیراز کی بغاوت کے بعد، جو ۸۷۹ھ/ ۱۴۷۴ء میں ہوئی تھی، سلطان بایزید کے پاس پناہ لی تھی، لیکن بعد میں اسے اپنے والد کے حکم سے ایران ہی میں قتل کر دیا گیا (ابن ایاس، ۲: ۵۹)۔

اوزون حسن کی بڑی ملکہ (مہد علیا) سلجوق شاہ بیگم تھی۔ اس نے کاروبارِ حکومت میں بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا (قب تاریخ امینی، ورق ۱۹۸ ب)۔ اس کے فرزند سلطان خلیل، یعقوب اور یوسف (اور غالباً مسیح بھی) تھے۔ زین العابدین کی والدہ کا نام ہمیں معلوم نہیں۔

شمس الدین محمد بن سیّد احمد، برہان الدین عبد الحمید کرمانی اور مجد الدین شیرازی، اوزون حسن کے وزرا تھے (حبیب السیر، ۳: ۳۳۰)۔

مآخذ: حبیب السیر کے مصنّف کا قول ہے کہ اوزون حسن کے ایک ہم عصر مولانا ابوبکر تہرانی نے [اس کے عہد کی] تاریخ لکھی تھی۔ یہ کتاب خواند امیر کو تو دستیاب نہیں ہوئی، ممکن ہے کہ منجم باشی نے اس سے استفادہ کیا ہو، کیونکہ اس کے مآخذ (قب v. Hammer، در *GOR*، طبع اوّل، ۷: ۵۴۹) میں ایک کتاب تاریخ بَیاندُریہ ہے، جو ہوسکتا ہے کہ کتاب دیار بکریہ ہی ہو، جس میں بقول تاریخ امینی (ورق ۱ ب)، اوزون حسن کے اسلاف کا مفصّل تذکرہ ہے۔

(۱) عبد الرزاق: مطلع سعدَیْن [طبع محمد شفیع، لاہوری، ۱۹۴۱-۱۹۴۹ء]؛ (۲) فضل اللہ بن روز بہان: تاریخ امینی. Bibl. Nat، پیرس، فارسی مخطوطہ، عدد ۱۰۱ (یہ یعقوب بن اوزون حسن کی تاریخ ہے اور اس میں اوزون حسن کے بارے میں بھی کچھ تعلیقات شامل ہیں (ورق ۶ ب تا ۹ ب)، جہاں مصنّف نے اسے ''صاحبِ قِران'' کے نام سے یاد کیا ہے)؛ (۳) خواند امیر: حبیب السیر، تہران ۱۲۷۱ھ، ۳: ۳۳۰ (بہت مختصر عبارت)، نیز ص ۲۳۳-۲۳۷، ۲۵۱، ۲۵۲ و ۳۸۹ (جہاں مشاہیرِ وقت مذکور ہیں)؛ (۴) ابن ایاس: تاریخ مصر، قاہرہ ۱۳۱۱ھ، ج ۲: (۵) احمد الغفّاری: جہان آرا، مخطوطہ مُوزۂ بریطانیہ، عدد ۱۴۱ Or. (میرزا محمد قزوینی کی عنایت سے میں نے اس مخطوطے کی ایک نقل سے استفادہ کیا)، ورق ۱۸۷ ب تا ۱۹۰ ب، قبیلۂ آق قویونلو کی تاریخ مع گراں قدر تفصیلات۔ اوزون حسن جب ۸۸۱ھ میں گرجستان کی مہم میں مشغول تھا تو اس وقت مصنّف کا دادا اوزون حسن کی ملازمت میں قاضی مُعسکَر (کذا) کے عہدے پر فائز تھا؛ (۶) عاشق پاشا زادہ: تاریخ، استانبول ۱۳۳۲ھ؛ (۷) سعد الدین: تاج التواریخ، قسطنطینیہ ۱۲۷۹ھ، ۱: ۴۷۶-۴۸۴ (فتح طرابزون)، ص ۵۲۱-۵۴۴ (اوزون حسن سے جنگیں)، چند معمولی واقعات، جو قافیہ آرائی کی نذر ہو گئے؛ (۸) جَنّابی: تاریخ، (قلمی) (قب Babinger، در *GOW*، ص ۱۰۸) اور v. Hammer نے اس سے استفادہ کیا ہے؛ (۹) منجّم باشی: صحائف الاخبار (اصل عربی کتاب کا ترکی میں ملخص)، ۳: ۱۵۴-۱۶۷ (متعدد غیر مرتب تفصیلات)، نیز قب ۳: ۳۷۷

و۳:۳۸۷؛ (۱۰) فریدون بے: منشئاتِ سلاطین، استانبول ۱۲۷۴ھ، ۱:۲۷۴-۲۸۸ (نہایت قیمتی دستاویزات، جو بلاشبہہ مستند ہیں)؛ (۱۱) Chalcocondylas، بُون ۱۸۴۳ء، ص ۱۶۶ - ۱۶۸ (Ασπροβάταντες = آق قویونلو کے اپنے ہمسایوں سے تعلّقات کے بارے میں بہت الجھی ہوئی معلومات)؛ ص ۴۶۱-۴۹۷ و بمواضع کثیرہ (ڈسپینا (Despina) اور کومنی نوی (Comnenoi)، فرمانروائے طرابزون، کے مابین جو مراسلت ہوئی تھی وہ استانبول پہنچائی گئی تھی اور ان کے استیصال کا بہانہ بنی)؛ (۱۲) Ducas، ص ۳۳۹، اس کی (سفارت ۱۴۵۷ء) کی تفصیلات؛ (۱۳) Behnsch: *Rerum seculo XV، در Mesopotamia gestarum liber*، Breslau ۱۸۳۸ء (عجیب و غریب تفصیلات)؛ (۱۴) Fallmerayer: *Geschichte des Kaiserthums von Trapezunt*، میونخ ۱۸۲۷ء، ص ۲۵۸ ببعد؛ (۱۵) v. Hammer، در *GOR*، طبع دوم، ۱: ۴۶۴-۴۶۸، ۴۹۹-۵۱۲؛ (۱۶) E. Cornet: *Lettere al Senato Veneto de Giosafatte Barbaro, ambasciadore ad Usunhasan di Persia*، وی انا ۱۸۵۲ء؛ (۱۷) وہی مصنّف: *Le guerre dei Veneti nell' Asia 1470-1474*، وی انا ۱۸۵۶ء؛ (۱۸) G. Berchet: *La Repubblica di Venezia e la Persia*، Turin ۱۸۶۵ء (بہترین تحقیقی مطالعہ، جس کا ضمیمہ اسی عنوان کے تحت *Raccolta Venta*، سلسلۂ اوّل، ج ۱، وینس ۱۸۶۶ء، ص ۵-۶۲، میں شائع ہوا)؛ (۱۹) Weil: *Geschichte d. Chalifen*، ۵ (۱۸۶۲ء): ۲۷۵، ۲۹۶-۲۹۷، ۳۰۷-۳۰۸، ۳۱۱-۳۱۲، ۳۳۷-۳۳۹، ۳۴۰-۳۴۱ (مصر سے تعلّقات کے بارے میں)؛ (۲۰) *Works issued by the Hakluyt Society*، ج ۴۹ (۱۸۷۳ء) میں باربرو (Barbaro)، کونتارینی (Contarini) (مع ضمیمہ در بارۂ مقبوضاتِ اوزون حسن) اور زینو (Zeno) کے احوالِ سیاحت کا انگریزی ترجمہ اور انجیوللّو (Angiolello) کی یادداشتیں درج ہیں (مادّۂ زیرِ نظر میں وینسی سیاحوں کے بیانات اسی نسخے سے لیے گئے ہیں)؛ (۲۱) Jogra: *Gesch. d. Osm. Reiches*، گوتھا ۱۹۰۹ء، ۲: ۹۵-۱۰۴، ۱۶۰-۱۶۸؛ (۲۲) Browne: *A Literary History of Persia*، ۳: ۴۰۴-۴۱۴؛ (۲۳) Ivalov: *Iz istorii vostočnago vorporsa v XV stol.* در *Sbornik v čest Struwe*، پراگ ۱۹۲۵ء، ص ۲۴۱-۲۵۲.

(V. MINORSKY)

اَلْاَوْس: مدینۂ منوّرہ کے دو بڑے عرب قبیلوں میں سے ایک؛ دوسرا قبیلہ ✱ خَزْرَج ہے۔ عہدِ قبل از اسلام میں یہ دونوں قبیلے اپنی ماں [قَیْلہ بنت الاَزْقَم] کے نام پر [بنو] قَیْلَہ اور ہجرتِ نبویؐ کے بعد انصارِ رسول یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مددگار کہلائے [رک بہ انصار]۔ ان کا نسب نامہ ابن سعد ([طبقات]، ۳/۱:۲) کے بیان کے مطابق حسب ذیل ہے: الاوس [بن حارثہ] بن ثَعْلَبہ بن عمرو (مُزَیْقِیاء) بن عامر (ماء السماء) بن حارثہ [الِحطْرِیف] بن امرئ القیس بن ثعلبہ بن مازِن بن الاَزْد بن الغوث بن نَبْت بن مالک بن زَید بن کَہْلان بن سَبَاء بن یَشْجُب بن یَعْرُب بن قَحْطان۔ شجرۂ ذیل سے اس قبیلے کی خاص شاخوں کا حال معلوم ہوتا ہے:-

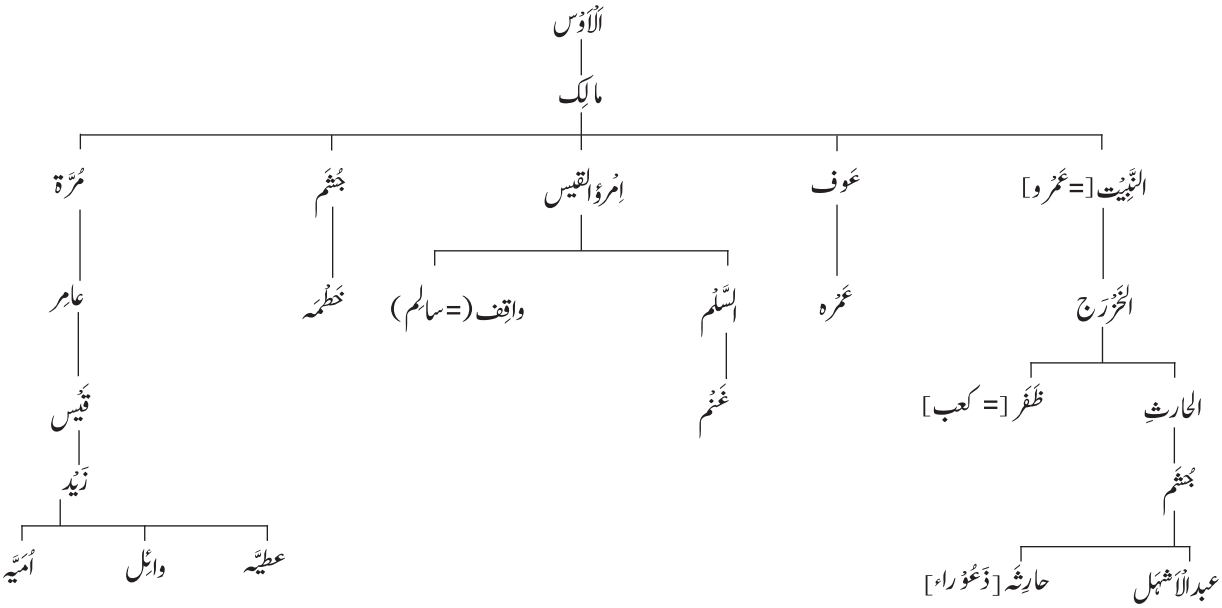

لفظ ''الاوس'' کے معنی عطیّہ ہیں (لسان) [نیز اس کے معنی ہیں عِوَض۔ اَوس بھیڑیے کو بھی کہتے ہیں۔ اوس لغوی لحاظ سے آسَ یؤُسُ کا مصدر ہے۔ جاہلیت میں اَوْسُ اللّات (لسان) اور اَوْسُ منَاۃ (جمھرۃ انساب العرب) مشہور تھے۔] اسلامی عہد میں اسے بدل کر اَوْسُ اللہ کر دیا گیا [لسان]۔ اب اوس کا لفظ

[بنو] واقِف، خَطْمَہ، وائل اور اُمَیَّہ بن زید (قبائل) کے لیے مخصوص سا نظر آتا ہے، لیکن بظاہر ان چاروں قبیلوں کو مدینے کے ''دستور'' میں صرف بنوالاوس کہا گیا ہے (ابنِ ہشام، ص ۳۴۱-۳۴۳).

حسبِ روایت قصّہ یوں ہے کہ عمرو مُزَیقیاء جب اپنے ساتھیوں کو لے کر یمن سے نکلا تو کچھ عرصے کے بعد اس کی اولاد میں پھوٹ پڑ گئی۔ الاوس اور الخزرج غسّان سے الگ ہو کر یثرب (یعنی مدینے) میں فروکش ہو گئے۔ اس وقت اس شہر کا نظم و نسق یہودی قبائل کے ہاتھ میں تھا۔ ایک زمانے تک بنوقَیْلہ یہودیوں کے ماتحت رہے۔ پھر الخزرج کی شاخ سالم (قواقِلَہ) کے ایک شخص مالِک ابن عَجْلان کے زیرِ قیادت خودمختار ہو گئے اور کھجور کے کچھ درخت نیز بعض قلعے (آطام، واحد: اُطُم) ان کے حصّے میں آئے۔ مالک کا ہم عصر اور اس کا مدِّ مقابل ایک اَور شخص اُحَیْحَہ بن الجُلَاح تھا، جس کا تعلّق بنواوس کی ایک شاخ [بنو] عمرو بن عوف سے تھا۔

اس میں شبہہ ہے کہ اس زمانے میں الاوس (یا الخزرج) کوئی مستقل قبائلی وحدت رکھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عملاً ان دونوں قبیلوں کی شاخیں مستقل اور مؤثر وحدت رکھتی تھیں، جنھیں بُطُون (clans) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن ان بُطُون کی ہیئتِ ترکیبی ایسی نہ تھی جیسی نسب کے شجروں سے قیاس کی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ شجرے بعد کے زمانے میں تیار کیے گئے ہیں اور ان میں نسل باپ سے چلتی ہے حالانکہ بہت سی علامتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدینے میں مادری رشتے کو اہمیّت حاصل تھی۔ ہجرت سے پہلے کی دہائیوں میں مدینے میں جو باہمی جھگڑے تھے وہ عموماً انھیں دو قبیلوں اوس اور خزرج کے درمیان تھے، لیکن مآخذ میں ان جھگڑوں کا بھی ذکر ہے جو ان کے بطون کے یا بطون کے ذیلی خانوادوں کے درمیان ہوتے رہتے تھے، یہاں تک کہ مدینے کے ''دستور'' میں وہ وحدتیں جن پر دیت ادا کرنے کی ذمّے داری عائد ہوتی تھی اور جو بظاہر خودمختار سیاسی جماعتیں تھیں یا تو الگ الگ بطون تھے یا ان بطون کے خانوادے مثلاً النَّبِیْت، جو [بنو] عبدالاَشْہَل، ظفر اور حارثہ کے بطون سے مل کر بنا تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ الاوس اور الخزرج کا بطورِ قبائل تصوّر اس لیے پیدا کیا گیا تھا کہ ان بطون کے درمیان، جو ایک دوسرے کے حلیف تھے، زیادہ قریبی تعلّقات قائم کیے جائیں۔ یہ تصوّر ہجرت سے کچھ عرصہ پہلے معرضِ وجود میں آیا تھا اور ہجرت کے بعد اَور زیادہ مضبوط ہو گیا۔

ہجرت سے قبل کے دور میں الاوس کا سردار حُضَیر بن سِماک تھا، جو بلحاظِ نسب قبیلۂ عبدالاشہل میں سے تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک موقع پر وہ الخزرج کے بطن الحارث کے خلاف عمرو بن عوف کے بطن کی قیادت کر رہا تھا؛ اس وقت عبدالاشہل کا سردار مُعاذ بن نعمان تھا۔ ایک اَور سردار ابوقیس بن الاَسْلَت بطنِ وائل میں سے تھا، لیکن کئی مواقع پر، جب وہ کسی جماعت کی قیادت کر رہا تھا، اس کے متّبعین نے راہِ فرار اختیار کی، لہٰذا آگے چل کر ایسے موقعوں پر جب وہ دونوں موجود ہوتے وہ قیادت حُضَیر کے سپرد کر دیتا تھا۔ اس دوران میں آپس کے مختلف چھوٹے چھوٹے مناقشات جمع ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ ایک بڑی جنگ کی آگ بھڑک اٹھی، جس میں مدینے کے بیشتر باشندے اور نواحی علاقے کے کچھ لوگ شامل تھے۔ ایک زبردست شکست کے بعد عبدالاشہل اور ظفر کے بطون مدینے سے نکل گئے اور عمرو بن عوف اور اوس نے باہم صلح کر لی۔ بہرحال بیاضہ کے خزرجی سردار عمرو بن نعمان کے استبدادی رویے کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہودی قبائل قُرَیْظہ اور النَّضِیر نے دونوں جلاوطن شدہ قبیلوں سے رشتۂ اتّحاد استوار کر لیا اور اس طرح مؤخّر الذکر دوبارہ میدانِ جنگ میں اترنے کے قابل ہو گئے۔ ایک خانہ بدوش بطن مُزَیْنَہ بھی ان کا مددگار ہو گیا اور حارثہ کے سوا، جسے عبدالاَشْہل نے اس کے علاقے سے نکال دیا تھا، اوس کے دیگر بطون بھی ان سے آملے۔ اس کا نتیجہ جنگِ بُعاث کی صورت میں برآمد ہوا۔ الاوس اور ان کے حلفا کی فتح ہوئی، لیکن اس کا قائد حُضَیر مارا گیا۔ اس جنگ کے بعد صلح تو نہیں ہوئی لیکن بڑے پیمانے پر مزید لڑائیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔

یہ صورتِ حال تھی جب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے پہلے الخزرج اور اس کے بعد الاوس سے گفت و شنید کی۔ الخزرج تقریباً سب کے سب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ ہو گئے، لیکن اوس کے بہت سے لوگ، یعنی خَطْمَہ، وائل، واقِف اور اُمَیَّہ بن زید کے بطون اور عمرو بن عوف کے کچھ افراد کنارہ کش رہے۔ بایں ہمہ عبدالاشہل کے سردار سعدؓ بن معاذ بن النّعمان کا قبولِ اسلام مدینے میں فروغِ اسلام کے لیے ایک فیصلہ کن واقعہ ثابت ہوا۔ سعدؓ جنگِ بدر سے اپنی وفات (۵ھ/۶۲۷ء) تک بنوقیلہ، یعنی انصار [رک بآں] میں سرکردہ مسلمان رہے۔ اوس اور خزرج کے درمیان ناچاقی ختم ہو گئی، اور حضرت ابوبکرؓ کے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد تو اس کا ذکر کبھی سننے میں بھی نہیں آتا۔ [قبیلۂ اوس کی تعداد خزرج سے کم تھی لیکن قوّت اور بہادری میں اوس ہی کا لوہا مانا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اسلامی جنگوں میں بھی اوس کی تعداد کم رہی۔ جنگ بدر میں دو سو تیس انصار میں سے صرف اکسٹھ اوسی تھے۔ بنوالاوس مدینے کے باہر کچھ فاصلے پر سکونت پذیر تھے (جوامع السیرۃ، ص ۱۲۹، ۱۳۰)].

مآخذ: (۱) السمہودی: وفاء الوفاء، قاہرہ ۱۹۰۸ء، ۱: ۱۱۶-۱۴۰ (ملخص در وُسٹِنْفِلْڈ (F. Wustenfeld): *Geschichte der Stadt Medina*، گوٹنگن ۱۸۶۰ء، ص ۳۲-۴۰)؛ (۲) وہی مصنّف: خلاصۃ الوفاء، مکّہ ۱۳۱۶ھ؛ (۳) ابن الاثیر، ۱: ۴۹۲-۵۱۱؛ (۴) وِلہاوزن (J. Wellhausen): *Skizzen und Vorarbeiten*، برلن ۱۸۸۹ء، ۴/۱: "Medina vor dem Islam"؛ (۵) پرسیول (A. P. Caussin de Perceval): *Essai sur l'histoire des Arabes avant l'Islamisme*، پیرس ۱۸۴۷ء، ۲: ۲۰۲، ۲۱۲، ۶۴۶-۶۹۰؛ [(۶) Reuben Levy: *The Social Structure of Islam*، کیمبرج ۱۹۶۵ء، بہ امداد اشاریہ؛ (۷) Nicholson: *A Literary History of the Arabs*، ص ۱۷۰؛ (۸) لسان العرب، بذیل اوس؛ (۹) ابن سعد:

طبقات ۳/ ۲؛ (۱۰) ابن حزم : جمهرة انساب العرب، ص ۷، ۳۲۹ - ۳۴۶، ۴۷۰، ۴۷۱؛ (۱۱) وہی مصنّف: جوامع السیرة، بہ امداد اشاریہ؛ (۱۲) جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام؛ (۱۳) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، ۱: ۵۰، ۵۱، دمشق ۱۹۴۹ء؛ (۱۴) القلقشندی: صبح الا عشٰی، ۱: ۳۱۹؛ (۱۵) وہی مصنّف : نہایة الأرب، مطبوعۂ بغداد؛ (۱۶) ابن درید : الاشتقاق، ۲۶۰؛ (۱۷) الہمدانی : صفة جزیرة العرب، ۲۱۱؛ (۱۸) ابن خلدون : تأریخ، اردو ترجمہ از ڈاکٹر عنایت اللہ، ۱: ۱۸۵، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۱۹) الزّبیدی : تاج العروس، بذیل اوس؛ (۲۰) الأغانی بہ امداد اشاریہ].

(W. MONTGOMERY WATT)

اَوْس بن حَجَر: [ابوشُرَیح] قبیلۂ تمیم کا عہد قبل از اسلام [نواح ۵۳۰-۶۲۵ء] کا سب سے بڑا شاعر۔ الأصمعی نے اس کے کلام کو اکثر سراہا ہے اور اس کی شرح کی ہے۔ اس کے برعکس البحتری کے حَماسة سے قطع نظر اشعار کے کسی قدیم مجموعے میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ الفرزدق جب اس امر پر اظہار فخر کرتا ہے کہ اس نے ''قبیلۂ اوس سے زہریلی زبان ورثے میں پائی ہے'' تو کیا اس سے مراد اوس بن حجر ہے؟ اس بارے میں بالتحقیق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ابن السِّکّیت سے پہلے [اس کے قصیدوں کے کسی قدر] طویل اقتباسات دکھائی نہیں دیتے۔ ابن السکّیت ہی نے غالباً اس کے دیوان کی شرح لکھی تھی اور اس کے علاوہ اپنی لغت میں اس کے اشعار نقل کیے تھے۔ [اس کا دیوان پہلی مرتبہ R.Geyer نے ۱۸۹۲ء میں شائع کیا۔ نیز قب طبع محمد یوسف نجم، بیروت ۱۹۶۰ء۔]

قدیم ناقدین کے ہاں اوس کی شہرت کا مدار حمار (وحشی)، قوس اور خصائلِ حسنہ کے وصف پر تھا۔ اس نے لخمی بادشاہ عمرو بن ہند کو بڑے زور سے نصیحت کی کہ اپنے باپ المنذر الثالث کا قصاص لے، جو ۵۴۴ء میں اَلْقاع اور السُّوْبان کی لڑائیوں میں، جن میں اس کا قبیلہ بھی شریک تھا، قتل ہوا تھا۔ بنو اسد کے فَضَالَہ بن کَلَدَہ سے اس کی شناسائی کا واقعہ ایک دلچسپ حکایت میں بیان کیا گیا ہے۔ فضالہ کی یاد میں اس نے اپنا مشہور مرثیہ بھی لکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اوس، النابغہ سے پہلے ہوگزرا ہے۔

روایات میں زُہَیر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اَوس اور طفیل الغَنَوی دونوں کا راوی تھا۔ کرینکوف (Krenkow) نے اَوس کو طفیل کا راوی بتایا ہے، لیکن کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ [لسان العرب میں اوس کے اشعار سے بکثرت استشہاد کیا گیا ہے قب عبدالقیوم: فہرس الشعراء۔]

اوس کا قصیدہ لامیہ پٹنہ (۲: ۴۲۵، ۲۵۹۸) میں موجود ہے (براکلمان، ۱: ۱۱۲)۔ جاحظ کا خیال ہے کہ اوس کے اشعار اس کے بیٹے شریح کے اشعار سے خلط ملط ہوگئے ہیں (براکلمان، ۱: ۱۱۳)۔ اوس کے اشعار کو گائر (R. Geyer) نے پہلی مرتبہ ۱۸۹۲ء میں شائع کیا۔ ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر محمد یوسف نجم نے بیروت سے ایک بڑا عمدہ ایڈیشن شائع کیا۔

مآخذ: (۱) R. Geyer: *Gedichte und Fragmente des' Aus b. Harar*، (در *Wien SBAK.*، فلسفہ و تاریخ، ۱۵۰: ۱۳، ۱۳-۱۰۷)، قب *GGA*، ۱۸۹۵ء، عدد ۵: ص ۳۷۱ ببعد؛ (۲) *ZDMG*، ۱۸۹۳ء، ص ۳۲۳ ببعد و ۱۸۹۵ء، ص ۸۵ ببعد، ۲۹۷ ببعد، ۶۷۳ ببعد و ۱۹۱۰ء، ۱۵۴ ببعد؛ (۳) *ZA*، ۱۹۱۲ء، ص ۲۹۵ ببعد؛ (۴) طٰہٰ حسین: فی الادب الجاهلی، ص ۲۹۶ ببعد؛ (۵) براکلمان ۱: ۲۷ و تکملہ، ۱: ۵۵، (۶) G. E. von Grünebaum، در *Orientalia*، ۱۹۳۹ء، ص ۳۲۸ ببعد؛ مزید اہم مواد در (۷) ابوعُبَیدہ: کتاب النقائض، لائڈن ۱۹۰۵-۱۹۱۲ء؛ (۸) الاصمعی: فُحُولة، در *ZDMG*، ۱۹۱۱ء، ص ۴۹۲، ۴۹۳؛ (۹) ابن قُتَیبہ: المعانی الکبیر؛ (۱۰) ابن دُرَید: جَمْهرة؛ (۱۱) ابن مَیْمُون: منتهَی الطلب، قب *JRAS*، ۱۹۳۷ء، ص ۴۳۳ ببعد؛ [(۱۲) ابن حزم: جَمْهرة انساب العرب، طبع عبدالسلام محمد ہارون، مصر ۱۹۶۲ھ، ۲۱۰، ۳۱۱؛ (۱۳) معاهد التنصیص، ۱: ۱۳۲؛ (۱۴) الأغانی، ۱۱: ۷۰؛ (۱۵) البغدادی: خِزانة، ۲: ۲۳۵؛ (۱۶) سمط اللآلی، ص ۲۹۰؛ (۱۷) شرح شواهد المغنی، ص ۴۳؛ (۱۸) الشعراء النصرانیة، ص ۴۹۲؛ (۱۹) طبقات فحول الشعراء، ص ۸۱؛ (۲۰) ابن رشیق: العمدة، بہ امداد اشاریہ۔]

(S. A. BONEBAKKER[و ادارہ])

الاُوْشی: علی بن عثمان، سِراج الدّین الفَرْغانی الحَنَفی، جن کے حالات کے متعلّق کوئی چیز ضبط تحریر میں نہیں آئی (عبدالقادِر بن ابی الوفاء القُرَشی: الجَوَاهِر المُضِیئَة فِی طَبَقات الحَنَفِیَّة، حیدرآباد [دکن] ۱۳۳۲ھ، ۱: ۳۶۷، میں ان کا زمانہ تک نہیں بتایا گیا)۔ الاُوْشی نے ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں (قب *ZDMG*، ۱۶: ۶۸۵) ایک عقائد نامہ، بعنوان القَصِیدة اللاّمِیَّة فِی التَّوْحِید نظم کیا؛ اسے بَدْء الاَمَالی یا اس کے ابتدائی کلمات کی بنا پر قصیدة یَقُول العَبْد بھی کہتے ہیں (*Carmen arabicum Amālī dictum*)، طبع P. v. Bohlen Regensburg، ۱۸۲۵ء؛ نیز در مَجْمُوع مُهِمَّات المُتُون، قاہرہ ۱۲۷۳ھ، ۱۲۸۱ھ، ۱۲۹۵ھ، ۱۳۲۳ھ؛ نیز سلیم بن سُمَیر: سَفِیْنَة النَّجاة، سنگاپور ۱۲۹۵ھ، کے حاشیے پر اور مع ترجمۂ اردو، از مولوی محمد نذیر احمد خاں [کذا در براکلمان: تکملہ، ۱: ۷۶۴]، دہلی ۱۳۱۷ھ۔ ان مطبوعہ نسخوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ آج تک کس درجہ مقبول چلا آرہا ہے۔ اس کی شرحیں بھی اکثر لکھی گئی ہیں۔ براکلمان، ۱: ۴۲۹، میں اس کی شرحوں کی فہرست دی گئی ہے، جن میں قدیم ترین شرح محمد بن ابی بَکْر الرَّازی، صاحِب تُحْفَة المُلُوک (براکلمان، ۱: ۳۸۳؛ م ۶۶۰ھ/۱۲۶۱ء — بقول حاجی خلیفہ، شمارہ ۷۳۳) کی ہے۔ اس کی فہرست پر چند اَور ناموں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے، جو استانبول اور دوسرے مقامات کی فہرستوں میں مندرج ہیں۔ ان سب میں القَارِی الہرَوی (م ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کی شرح سب سے زیادہ مقبول ہے۔ یہ شرح، جس کا عنوان ضَوْء الاَمَالِی ہے، مکّۂ معظّمہ میں ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں لکھی گئی اور ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں استانبول، ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں بمبئی اور ۱۳۰۱-۱۳۰۲ھ/

۱۸۸۴ء میں دہلی میں طبع ہوئی اور پھر حُسنی اِفندی کے ترکی ترجمے کے ساتھ ۱۳۰۴ھ میں استانبول میں۔ کسی گم نام شخص کے حواشی، بعنوان تُحفَۃُ الاَعَالِی، قاہرہ ۱۳۰۹ھ و بدون تاریخ [بھی ملتے ہیں]۔ فارسی میں بھی دو شرحیں شائع ہوئیں: نَظْمُ اللآلی، از محمد بخش رفیقی، طبع سنگی، لکھنؤ ۱۸۶۹ء اور شرح از [اخوند] درویزہ نگرہاری، لاہور ۱۸۹۱ء و ۱۹۰۰ء۔ ایک ترکی شرح بھی ہے، یعنی مَرَاحُ المَعَالِی، از احمد عاصم عَیْن تابی، استانبول ۱۳۰۴ھ؛ علاوہ ازیں ترکی ترجمہ، مع شرح، از محمد شکری، استانبول ۱۳۰۵ھ۔ ان کے مجموعۂ احادیث، غُرَرُ الاَخْبَار و دُرَرُ الاَشْعَار کا محض ایک انتخاب، بعنوان نِصَاب الاَخْبَار وَ تَذْکِرَۃ الاَخْیَار [مخطوطے کی صورت میں] محفوظ ہے۔ یہ ایک ہزار مختصر حدیثوں پر مشتمل ہے، جو ایک سو ابواب میں مرتب کی گئی ہیں۔ اس کا ایک نسخہ برلن میں (Ahlwardt: *Katalog*، شمارہ ۱۳۰۰/۱)، ایک میونخ میں (حاشیہ ۱۶۲)، ایک قاہرہ میں (فہرست، ۱: ۴۴۴) اور ایک نا تمام نسخہ موصل میں ہے (قب داؤد: المَخْطُوطاتُ الْموصِلیَۃ، ص ۲۴، شمارہ ۲۸)۔ ان کے فتاوی کا مجموعہ الفَتاوی السِّراجِیَّۃ، جسے بقول حاجی خلیفہ (شمارہ ۸۷۶۷) انھوں نے ۲ محرم ۵۶۹ھ/ ۱۳ اگست ۱۱۷۳ء کو اُوش میں مکمل کیا تھا، ۱۲۴۳ھ میں کلکتے سے اور ۱۲۲۳-۱۲۲۵ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

مآخذ: متنِ مادّہ میں مذکور ہیں۔

(C. BROCKELMANN)

---

* **الاُوْشی:** رک بہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔

---

* **اوْغُل:** رک بہ اَغُل۔

---

* **اَوْفات:** (یا وَفَات؛ حَبَشَہ Ethiopia) کے پرانے وقائع میں ایفات)۔ حبشہ کی ایک مسلم سلطنت (۶۸۴ھ/ ۱۲۸۵ء-۸۱۸ھ/ ۱۴۱۵ء)، جو مشرقی شوا (Shoa) کے مرتفع میدانی علاقے میں واقع تھی اور جس میں وہ نشیب بھی شامل تھے جو نیچے کی طرف حَوَاش کی وادی کی سمت چلے جاتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں مشرقی شوا میں متعدّد مسلم ریاستیں موجود تھیں، جن میں سے سب سے زیادہ با اقتدار ریاست (جہاں کے فرماں روا خاندان مَخْزُومِیَہ کی بنا ایک روایت کی رُو سے ۲۸۳ھ/ ۸۹۶ء میں پڑی تھی) ایک دستاویز کے مطابق، جو حال ہی میں E. Cerulli کو ملی ہے، اُس زمانے میں انتشار و انقراض کے آخری مراحل میں تھی؛ چنانچہ ۶۸۴ھ میں اس کی ایک باج گزار ریاست کے حاکم نے، جس کا خاندانی لقب وَلَسَمَع تھا، اسے فتح کر لیا۔ وَلَسَمَع نے مختلف شوائی اور عَفَری علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے، جن میں اَدَل کی خانہ بدوش ریاست بھی شامل تھی، جنگیں کیں۔ اس نو تشکیل یافتہ سلطنت کا نام اوفات سب سے پہلے ابن سعید نے لکھا ہے، جس کے بیان کے مطابق اس علاقے کو جَبَرْتَہ (جَبَرْتَہ) کہتے تھے۔ قیاس یہ ہے کہ ریاست اوفات کبھی تو زبردست وثنی ریاست دَاموت کی باج گزار رہتی تھی اور کبھی عیسائی سلطنت حبشہ کی اور بعض اوقات خود مختار بھی ہو جاتی تھی۔ یہ مسلم ریاستوں (ہَدْیَہ، فُطَجار وغیرہ) میں سب سے زیادہ شمال میں تھی اور اس طرح جنوب کی طرف حبشہ کی پیش قدمی روکنے کے لیے ایک درمیانی (buffer) ریاست بن گئی۔ حَقّ الدِّین، جو عَمْدَہ ضیون کے ساتھ برسرِ پیکار تھا، ۱۳۲۸ء میں مغلوب ہو گیا اور اوفات کی ریاست سلطنت حبشہ کی باج گزار بن گئی۔ اس زمانے میں اوفات کے متعلّق العُمَری کے ایک اہم بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حدود مشرق کی جانب زَیْلَع تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہاں سلطنتِ حبشہ کے خلاف ہمیشہ علمِ بغاوت بلند ہوتا رہتا تھا۔ آزادی حاصل کرنے کی آخری کوشش سعد الدّین نے کی، جس کی شکست اور موت (۸۱۷ھ/ ۱۴۱۵ء) کے بعد یہ سلطنت ختم ہو گئی اور اس کا اصلی علاقہ سلطنت حبشہ میں شامل کر لیا گیا۔ جب وَلسمع مختصر سی جلاوطنی کے بعد یمن سے واپس آئے تو انھوں نے اپنے سابقہ صوبوں اَدَل و زَیْلَع کے علاقوں پر مشتمل ایک نئی ریاست قائم کی اور شاہانِ اَدَل یا شاہانِ زَیْلَع [رک بہ اَدَل و زَیْلَع] کا لقب اختیار کیا۔ ان کا پایۂ تخت پہلے دَکَر اور بعد میں ہَرَر [رک بآن] تھا۔

مآخذ: (۱) العمری: مَسَالِک الاَبْصَار، مترجمۂ Gaudefroy و Demombynes، ۱۹۲۷ء، ص ۱-۱۴؛ (۲) ابوالفداء: تَقْوِیم، ص ۱۶۱ و ترجمہ، ۲: ۲۲۹؛ (۳) ابن خَلْدُون، طبع دیسلان (de slane)، ۱: ۲۶۲ و ترجمہ ۲: ۱۰۷-۱۰۹؛ (۴) القَلْقَشَنْدی: صُبْح الاعشی، ۵: ۳۲۵-۳۳۲؛ (۵) المَقْرِیزی: اَلْاِلمام بِاَخْبَارِ مَن بِاَرْض الحَبَشَۃ مِنْ مُلُوک الاِسْلام، قاہرہ ۱۸۹۵ء؛ (۶) E. Cerulli: *Studi Etiopici*، ۱: ۵ ببعد؛ (۷) وہی مصنّف: *Documenti Arabi per la Storia dell Etiopia*، در *Mem. Linc.*، ۱۹۳۱ء؛ (۸) وہی مصنّف: *Il Sultanato dello Scioa nel Secolo XIII, Rassegna di Studi Etiopici*، ۱۹۴۱ء، ص ۵-۴۲؛ (۹) J. Perruchon: *Histoire des Guerres d' Amda ṣyon*، در *JA*، ۱۸۸۹ء؛ (۱۰) J. S. Trimingham: *Islam in Ethiopia*، ۱۹۵۲ء، ص ۵۸-۶۰، ۶۷-۷۵۔

(J. S. TRIMINGHAM)

---

* **اَوْقَات:** (ع)، وَقْت [رک بآن] کی جمع [نیز رک بہ زمان]۔
* **اَوْقَاف:** رک بہ وَقْف۔

---

* **اُوْگَنْڈہ:** رک بہ یُوگَنْڈا۔

---

* **اَوْلاد:** (اس کلمے کے بعد مورث اعلیٰ یا کسی بزرگ قبیلہ کا نام آتا ہے: دیکھیے اس بزرگ کے نام کے تحت)۔

---

* **اَوْلَادُ البَلَد**: ایک اصطلاح، جو سوڈان کی مَہدِیّہ تحریک (۱۲۹۹-۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۱ء-۱۳۱۵-۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) کے زمانے میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی تھی جو شمالی دریائی علاقوں کے قبائل میں سے تھے اور جن میں جماعت دَناقِلَہ اور جَعْلِیّین اہم ترین تھے۔ بہت سے اولاد البلد مستقل یا عارضی طور پر اپنے قبائلی مرکزوں سے بہت دور دریائے نیل کے کنارے آباد ہو گئے تھے۔ دنا قلہ کشتی ساز اور ملاح تھے اور خاص طور پر نیلِ ابیض کے کنارے آباد تھے۔ دنا قلہ اور جعلیّین دونوں نے سوداگروں اور بردہ فروشوں کی حیثیت سے کُرْدُفان، بَحْر الغَزَال اور دَارفُور میں اہم کردار ادا کیا۔ مہدی محمد احمد کو اولاد البلد سے اور بالخصوص ان سے جو مغرب اور جنوب میں منتشر تھے بہت مدد ملی۔ اس کے زمانے میں ان لوگوں کو بالعموم حکمران گروہ کی حیثیت حاصل رہی۔ جب [رمضان ۱۳۰۳ھ/] جون ۱۸۸۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے جانشین خلیفہ عبداللہ نے آہستہ آہستہ انھیں بڑے بڑے عہدوں سے علیٰحدہ کر دیا، لیکن منشی گری اور دوسری ادنیٰ ملازمتیں تحریک کے خاتمے تک زیادہ تر اولاد البلد ہی کے پاس رہیں۔ اولاد البلد میں سب سے بزرگ ''اشراف'' تھے، یعنی مہدی کے خویش و اقارب، جن کا نام نہاد سردار خلیفہ محمد شریف تھا۔ [۱۳۰۳-۱۳۰۴ھ/] ۱۸۸۶ء میں ان لوگوں نے عبداللہ کو تخت و تاج سے محروم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ مہدیوں کے مصر پر حملے اور [۱۳۰۶-۱۳۰۷ھ/] ۱۸۸۹ء میں تُوشکی کے مقام پر شکست فاش سے اولاد البلد کو بہت ضعف پہنچا، اس لیے کہ اس مہم میں زیادہ تعداد انھیں لوگوں کی تھی اور ان میں سے بہت سے میدانِ جنگ میں کام آئے، جن میں ان کا ممتاز ترین سپہ سالار عبدالرحمٰن النُّجُومی بھی شامل تھا۔ ۱۸۹۱ء میں اشراف اور دنا قلہ نے امّ دُرمان میں جو شورش برپا کی اسے عبداللہ نے فرو کر دیا اور اس کے بعد انھیں ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ۱۸۹۷ء میں المتمّمہ کے جعلیّین نے اپنے سردار عبداللہ سعد کے ماتحت علمِ بغاوت بلند کیا اور مصر کی انگریزی-مصری فوجوں سے، جو کچنر (Kichener) کے ماتحت تھیں، نامہ و پیام شروع کیا۔ محمود احمد کے ماتحت ایک مہدوی فوج نے اس بغاوت کا قلع قمع کر کے شہر کو تاراج کر ڈالا۔

مآخذ: (J. Ohrwalder) F. R. Wingate: *Ten years Capt-ivity in the Mahdis Camp*، لنڈن ۱۸۹۲ء، متعدد طباعتوں، میں اس اصطلاح کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔

(P. M. Holt)

---

* **اَوْلَادُ الشَّیْخ**: (بنوجَمُوِیّہ) یہ اصل میں صوفیہ اور شافعی فقہا کا ایک ایرانی خاندان تھا، جس کی ایک شاخ ہجرت کر کے شام چلی گئی اور متأخر ایوّبی سلاطین، یعنی المَلِک الکامل (۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ء-۶۳۵ھ/ ۱۲۳۸ء) اور اس کے بیٹوں کے دَور میں انھوں نے وہاں اچھا خاصا اثر و اقتدار پیدا کر لیا۔ اس قبیلے کے سب سے پہلے بزرگ، جن کے نام سے ہم واقف ہیں، ابوعبداللہ محمد بن حموِیہ الجُوَینی تھے، جنھوں نے ۵۵۰ھ/ ۱۳۳۵-۱۳۳۶ء میں وفات پائی۔ وہ ایک یگانۂ روزگار صوفی، فقیہ اور تصوّف کی کئی کتابوں کے مصنّف تھے (السَّمعانی؛ ابن الاثیر، ۱۱: ۳۰؛ ابوالفَرَج ابن الجَوْزی: المُنْتَظَم، مطبوعۂ حیدرآباد [دکن]، ۱۰: ۶۳-۶۴؛ یاقوت، ۲: ۴۲۵؛ حاجی خلیفہ، طبع فلوگل (Flügel)، ۳: ۶۱۲، عدد ۷۲۳۱)۔ ان کا پوتا عمادالدّین ابوالفَتْح عمر بن علی (م ۵۷۷ھ/ ۱۱۸۱ء) دمشق گیا اور ۵۶۳ھ/ ۱۱۶۷ء میں نورالدّین (۵۴۱ھ/ ۱۱۴۶ء-۵۶۹ھ/ ۱۱۷۴ء) نے اسے دِمشق، حَمَاۃ، حِمْص، بَعْلَبَک اور شام کے دوسرے مقامات کے تمام صوفی اداروں کا ناظر مقرر کر دیا۔ اس طرح وہ اس خاندان کی شامی اور مصری شاخ کا مورث اعلیٰ بنا، لیکن ایرانی شاخ سے اس خاندان کے تعلّقات قائم رہے (سبط ابن الجوزی: مرآۃ الزّمان، مطبوعۂ حیدرآباد [دکن]، ص ۲۷۲)۔ ان میں سے اس کا بھائی عبدالواحد (م ۵۸۸ھ/ ۱۱۹۲ء؛ ابن الفُرات: *cod Vind*، ۴: ۱۴۶-الف) اور اس کے بھتیجے کا بیٹا سعدالدّین محمد (م ۶۵۰ھ/ ۱۲۵۲ء؛ *EI*، ۲: ۲۶۰ و ۴: ۳۳؛ سِبط ابن الجَوزی، ص ۶۵۱) سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ عمادالدّین کے دو بیٹے تھے۔ شیخ الشیوخ صدرالدّین ابوالحسن محمد (۵۴۳ھ/ ۱۱۴۸ء-۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ء) خراسان میں پیدا ہوا، اپنے والد کے ساتھ دمشق آیا اور اس کا جانشین ہوا۔ اس نے مشہور و معروف قاضی ابن ابی عَصْرُون (م ۵۸۵ھ/ ۱۱۸۹ء) کی بیٹی سے شادی کی (ابن خلّکان، عدد ۳۳۴؛ ترجمہ de Slane، ۲: ۳۲-۳۵) اور اس کے بطن سے چار بیٹے ہوئے، جو اولاد (یا بنو) شَیْخُ الشُّیُوخ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ صَدْرُالدّین، جو سلطان مَلِک العادِل (۵۹۵ھ/ ۱۱۹۸ء-۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ء) کا دوست تھا، بعد میں مصر چلا گیا، جہاں اسے وہ تمام عہدے مل گئے جن پر وہ دمشق میں فائز تھا۔ الملک الکامل کے سفیر کی حیثیت سے بغداد جاتے ہوئے وہ موصل میں فوت ہو گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی تاج الدین ابومحمد عبداللہ (۵۷۲ھ/ ۱۱۷۷ء-۶۴۲ھ/ ۱۲۴۴ء) ۵۹۳ھ/ ۱۱۹۶ء میں المغرب گیا اور الموحد سلاطین، یعنی المنصور یعقوب (۵۸۰ھ/ ۱۱۸۴ء-۵۹۵ھ/ ۱۱۹۸ء) اور ناصر محمد (۵۹۵ھ/ ۱۱۹۸ء-۶۱۰ھ/ ۱۲۱۳ء) کی ملازمت کر لی اور سات برس تک فوجی خدمات انجام دیتا رہا۔ وہاں سے واپسی پر وہ دمشق میں مقیم ہو گیا اور اپنے باپ اور بھائی کی طرح شام کے پائے تخت کے صوفی اداروں کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس نے تاریخ کی کئی کتابیں لکھی ہیں، جن کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں۔ اندلس کے متعلق اس کی ایک تصنیف کا مخطوطہ ۶۶۸ھ/ ۱۲۶۹ء میں ابن خلّکان نے دمشق میں دیکھا تھا (ابن خلّکان، عدد ۸۳۹ و ترجمۂ دیسلان، ۴: ۳۳۷)۔ اس خاندان کی شہرت کا مدار صدرالدّین کے چار بیٹوں، بالخصوص فخرالدّین یوسف پر ہے۔ وہ ۵۸۰ھ/ ۱۱۸۴ء کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ اس نے سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا، چنانچہ الکامل نے ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء میں اسے اپنا سفیر مقرّر کر کے خلیفہ کے دربار میں بھیجا۔ اس نے جلد ہی ایک ماہر مدبّر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ ۶۲۴ھ/ ۱۲۲۹ء سے وہ ہوئن سٹافن (Hohenstaufen) شہنشاہ فریڈرک (Frèderick)

ثانی کے دربار میں الکامل کا سفیر رہا، یہاں تک کہ ۱۸ فروری ۱۲۲۹ء کو عہد نامۂ یروشلم طے ہوا۔ اس دوران میں وہ شہنشاہ کا دوست بن گیا، چنانچہ شہنشاہ اس سے غیر سیاسی امور پر بھی تبادلۂ خیالات کیا کرتا تھا اور اس نے [یروشلم سے شہنشاہ کے] اٹلی واپس آجانے کے بعد اسے دو خط لکھے (ابن نَظِیف الحَمَوی: تاریخ المَنْصُوری، طبع M. Amari، *Bibl. Sic. App.*، ۲۵:۲)۔ الکامل کے عہد کے آخری حصے میں فخر الدّین یوسف کئی جلیل القدر عہدوں پر فائز رہا اور دمشق میں سلطان کی وفات (رجب ۶۳۵ھ/فروری۔ مارچ ۱۲۳۸ء) کے بعد وہ مجلسِ شاہی کا رکن بھی رہا۔ قاہرہ واپس آنے کے بعد العادل الثانی بن الکامل نے اس کی خدماتِ حسنہ کے باوجود اسے نہ صرف موقوف کر دیا بلکہ قید بھی کر دیا۔ وہ ۶۴۳ھ تک معزول رہا اور بالآخر العادل کے جانشین اور بھائی الصالح نجم الدّین ایوّب بن الکامل (۶۳۷ھ/۱۲۴۰ء۔ ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء) نے اس کے تمام سابقہ اعزازات بحال کر کے مصری فوج کا سالار اعظم مقرّر کر دیا۔ ۱۲۴۹ء میں جب شاہ لوئی (Louis) نہم شاہ فرانس نے مصر پر حملہ کرنے کی دھمکی دی تو دفاع ملک کا کام فخر الدّین یوسف کے سپرد ہوا، لیکن جب اَفرنجی (Franks) دریاے نیل کے دہانے میں داخل ہو گئے تو اس نے دمیاط کو چھوڑ دیا اور اپنے لشکر سمیت جنوب میں المنصورہ کی جانب پسپا ہو گیا۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد جب الصالح کا انتقال ہو گیا (دوشنبہ، ۱۴ شعبان ۶۴۷ھ/ ۲۲ نومبر ۱۲۴۹ء) تو سلطانہ شجرۃ الدُّر نے سُلطان المُعَظَّم تُوران شاہ بن نَجْم الدّین ایّوب کی عدم موجودگی میں فَخْر الدّین کو نائب سلطنت مقرر کر دیا۔ اس اثنا میں صلیبی فوجوں کی پیش قدمی آہستہ آہستہ المنصورہ کی جانب جاری رہی اور اچانک حملے کے بعد دریاے نیل کو عبور کر کے شہر میں داخل ہو گئیں۔ فخر الدین جمعرات ۴ ذوالقعدہ ۶۴۷ھ/ ۸ فروری ۱۲۵۰ء کو جنگ میں کام آیا۔ اس کے تین بھائیوں، یعنی عماد الدین عمر، کمال الدین احمد اور معین الدین حسن، نے اپنی سیاسی سرگرمیاں الکامل کے آخری دور میں جا کر شروع کیں؛ اس سے پہلے وہ قاہرہ میں شافعی مذہب کی درس وتدریس میں مشغول تھے۔ دمشق میں الکامل کی وفات کے بعد یہ تینوں بھی مجلسِ شاہی کے رکن چن لیے گئے تھے۔ یہ عماد الدین عمر ہی کے اثر ورسوخ کا نتیجہ تھا کہ سلطان کے بھتیجے الجواد یُونُس بن مَوْدُود بن العادِل کو دمشق میں نائب سلطان منتخب کر لیا گیا۔ جب اس نے العادل الثانی کے خلاف سازش شروع کی تو سلطان نے عماد الدین کو دمشق واپس بھیج دیا تا کہ وہ الجواد کو تخت سے دست برداری پر مجبور کرے، لیکن الجواد نے اس کے پہنچتے ہی اسے گرفتار کر لیا اور پنجشنبہ ۲۶ جمادی الاولیٰ ۶۳۶ھ/ ۶ جنوری ۱۲۳۹ء کو قتل کرا دیا۔ ان چاروں بھائیوں میں سے کمال الدین احمد کو، جو چاروں بھائیوں میں سب سے کم مشہور ہے، الصالح نے ۶۳۷ھ/ ۱۲۴۰ء میں یافہ کے امیر تھیوبولڈ (Count Theobold) اور نبرہ (Navarre) کے بادشاہ سے صلح کا عہد نامہ مکمل کرنے کی غرض سے سفیر بنا کر بھیجا اور بعد ازاں اس فوج کا سالار مقرّر کیا جو دمشق کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے روانہ کی گئی تھی، لیکن الجواد اور الناصر داؤد بن المعظّم (م ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء) نے کمال الدین کو شکست دے کر قید کر لیا اور کوئی ایک سال بعد، یعنی ۱۳ صفر ۶۴۰ھ/ اگست ۱۲۴۲ء کو وہ غازہ میں فوت ہو گیا۔ سب سے چھوٹے بھائی معین الدین حسن کو الصالح نے ۶۳۷ھ/ ۱۲۴۰ء کو وزیر مقرر کیا اور چار سال بعد وہ فتحِ دمشق کے سلسلے میں اس کا نمائندہ اور سپہ سالار مقرر ہوا۔ ۶۴۲ھ/مئی ۱۲۴۵ء کے آخر میں محاصرہ شروع ہوا۔ چھے ماہ بعد معین الدین نے عماد الدین بن العادل (م ۶۴۸ھ/ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱ء) کو مجبور کر دیا کہ وہ شام کے پایۂ تخت سے نکل جائے، جس پر وہ ۶۳۷ھ/ ۱۲۳۹ء سے قابض تھا اور طے یہ ہوا کہ اس کے عوض اسے بعلبک، بُصْرٰی اور کچھ دوسرے مقامات دے دیے جائیں گے۔ معین الدین اس فتح کے بعد صرف چند مہینے زندہ رہ کر شنبہ ۲۴ رمضان ۶۴۳ھ/ ۱۲ فروری ۱۲۴۶ء کو بعارضۂ تپِ محرقہ فوت ہو گیا۔

تاج الدین محمد کے دو بیٹوں میں سے بڑا بیٹا سعد الدین خِضْر (۵۹۲ھ/ ۱۱۹۶ء۔ ۶۷۴ھ/ ۱۲۴۶ء) ایک چھوٹی سی تاریخی کتاب کا مصنّف ہے، جس سے سبط ابن الجوزی اور الذّہبی نے بنو شَیْخ الشُّیُوخ کے متعلق اپنی زیادہ تر معلومات حاصل کی ہیں۔

مآخذ: (۱) ابن الأثیر؛ سِبْط ابن الجَوْزی؛ ابن وَاصِل؛ ابو شامہ؛ ابن الفُرات؛ النُّوَیْری اور المَقْرِیْزی کے وقائع؛ (۲) المَقْرِیْزی: الخِطَط (بولاق)، ۲:۳۳۔۳۴؛ (۳) السُّبکی: طَبَقات الشَّافِعِیَّة الکُبْرٰی؛ (۴) Cl. Cahen Les: *Une source pour l' histoire des croisades 'Mémoires de sa'd ad-din ibn Hamawiya Juwaini*، در *Bulletin de la Faculté des Lettres de strasbourg*، در (۱۹۵۰ء): ۳۲۰۔۳۳۷؛ (۵) H. L. Gottschalk: *Die Aulād Šaiḥ aš-šuyuḥ Banū Ḥammawiya*)، در *WZKM*، ۵۳ (۱۹۵۶ء): ۵۷۔۸۷.

(H. L. GATTSCHALK)

اَولَادُ النّاس: مملوکوں کا اعلیٰ طبقہ، جس سے ایک مخصوص معاشرے کی تشکیل ہوئی۔ یہ معاشرہ ایسے غلاموں پر مشتمل تھا جنھیں بعد میں آزاد کر دیا جاتا تھا۔ یہ غیر مسلم غلام بیرونِ ملک سے ہوتے تھے اور اسلام میں داخل ہونے کے بعد فوجی تربیت کا مقرّرہ نصاب ختم کرنے کے بعد آزاد کر دیے جاتے تھے اور سب سے آخر میں یہ کہ ان کے نام عموماً غیر عربی ہوتے تھے۔ ان قواعد کا مقصد یہ تھا کہ مملوکوں کا اعلیٰ طبقہ غیر موروثی امرا پر مشتمل رہے، ممالیک کے بیٹے اور مملوک امرا مسلمان اور از روے پیدائش آزاد تھے، وہ مملوک سلطنت کی حدود میں پیدا ہوے، وہیں انھوں نے پرورش پائی اور ان کے نام بھی عربی ہوتے تھے۔ اس بنا پر یہ لوگ اعلیٰ طبقے میں شمار نہیں ہو سکتے تھے اور خود بخود اس سے خارج ہو جاتے تھے۔ انھیں غیر مملوکوں کی ایک دوسری وحدت میں شامل کر لیا جاتا تھا، جسے ''حلقہ'' [رک بآں] کہتے تھے؛ یہ حلقہ معاشرتی طور پر خالص مملوک وحدتوں سے ادنیٰ

سمجھا جاتا تھا۔ البتہ امرا و ممالیک کے بیٹے اعلیٰ طبقے کے افراد متصور ہوتے تھے اور ''اولاد الناس'' کہلاتے تھے، یعنی ''بہترین لوگوں یا امیروں کی اولاد''، اس لیے کہ ناس (لوگوں) سے مملوک مراد تھے جو [مذکورۂ بالا] مخصوص معاشرے کے ارکان تھے۔

اَولاَ دُالنّاس کو، چند مستثنیات کے سوا، امیرِ دہ نفر یا امیرِ چہل نفر سے بڑا مرتبہ کبھی نہیں مل سکا۔ بعض اوقات سیاسی اغراض کے تحت اولاد الناس کو مراعات دی جاتی تھیں، چنانچہ سلطان النّاصر حسَن (۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء- ۷۵۲ھ/ ۱۳۵۱ء) مملوک امرا کے مقابلے میں اولاد الناس امرا کو ترجیح دیتا تھا۔ سلطان حسن کے زمانے میں اولاد الناس کو جو برتری حاصل ہوئی اس کی حیثیت مستثنیات کی سی تھی، اور اس حیثیت سے بہت مختلف تھی جو دوسرے سلاطین کے عہد میں انھیں میسر تھی۔ چونکہ یہ لوگ معاشرے کا ایک ایسا عنصر تھے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ممالیک کی جماعت سے خارج تھا، لہٰذا ان کے لیے ترقی کرنے یا اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے مواقع نہایت محدود تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے حلقے میں اور اس کے ساتھ خود ان میں زوال رونما ہوتا گیا اور اب ان پر وہی پابندیاں عائد ہونے لگیں جو حلقے کے باقی افراد پر ہوتی تھیں، یعنی تنخواہ میں تخفیف، جاگیروں کی فروخت اور نقد رقم (بدِیل) کے عوض مہمّات میں شرکت سے معافی، تیر و کمان کے استعمال کی آزمائشیں، جو یہ ثابت کرنے کے لیے وضع کی گئیں تھیں کہ ان کی تربیت ناقص ہے، اس لیے وہ پختہ کار سپاہیوں کی سی مراعات کے مستحق نہیں۔ مملوک عہد کے اواخر میں حلقے کا نام ترک کر دیا گیا اور اولاد الناس کی اصطلاح بے حد عام ہوگئی۔

اَوْلاَ دُالنّاس اور حلقے کے دوسرے ارکان میں تقوٰی کی جانب رجحان اور عالمِ عقبیٰ کے معاملات میں انہماک بہت زیادہ تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگ فوجی خدمت ترک کر کے عالم اور فقیہ بن گئے (قب D. Ayalon: *Studies on the Structure of the Mamluk Army*، در *BSOAS*، ۱۹۵۳ء، ص ۴۵۶-۴۵۸ اور ص ۴۵۶، حاشیہ ۱ کے حوالے)۔

(D. AYALON)

---

* **اَولْجایتُو**: رک بہ اُلْجایتُو۔

---

* **اَوْلُونْیہ**: Awlonya، البانوی زبان میں ولورا (Vlora)، ویلونا (Valona)، جنوبی البانیا کا ایک شہر [رک بہ آرناؤدلُق]۔ اولونیہ، جسے عام طور پر وَلونا کہتے ہیں، آج کل کوئی دس ہزار باشندوں کا شہر ہے۔ یہ اسی نام کی ایک خلیج کے کنارے بندرگاہ سے کوئی ڈھائی میل یا چار کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس شہر نے Aulon کے نام کے تحت (جس سے اَوْلونہ (Avlona) بن گیا) نہایت اہم کردار ادا کیا (ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کے متعلق دیکھیے Konst. Jireček: *Valona im Mittelalter*؛ در Ludwing v. Thallcózy: *Illyrisch-albanische Forschungen*، میونخ-لائپزگ ۱۹۱۶ء، ۱: ۱۶۸-۱۸۷)۔ جون ۱۴۱۷ء میں ترکی فوج ولونا کے علاقے میں داخل ہوئی اور کنینہ اور برات کے قلعوں کے ساتھ ساتھ شہر پر بھی قابض ہوگئی۔ جنرل حمزہ بیگ اولونیہ کا سپہ سالار مقرر ہوا اور عثمانی ترکوں نے، جب اس سے پہلے بحیرۂ ایڈریاٹک کی کسی بندرگاہ پر قابض نہیں ہوے تھے، بہت جلد یہاں جہاز تیار کرنا شروع کر دیے۔ ۱۴۱۸ء میں وینس کی حکومت نے اولونیہ کو اس کی سابقہ مالکہ روجینا (Rugina) (ڈیوک مرکشا (Mirkša) کی بیوہ) کے لیے، جو وینس کی شہری تھی، واپس لینے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی اور اولونیہ ترکوں ہی کے قبضے میں رہا۔ حکومت نے عیسائیوں کو مالیہ گزار کسانوں کی حیثیت سے یہاں رہنے کی اجازت دے دی اور شہر پر ایک سنجاق بے حکومت کرتا رہا؛ یہ شہر مغرب کے خلاف ایک اہم مستحکم مقام بن گیا۔ چودھویں صدی کے مؤخّر زمانے تک اس کے باشندے (البانوی اور سلافی باشندوں کو چھوڑ کر) زیادہ تر یونانی تھے اور ان کا تعلّق اٹھارھویں صدی تک اُوہرِد (Ohrid) کی خودمختار یونانی اسقفی سے قائم رہا۔ سلطان محمد ثانی کے زمانے (یعنی پندرھویں صدی) میں اولونیہ کو دوبار اطالیہ کے علاقۂ اپولیہ (Apulia) پر حملے کے لیے فوجی مرکز بنایا گیا۔ جو وہاں سے صرف سینتالیس میل (پچھتر کیلومیٹر) کے فاصلے پر تھا (Otranto، قب F. Babinger: *Mehmed II der Eroberer und seine Zeit*، میونخ ۱۹۵۳ء، ص ۴۳۰ ببعد اور اطالوی ترجمہ *Maomertto II il Conquistatore ed il suo tempo*، Turien ۱۹۵۶ء، ص ۵۷۰ ببعد)۔ نہایت قابل حکّام ویلونا میں گورنر مقرّر رہوتے رہے۔ یہ سلطان سے خلوص رکھتے تھے، مثلاً گِدیک احمد پاشا، جس نے ویلونا کو اطالیہ میں بھیجے جانے والے سفیروں اور وکیلوں کے لیے ایک مرکزی مقام بنا دیا تھا۔ قریب ہی کنینہ کا قلعہ تھا، جس میں سلطان بایزید کے وقت سے ولورا (Vloras) آباد تھے اور شادی کے رشتوں کے ذریعے اس سے منسلک (قب اِکرم بے ولورا: *Aus Berat und vom Tomor*، سراجیوو ۱۹۱۱ء، *Zur Kunde der Balkan halbinsel*، عدد ۱۳)۔ یہ لوگ اپنا سلسلۂ نسب غازی سِنان پاشا سے ملاتے تھے (قب F. Babinger: *Rumelische Streifen*، برلن ۱۹۳۸ء، ص ۲۴ ببعد)۔ سترھویں صدی عیسوی میں اولونیہ ایک ایسی فصیل سے محصور تھا جو چوڑی بھی تھی اور بلند بھی۔ اس میں متعدّد برج تھے۔ قلعے کے اندر ایک مسجد تھی جو [سلطان] سلیمان قانونی نے تعمیر کرائی تھی اور اس کے وسط میں ایک مینار تھا، جو بالکل سالونیکا کے مینارِ سفید سے مشابہ تھا۔ یہ بھی اسی سلطان کے لیے غالباً ترکی معمارِ سنان پاشا نے بنایا تھا۔ اولیا چلبی نے اپنے وقت کے اولونیہ کا حال بڑی وضاحت سے لکھا ہے (قب جرمن ترجمہ از F. Babinger: *Rumelische Streifen*، ص ۲۵ ببعد)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اولونیہ کے مضافات میں سلسلۂ بکتاشیہ کا بہت زور تھا۔ چار سو سال تک ترکوں کے ماتحت رہنے کے بعد ۱۹۱۲ء میں البانیا کی خودمختاری کا اعلان اولونیہ ہی میں ہوا تھا اور یہ شہر سلطنت عثمانیہ سے علیٰحدہ ہوگیا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۰ء تک یہ شہر اطالویوں کے تصرّف میں رہا اور پہلی

عالمی جنگ کے دوران میں اسے بلقان کی فوجی مہمات کے سلسلے میں ایک اہم حربی مستقر کی اہمیّت حاصل رہی۔ صلح نامۂ رپالو (Rapallo) کی رُو سے بحیرۂ ایڈریاٹک کی چوکی اور آبناے ٹورنٹو کی روک (باستثناے جزیرۂ ساسِنو (Saseno) البانیا کو واپس دینا پڑی۔ اپریل ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۳ء کے موسمِ خزاں تک باقی البانیا کے ساتھ اولونیہ بھی ایک بار پھر اطالویوں کے قبضے میں چلا گیا۔ [جرمنی و اٹلی کی شکست کے بعد پھر اسے آزادی مل گئی۔]

مآخذ: متن مقالہ میں مندرجہ تصانیف کے علاوہ قبؔ W. M. Leake، Lord Holland، G. Weigand، Pouqueville C. Patch، L. Heuzey وغیرہ کے سفرنامے، جن میں قدیم اولونیہ کے حالات درج ہیں۔

(F. BABINGER)

---

* **اَوْلیاء:** رکؔ بہ وَلی۔

---

* **اَوْلیَا اَتا:** (ترکی، بمعنی ''مقدس باپ'') اس شہر کا پرانا نام جو ۱۹۳۸ء سے مشہور قزاخ شاعر ژمبول ژیبو (Džambul Džabaev) (۱۸۴۶-۱۹۴۵ء) کے نام پر جَمْبُول کہلاتا ہے۔ یہ شہر سوویٹ جمہوریہ کے صوبۂ قزاخ میں دریاے طَلَاس کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ ۱۹۱۷ء تک یہ روسی ترکستان میں سِیر دریا کے ضلع کا صدر مقام تھا اور اس کا نام ایک مقدّس بزرگ قرہ خان کے نام پر رکھا گیا، جس کا مزار یہاں ہے (اس بزرگ کا ذکر سترھویں صدی میں بھی آتا ہے، قبؔ محمود بن ولی: بحر الاسرار، مخطوطۂ انڈیا آفس، شمارہ ۵۴۵، ورق ۱۱۹-الف)۔ بزرگ کے مقبرے میں عمارت انیسویں صدی کی ہے اور اس پر کوئی کتبہ موجود نہیں۔ اس کے مقابلے میں کوچک اولیا (= چھوٹے پیر) کی قبر پر ۶۶۰ھ/ ۱۲۶۲ء کا کتبہ موجود ہے۔ یہ مزار شہزادہ اولوغ بیلگہ اقبال خاں داؤد بیگ بن الیاس کا ہے (یہ کتبہ *Zap. Vost. Otd. Imp. Russk. Arkheol. ob. va*، ج ۱۲، حصّہ ۵، میں شائع ہو چکا ہے)۔ اولیا اتا کا شہر، جو انیسویں صدی میں معرضِ وجود میں آیا، روسیوں نے ۱۸۶۴ء میں فتح کیا تھا۔ اس کے بعد اس کی حیثیت ایک فوجی قلعے کی ہوگئی۔ ۱۸۹۷ء میں اس کی آبادی ۱۲۰۰۶ تھی۔ یہ شہر پھلوں کی کاشت، مویشی اور لکڑی کی تجارت کی وجہ سے مشہور تھا۔ اولیا اتا کے مضافاتی ضلعے (رقبہ: ۷۱۰۹۷ مربع کیلومیٹر؛ آبادی: ۲۹۷۰۰۴) میں قدیم ترکی کتبے ۱۸۹۶ء میں دستیاب ہوے تھے (*Zep.*etc.، ج ۱۱)۔

آج کل کا شہر جَمْبُول تُرْکِسب کی سمت سوویٹ ریاست قِرغِز کی سرحد کے عین شمال کی جانب واقع ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اس کی آبادی انیس ہزار تھی، جو بڑھتے بڑھتے ۱۹۳۹ء میں باسٹھ ہزار سات سو ہوگئی، یہاں ایک شکر سازی اور ایک گوشت تیار کرنے کے کارخانے کے علاوہ کئی اَور کارخانے ہیں۔ یہ ایک تجارتی مرکز بھی ہے۔ (۱۹۳۶ء سے) جمبول کے ضلع کا رقبہ ۱۳۸۶۰۰ مربع کیلومیٹر ہے اور جنوب میں یہ علاقہ پہاڑی ہے؛ شمال میں بَدْ پَگ دَلَہ کا وسیع گیاہی میدان ہے۔

اولیا اتا یا جمبول کے قریب بظاہر طراز [رکؔ بآن] کا شہر تھا، جسے اولیا اتا کا نقشِ سابق سمجھا جا سکتا ہے۔

مآخذ: (۱) A. I. Dobromyslov: *Goroda Syr-Dar' inskoy oblasti*، تاشقند ۱۹۱۲ء؛ (۲) M. Mendikulov: *Nekotorye dannye ob istoričeskoy arkhitekture kazakhstana*، در *Izvestiya Akad. Nauk Kazakhskoy SSR*، ۱۹۵۰ء، ج ۲، عدد ۸۰؛ (۳) W. Barthold: *12 Vorlesungen zur Gesch. der Türken Mittel-asiens*، برلن ۱۹۳۵ء، ص ۲۰۶؛ (۴) *Writschaftsgeographie der UdSSR*، ج ۱۰؛ (۵) *Die Republiken Mittelasiens*، برلن ۱۹۴۴ء، ص ۱۱۳، ۱۳۹-۱۴۱؛ (۶) Brockhaus - Efron: *Entsiklopedičeskiy Slovár*، طبع اوّل، ۲: ۴۶۷ ببعد؛ (۷) *Bol' shaya Sovetskaya Enti-sklopediya*، طبع ثانی (۱۹۵۲ء)، ۱۴: ۲۰۶، ۲۰۸-۲۱۰ (مع ضلع کے نقشے اور تصویر کے)۔

(W. BARTHOLD [و B. SPULER])

---

* **اِوْلیا چلبی:** اولیا چلبی ولد درویش محمد ظِلّی؛ تاریخ ولادت: ۱۰ محرم ۱۰۲۰ھ/ ۲۵ مارچ ۱۶۱۱ء؛ وفات ۱۰۹۵ھ/ ۱۶۸۴ء سے پہلے نہیں ہوئی (قبؔ *WZKM*، ۱۹۴۸-۱۹۵۲ء، ۵۱: ۲۲۶، Anm. ۱۳۷ و *TM* (۱۹۵۵ء)، ۱۲: ۲۶۱)؛ مولد: استانبول۔ تقریباً چالیس برس تک (۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء بلکہ اس سے بھی پہلے ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۰-۱۶۳۱ء سے جب کہ اس نے استانبول میں گھومنا پھرنا شروع کر دیا تھا، ۱۰۸۷ھ/ ۱۶۷۶ء تک) وہ اپنی ان طویل سیاحتوں کے حالات قلم بند کرتا رہا جو اس نے کیں، کبھی تو نجی حیثیت میں اور کبھی اپنی سرکاری حیثیت میں یا امراے دولتِ عثمانیہ کی ہم رکابی میں، یہ سیاحتیں اس نے سلطنتِ عثمانیہ اور اس کے نواحی علاقوں میں کیں۔ اولیا چلبی نے یہ حالات اپنی اس تصنیف میں جمع کر دیے ہیں جو دس جلدوں میں ہے اور عام طور پر سیاحت نامہ یا بمطابق مخطوطۂ وی انا (فلوگل: عدد ۱۲۸۱) تاریخ سیاح (تذکرۂ سیاح) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی زندگی اور مشاہدات کا حال ان بیانات کے سوا جو اس نے خود سیاحت نامہ میں لکھے ہیں اَور کسی ذریعے سے معلوم نہیں، مگر ان بیانات پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا (دیکھیے بیان آئندہ)۔ اولیا چلبی کا اصلی نام معلوم نہیں۔ اولیا اس کا قلمی نام ہے، جسے اس نے اپنے استاد اولیا محمد افندی، امام دربار، کی تکریم میں اختیار کیا۔ اس کا باپ دربَار کا مخصوص زرگر (سراے عَامِرَہ بَشْقُوَیم جُوسُو، سَر زَرْگراں) تھا۔ اس کا نام درویش محمد ظِلّی تھا (قبؔ ۱: ۲۱۸) (یہاں اور بیان آئندہ میں استانبول اڈیشن کا حوالہ دیا گیا ہے؛ قبؔ بیان آئندہ)۔ اس کا انتقال جمادی الاُخْرٰی ۱۰۵۸ھ/ جون جولائی ۱۶۴۸ء میں ہوا (قبؔ ۲: ۴۵۸) اور اولیا کی تصریح کے مطابق اس کی عمر ایک سو سترہ سال (قمری) ہوئی۔ اس کی بابت کہا گیا ہے کہ وہ سلطان سلیمان قانونی کے (آخری) غزوات میں شریک تھا اور اُس کے بعد کے سلاطین

کے تحت بھی وہ بطور دست کار اپنے فرائض انجام دیتا رہا (قب ۱:۲۱۸ و ۴: ۱۰۲ و ۶:۲۶۸ و ۱۰: ۲۹۸)۔ اولیا کا باپ ضرور ایک خوش مزاج شخص ہوگا اور اس میں شاعری کا سلیقہ بھی ہوگا، کیونکہ اسی بنا پر اسے دربار کی توجّہ حاصل ہوئی۔ اولیا چلبی جس شجرۂ نسب کا اپنے باپ کی طرف سے دعوٰی کرتا ہے وہ متناقض اور بعید از قیاس و امکان ہے (قب ۱: ۴۲۴-۴۲۵ و ۳: ۴۴۴ و ۶: ۹۱۵)۔ اس کے آبا و اجداد غالبًا کوتاہیہ سے آئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے فتح قسطنطینیہ (۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء) کے بعد اس کا خاندان اس تاریخی شہر میں منتقل ہو گیا جو بعد میں استانبول کہلایا، مگر کوتاہیہ میں بھی اس کا مکان موجود تھا۔ بلکہ ایک مکان بروسہ کے Ine Bey محلّے میں بھی تھا نیز مَنِیسا کے اندر سَنْدِرخ میں کچھ جائداد تھی اور استانبول کے محلّۂ اُن کپَن میں چار دکانیں اور دو مکان تھے اور استانبول کے قریب قاضی کوئی میں انگور کا ایک باغ بھی تھا (قب ۱: ۱۷۴ و ۶: ۱۴۶ و ۹: ۸۱)۔ اس سے اولیا چلبی کی مالی حالت کا کچھ تصوّر ہوسکتا ہے۔ علاوہ بریں اس میں اتنا شعور ضرور تھا کہ اپنے آپ کو اونچے درجے کے لوگوں کے لیے کارآمد بنا سکتا تھا۔ ان دونوں باتوں نے جمع ہوکر اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ سیاحت کے شوق کو پورا کر سکے۔ اولیا کی ماں قفقاز (Caucasus؛ قافقاس، درقاموس الاعلام) کی تھی۔ وہ سلطان احمد اوّل کے عہد (۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳-۱۰۲۶ھ/ ۱۶۱۷ء) میں داخل سرائے ہوئی اور وہاں اس کی شادی سرکاری زرگر، یعنی اولیا کے باپ سے کر دی گئی۔ اولیا نے کہا ہے کہ اس کی ماں ملک احمد پاشا کی رشتے دار تھی (قب محمد ثریا: سجلّ عثمانی، ۴: ۵۰۹)، جو دراصل خود نسلًا قفقاز سے تعلّق رکھتا تھا، لیکن اولیا نے اس رشتے داری کے درجے کی بابت اپنے جو بیانات دیے ہیں وہ متضاد ہیں۔ یا تو اولیا اور ملک احمد پاشا کی مائیں دونوں بہنیں تھیں، یا اولیا کی ماں ملک احمد پاشا کی خالہ کی بیٹی تھی۔ ماں کی طرف سے اولیا کا اپنے بیان کے مطابق دفتر دار زادہ محمد پاشا سے بھی رشتہ تھا (قب سجلّ عثمانی، ۴: ۱۶۸) اور اِبْشِیر مصطفٰی پاشا بھی اس کا رشتے دار تھا (قب وہی کتاب، ۱: ۱۶۶؛ I. H. Uzun Çarşil: عثمانلی تاریخی، انقرہ ۱۹۴۷ء ببعد، ج ۲/ ۳، ص ۴۰۸؛ قب سیاحت نامہ، ۲: ۷۰، ۳، ۵۳ و ۵: ۱۶۸)۔ اولیا کے بیان کے مطابق اس کا ایک بھائی بھی تھا اور ایک بہن بھی (قب ۹: ۸۱)۔ جس وقت اس کی ابتدائی سکول کی تعلیم ختم ہو چکی تو وہ سات سال تک شیخ الاسلام حامد اِفندی کے مدرسے کا استانبول میں طالب علم رہا اور ایک مدرسۃ القرآن میں گیارہ سال تک حاضری دیتا رہا، جہاں اسے قاری بننے کی مشق کرائی گئی (قب ۱: ۳۶۰)۔ اس نے اپنے باپ سے بہت سی دست کاریاں بھی سیکھیں (قب ۱: ۲۴۳، ۴۰۴ و ۲: ۴۶۷ و ۶: ۳۸۱)۔ ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۶ء کی ''لیلۃ القدر'' میں اولیا نے قرآن مجید کو خاص خوش الحانی سے پڑھنے میں شہرت حاصل کی اور یہی مبارک واقعہ سلطان مُراد رابع کے سِلحدار ملک احمد آغا سے اس کی ملاقات کا سبب بنا، جس کے حکم سے اسے محلّ شاہی میں داخلہ مل گیا۔ یہاں اس نے خوش نویسی، موسیقی، عربی نحو اور تجوید کی اَور بھی زیادہ مشق کی۔ وہ اپنی خوش طبعی، فراست اور خوش بیانی کی بدولت اکثر سلطان کے حضور میں طلب کیا جاتا تھا۔ مُراد رابع کے بغداد پر حملہ کرنے (۱۰۴۸ھ/ ۱۶۳۸ء) کے تھوڑے دن پہلے وہ دربار کا ایک سپاہی مقرر کر دیا گیا (قب ۱: ۲۵۸)۔

اپنے سیاحت نامہ کی جلد اوّل میں (جو دس جلدوں پر مشتمل ہے) اولیا ذکر کرتا ہے: استانبول کے خاص شہر اور اس کے سواد کا۔ جلد دوم میں: بروسہ، اِزْمید، باطوم، طرابزون، اَبْخازیہ، اقریطش، اِرزروم، آذربیجان، جارجیا وغیرہ کا۔ جلد سوم میں: دمشق، سوریا، فلسطین، اُرومیہ، سِیواس، کُردستان، اَرمینیّہ، رومیلیا (بلغاریا، دوبرجا) کا۔ جلد چہارم میں: وان، تبریز، بغداد، بصرہ وغیرہ کا۔ جلد پنجم میں: وان، بصرہ، اَوکزکوف، ہنگری، روس، اناطولیہ، بروسہ، دردانیال، ادرنہ (اڈریانوپل)، مولوبیا، ٹرانسلوینیا، بوسنیا، دلماتیا، سوفیا کا۔ جلد ششم میں: ٹرانسلوینیا، البانیا، ہنگری، اُجوار (Neuhäusel) (یہاں ایک مہم کے بیان کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، جو بلاشبہہ اولیا کی ایک ذہنی اختراع ہے اور یہ کہ دس ہزار تاتاریوں نے آسٹریا، جرمنی اور ہالینڈ سے ہوتے ہوئے شمالی سمندر پر حملہ کیا)، بلگریڈ، ہرزے گووینا، رَگُوسا (دبروونک Dubrovnik)۔ مائٹی نیگرو، کِنِیْر سا، کروشیا (Croatia) کا۔ جلد ہفتم میں: ہنگری، بودا، اِرْلاؤ (یہاں وی انا کی طرف سفر کا بھی ذکر ہے، جو اس نے قرہ احمد پاشا کی سفارت میں شامل ہوکر ۱۰۷۵ھ/ ۱۶۶۵ء میں کیا۔ وہاں اس کی سکونت کا ذکر ہے۔ یہ بھی ایک اختراعی سفر ہے، جو اولیا نے ''سات بادشاہوں کے ملک'' میں کیا۔ شاید اس سے ووٹ دینے والوں کے سات حلقے مراد ہیں۔ لیکن اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا (اصل بیان میں خالی مقامات چھوڑے ہوئے ہیں)، تِمِسْوار (بَنَت، روم، تِمِصْوارا)، ٹرانسلوینیا، ولّاچیا، مالدیویا، کریمیا، قازق، جنوبی روس، قوقاز، داغستان اور اَرَق کا۔ جلد ہشتم میں: اَرَق، کافا، باغیچہ سرائے (کریمیا)، استانبول، اقریطش، مقدونیا، یونان، ایتھنز، ڈوڈی کَنِسز، پیلوپونیسس، البانیا، وَیلونا، اَلْبصان، اوکریڈا، اڈریانوپل اور استانبول کا۔ جلد نہم میں: (سفر حج بسوے مکّہ) جنوب مغربی اناطولیہ، سَمَرنا، اِیفیسُس، مدینہ، مکّہ اور سویز کا۔ جلد دہم میں: مصر (تاریخی مقامات کی سیر کے ساتھ)، قاہرہ، بالائی مصر، سوڈان، ابیسینیا کا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اولیا نے مصر میں آٹھ یا نو سال قیام کیا اور اس نے سیاحت نامہ کی آخری یعنی دسویں جلد یہیں مکمل کی۔ اس نے اس کی آخری تاریخ یکم جمادی الاولٰی ۱۰۸۷ھ/ ۱۲ جولائی ۱۶۷۶ء دی ہے، اگرچہ وہ ان واقعات سے بھی واقف ہے جو ۱۰۹۳ھ/ ۱۶۸۲ء میں بلکہ اس کے بھی بعد رونما ہوے (قب ۱۰: ۱۰۴۸ قب تفصیل اوپر آ گئی ہے)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام استانبول میں گزارے، جہاں وہ اپنی کتاب کی ترتیب میں مشغول رہا، جو غالبًا متفرق اوقات میں تھوڑی تھوڑی کر کے لکھی گئی تھی اور اسے آخری بار ترتیب دینا ضروری تھا۔ اس ضرورت کو اولیا نے کبھی پورے طور پر پورا نہیں کیا جیسا کہ مخطوطات سے ظاہر ہے۔

اولیا ایک ایسا ادیب ہے جس کی تخلیقات میں تخیل کا حصّہ فراواں ہے۔ اس کا میلان عجائبات اور پُر خطر حوادث کی طرف بہت نمایاں ہے۔ وہ خشک تاریخی واقعے کی نسبت افسانے کو زیادہ پسند کرتا ہے، دل کھول کر مبالغہ آمیزی کرتا ہے اور کبھی کبھی تفریحی اور خندہ آور حکایات سے بھی احتراز نہیں کرتا؛ چنانچہ اس کے سیاحت نامہ کو سترھویں صدی کے تفریحی ادب میں اوّلیں مقام حاصل ہے، جو اس زمانے کے دانشوروں کی تفریحی اور تعلیمی (دونوں) ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ چونکہ وہ بارہا سترھویں صدی کے ترکی روایتی اسالیبِ بیان کی اصطلاحات سے کام لیتا ہے اور عوامی بول چال کا بھی خیال رکھتا ہے اور کبھی کبھی مرصّع اسلوبِ بیان کے فقرے اور محاورے بھی لکھ جاتا ہے اس لیے اس کی تحریر کو لوگوں کا ایک وسیع حلقہ سمجھ لیتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنے ایسے سفروں کے حالات بھی لکھ جاتا ہے جن کی بابت صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان پر کبھی نہیں جا سکا۔ ادبی لیاقت کے اظہار کا شوق اکثر اسے اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ بعض اشیا یا حوادث کا اس طرح ذکر کرے گویا انھیں اس نے خود دیکھا ہے یا خود اس پر گزرے ہیں، حالانکہ گہری تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ان کا یا تو سماعی علم تھا یا ان کے لیے وہ ایسے ادبی مآخذ کا مرہونِ منت ہے جن کے وہ حوالے نہیں دیتا۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود سیاحت نامہ کو تاریخِ ثقافت، عوامی روایات اور جغرافیہ سے متعلّق معلومات کا ایک بھرپور گنجینہ کہا جا سکتا ہے۔ اگر لغوی اعتبار سے بنیادی امور کی تحقیق کر لی جائے اور کتاب کے مضامین کو ضروری تنقید کے تحت جانچ لیا جائے تو اس کی قدر و قیمت خصوصیت کے ساتھ بڑھ جائے گی اس تصنیف کی دل کشی کی یہ وجہ بھی کچھ کم نہیں کہ یہ سترھویں صدی کے ترکی (عثمانی) مبصّرین کے مغرب سے متعلق افکار و غیر مسلّم رجحانات پر اور معاصر عثمانی مملکت کے انتظامِ ملکی پر روشنی ڈالتی ہے۔

اولیا چلبی کی سیرت اور تصانیف کا اس وقت تک سب سے گہرا مطالعہ جاوید بیسون نے کیا ہے (قب بیانات آئندہ)، چنانچہ اس سلسلے میں ہم اپنی تمام معلومات کے لیے اسی کے رہینِ منّت ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاحت نامہ کا ایک جدید نسخہ تنقیدی اعتبار سے مرتّب کر کے شائع کیا جائے، کیونکہ اس کی معلومات سے پورا فائدہ اٹھانا اسی وقت ممکن ہوگا۔ بیسون کے خیالات کا کچھ حصّہ Meşkûre Eren کی قابلِ قدر تحقیق میں آ گیا ہے۔ (دیکھیے بیان آئندہ) اور جو سیاحت نامہ کی پہلی کتاب تک محدود ہیں۔ اپنے ان اکتشافات کی بنیاد پر جو اس نے اس کے مخطوطے سے حاصل کی ہیں ڈاکٹر ایرن نے اولیا کے طریقِ کار کی توضیح کی ہے اور سیاحت نامہ کی بہت سی خالی جگہوں اور ناتمام عبارتوں کی طرف توجہ دلائی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف اپنی تصنیف کو اَور آگے بڑھانا اور اسے آخری طور پر منقّح کر کے پیش کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ اس ارادے کی تکمیل نہ کر سکا۔ اس نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اولیا نے اپنے بیانات کے لیے ادبی مآخذ کا بکثرت استعمال کیا ہے، بلکہ ان مادّہ ہائے تاریخ کے لیے بھی جو اس نے نقل کیے ہیں ان سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر ایرن نے ان ادبی مآخذ کی ترتیب وار فہرست بنائی ہے (اور یہ سب مآخذ سیاحت نامہ کی جلد اوّل سے متعلق ہیں)، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے: (۱) وہ مآخذ جن سے اولیا نے کام لیا اور ان کا نام بھی بتا دیا؛ (۲) وہ مآخذ جنھیں اولیا نے استعمال تو کیا لیکن ان کا ذکر نہیں کیا۔ اس طبقے میں حسب ذیل مآخذ آتے ہیں:- عالی: کنہُ الاخبار (قب Babinger، در *GOW*، ص ۱۲۶ ببعد)؛ ابراہیم پیچوی: تاریخ (قب Babinger، ص ۱۹۲ ببعد)؛ نوائی زادہ عطائی: حَدائِق الحقائق فی تکملۃ الشقائق (قب Babinger، ص ۱۷۱ ببعد)؛ ساعی: تذکرۃ البُنیان (قب Babinger، ص ۱۳۷ ببعد)؛ عَوْنی: جوامع الحکایات، ترکی ترجمہ از جلال زادہ صالح (قب مخطوطۂ استانبول طوپ قپوسرای، ریون کوشکی، عدد ۱۰۸۵-۶۹۳ الف)؛ بصیری: لطائف (۱۰۰-۱۱۴) (جس سے قینالی زادہ حسن چلبی: تذکرہ، مخطوطہ در کتاب خانۂ جامعۂ استانبول، T.Y. ۲۵۲۵، ۷۴ الف، اور مادّہ ہائے تاریخ منظوم، جسے ڈاکٹر ایرن نے نقل کیا ہے)؛ (۳) وہ مآخذ جن کا اولیا نے ذکر کیا ہے مگر استعمال نہیں کیا۔

سیاحت نامہ کے مخطوطات

استانبول: مجموعۂ پرتو پاشا، عدد ۴۵۸-۴۶۲؛ طوپ قپوسرای، بغدت کوشکی، عدد ۳۰۰-۳۰۴؛ بشیر آغا، عدد ۴۴۸-۴۵۲ (۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء کا نسخہ)۔ ان مخطوطات میں اس کتاب کی مکمل دس جلدیں ہیں۔ علاوہ ازیں طوپ قپو سرای، بغدت کوشکی، عدد ۳۰۴ (ج ۱ و ۲)، عدد ۳۰۵ (ج ۳ و ۴)، عدد ۳۰۶ (ج ۹)، عدد ۳۰۷ (ج ۵)، عدد ۳۰۸ (ج ۷ و ۸)؛ طوپ قپوسرای، ریون کوشکی، عدد ۳۶۶/۳۷ تا ۱۴۵۷/۳۶۹ (ج ۶، ۷، ۸، ۹)؛ حمیدیہ، عدد ۹۶۳ (ج ۱۰)؛ کتاب خانۂ جامعۂ استانبول، عدد ۲۳۷۱ (ج ۱، نسخہ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶-۱۷۵۷ء)، عدد ۵۹۳۹ (ج ۱، ۲ نسخہ ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲-۱۷۴۳ء کی نقل)؛ بِلدِز، تاریخ قِسمی، عدد ۴۸ (ج ۱۰)۔ وی انا: کتاب خانۂ ملّی، عدد ۱۹۳ H.O. (ج ۴)، قب G. Flügel: *Die arabischen, persischen und türkischen Handschriften der kaiscrlichkönig-lichen Hofbibliothek zu Wien.*، وی انا ۱۸۶۵-۱۸۶۷ء، ۲: ۴۳۳، عدد ۱۲۸۱؛ Cod. mist ۱۳۸۲ (ج ۱)۔ لنڈن: رائل ایشیاٹک سوسائٹی، عدد ۲۲ و ۲۳ (ج ۱، ۲، ۳، ۴)۔ مانچسٹر: یونیورسٹی لائبریری، Lindsay کا مجموعہ، عدد ۱۴۲ (ج ۳، ۴)۔ باسلے: R. Tschudi کا مجموعہ (ج ۱، ۲، ۳)۔ میونخ: (?) Bayr. Staats-bibliothek، Th. Menzel کا مجموعہ (ج ۱، ۲، ۳، ۴، ۵).

سیاحت نامہ کے مطبوعہ نسخے

سیاحت نامہ، کتابِ اوّل، سے کچھ منتخبات لیے گئے اور اس میں ایک مقدمے کا اضافہ کر کے منتخبات اولیا چلبی کے نام سے ایک معمولی سا نسخہ چھاپا

گیا، استانبول ۱۲۵۸ھ (۱۵۰ صفحات) و ۱۲۶۲ھ (۱۴۳ صفحات)؛ بولاق ۱۲۶۴ھ (۱۴۰ صفحات)؛ استانبول تقریباً ۱۸۹۰ء (۱۰۴ صفحات، چار تہی)۔ مکمل ایڈیشن: ج ۱-۶، استانبول ۱۳۱۴-۱۳۱۸ھ (اِقدام پریس)؛ ج ۱-۶، طبع احمد جودت و نجیب عاصم اور چھٹی جلد بشمولیت Karácson۔ طباعت کی اغلاط، متروکات اور ممنوعہ عبارات کی وجہ سے اس ایڈیشن کی قدر بہت کچھ گھٹ گئی ہے۔ ج ۷ و ۸ ''ترک تاریخ انجمنی'' کی طرف سے چھپیں اور اس میں متعدد مخطوطات سے مدد لی گئی، طبع کلِسلی رفعت بلّے، استانبول ۱۹۲۸ء (مطابع دولت و آثار خانیّہ)۔ جلد ۹، استانبول ۱۹۳۵ء (Devlet Matbaasi) اور ج ۱۰، استانبول ۱۹۳۸ء (دولت مطبعہ سی) وزارت تعلیم، ترکیہ، نے چھاپیں، لیکن افسوس کہ جدید تر کی رسم الخط میں ہونے کی وجہ سے اس کا استعمال محدود ہے۔ ایک ناقدانہ اور فاضلانہ مطبوعہ نسخے کی جو عربی رسم الخط میں ہو، یقیناً بہت سخت ضرورت ہے۔

مآخذ : تاریخی ترتیب کے مطابق : (۱) Hammer - Purgstall: *Staatsverfassung*، ۱:۵۵۴-۴۷۰ (ج ۱-۴ کی مفصل فہرست مضامین موجود ہے)؛ (۲) وہی مصنّف: *Narrative of travels in Europe, Asia and Africa by Ewliya Efendi*، لنڈن ۱۸۳۴-۱۸۵۰ء (ترجمۂ ج ۱ و ۲)؛ (۳) M. Bittner: *Der Kurdengau Uschnûje und die Stadt Urûmîje*، وی انا ۱۸۹۵ء؛ (۴) A. Šopov: *Evlija Čelebi*، در *Periodičesko spisanie na Bŭlgarskoto Knižovno Družestvo v Sofija*، ج ۶۲ (۱۹۰۲ء)؛ (۵) I. Karácson: *Evlia Cselebi török világutozó Mágyarországi utazásai 1660-1664*، بوڈاپسٹ ۱۹۰۴ء (ج ۵ و ۶ کے ایک بڑے حصّے کا ترجمہ)؛ (۶) D. S. Čohadzič: *Putopis Evlije Čelebije v srpskim zemljama v XVII v.*، در *Spomenik Srpske Kraljevske Akademije*، ج ۴۲ (۱۹۰۵ء)؛ (۷) G. Germánus: *Evlija Cselebi a XVII századbeli Törökországi czehékröl*، در *Keleti Szemle*، ج ۸ (۱۹۰۷ء)؛ (۸) I. Karácson: *Evlija Cselebi török világutazó Magyarországi utazásai 1664-1666*، بوڈاپسٹ ۱۹۰۸ء (ج ۷، مطبوعۂ استانبول کا ترجمہ ص ۴۴۶ تک)؛ (۹) D. G. Gadžanov: *Pŭtuvane na Evlija*، در *Periodičesko Spisanie na Bŭlgarskoto Knižovno Družestvo v Sofija*، ج ۷۰، ۱۹۰۹ء؛ (۱۰) A. H. Lybyer: *The Travel of Evlia Effendi*، در *JAOS*، ۳۷ (۱۹۱۷ء): ۲۲۴-۲۳۹؛ (۱۱) G. I. Cialicoff: *Din călatoria lui Evliya Celebi*، در *Arhiva Dobrogei*، ج ۲ (۱۹۱۹ء)؛ (۱۲) R. Hartmann: *Zu Evlija Tschelebi's Reisen im oberen Euphratund Tigrisgebiet*، در *Isl.*، ۹ (۱۹۱۹): ۱۸۴-۲۴۴؛ (۱۳) W. Björkman: *Ofen zur Türkenzeit*، Hamburg ۱۹۲۰ء؛ (۱۴) Carra de Vaux: *Les penseurs de l'Islam*، پیرس ۱۹۲۱ء، ج ۱؛ (۱۵) F. Taeschner: *Die geographische Literatur der Osmanen*، در *ZDMG*، ۷۰ (۱۹۲۳ء): ۳۱-۸۰، ۱۴۴؛ (۱۶) عثمانلی مؤلفلری، ج ۳؛ (۱۷) F. Taeschner: *Das anatolische Wegenetz*، لائپزگ ۱۹۲۴-۱۹۲۶ء؛ (۱۸) Babinger، در *GOW*؛ (۱۹) P. Pelliot: *Le prétendu vocabul-aire mongol des Kaitak du Daghestan*، در *JA*، ج ۲۱۰ (۱۹۲۷ء)؛ (۲۰) W. Köhler: *Die Kurdenstadt Bitlis nach dem türkischen Reisewerk des Ewlijā Tchelebi*، میونخ ۱۹۲۸ء؛ (۲۱) F. Taeschner: *Die neue Stambuler Ausgabe von Evlijā Tschelebis Reisewerk*، در *Isl.*، ۱۸ (۱۹۲۹ء): ۲۲۹-۳۱۰؛ (۲۲) F. Babinger: *Ewlija Tschelebi's Reisewege in Albanien*، در *MSOS As.*، ۳۳ (۱۹۳۰ء): ۱۳۸-۱۷۸؛ (۲۳) S. Khudaverdógolu: Ὁ Εβλιᾶ Τσελεμπῆ ἀνά ταζ χωραζ, ελληνιχαζ، در Ελληνχά ج ۴ (۱۹۳۱ء)؛ (۲۴) D. Tzortzóglou: Τά περί Ἀηνών χεφάλαια τοῦ Εβλιᾶ Τσελεμπῆ، در Ελληχὰ ج ۴ (۱۹۳۱ء)؛ (۲۵) P. Pelliot: *Les formes turques et mongoles dans la nomenclature zoologique du Nuzhatu-'l-Ḳulūb*، در *BSOS*، ۶ (۱۹۳۰-۱۹۳۲ء): ۵۵۵-۵۸۰؛ (۲۶) I. H. Uzunçarşili: کوتاهیه شهری، استانبول ۱۹۳۲ء؛ (۲۷) A. Antalffy: *Călătoria lui Evlia Celebi prin Mol-dava in anul 1659*، در *Buletinul Comisiei lstorice a României*، ج ۱۲ (۱۹۳۳ء)؛ (۲۸) J: Deny; *Les pérégrin-ations du muezzin Evliyâ Tchelebi en Roumanie (XVIIe siêcle)*، در *Mélanges offerts à M. Nicolas lorga*، پیرس ۱۹۳۳ء؛ (۲۹) محمد خالد: *Evliyâ Çelebi'ye göre Azerbaycan şehirleri*، در *Azerbaycan Yurt Bilgisi*، ج ۲، استانبول ۱۹۳۳ء؛ (۳۰) I. Spatháres: Η Δυτιχη Θράχη χατὰ τὸν Ἐβλιγιὰ Τσελεπήν, περιηγηιὴν τοῦ *XVII* αἰῶνοζ، در Θραχιχά ج ۴ (۱۹۳۳ء)؛ (۳۱) R. Bleichsteiner: *Die kauk asischen Sprachproben in Evliya Çelebi' s Seyahetname*، در *Caucasica*، ۱۱ (۱۹۳۴ء): ۸۴-۱۲۶؛ (۳۲) P. Wittek: *Das Fürstentum Mentesche*، استانبول ۱۹۳۴ء؛ (۳۳) H. G. Farmer: *Turkish instruments of Music in the Seventeenth Century*، در *JRAS*، ۱۹۳۶ء، ص ۱-۴۳؛ (۳۴) H. Wilhelmy: *Hochbulgarien*، Kiel ۱۹۳۵-۱۹۳۶ء؛ (۳۵) A. Sakisian: *Abdal khan, Seigreur kurde de Bitlis au XVIIe s. et ses trésors*، در مجلۂ ترکی، ۲۲۹ (۱۹۳۷ء): ۲۵۳-۲۷۰؛ (۳۶) I. Spatháres: Ἡ Ἀνατολιχὴ Θράχη χατά τὸν Τοῦρχον περιηγητὴν (Μεταφρασιζ) Ἐβλιγία Τσελεμπὴν، در Θραχιχα، ج ۷، τοῦ *XVII* αἰῶνοζ؛ (۳۷) F. Babinger: *Rumelische Streifen (Albania)*،

برلن ۱۹۳۸ء؛ (۳۸) H. J. Kissling: *Einige deutsche Sprachproben bei Evliyā Čelebi*، در *Leipziger Vierteljahrsschrift für Südosteuropa*، ج ۲ (۱۹۳۸ء)؛ (۳۹) V. Garbouzova: *Evliya Tchelebi sur les joaillers turcs au XVIIe s.*، در *Travaux du Département Oriental, Musée de l'Ermitage, Leningrad*، ج ۳ (۱۹۴۰ء)؛ (۴۰) F. Bajraktarević: *Türk-Yugoslav kültür münasebetleri Ikinci Turk Tarih Kongresi 1937*، استانبول ۱۹۴۳ء؛ (۴۱) A. Bombaci: *Il viaggio in Abissinia di Evliyā Čelebi (1673)*، در *AIUON*، سلسلۂ نو، ۲ (۱۹۴۳ء): ۲۵۹-۲۷۵؛ (۴۲) P. Darvingov: *Un grand voyageur turc*، در *La Bulgarie*، ۱۶ مئی ۱۹۴۳ء؛ (۴۳) F. Babinger: *Beiträge zur Frühgeschichte der Türkenherrschaft in Rumelien*، Brünn ۱۹۴۴ء؛ (۴۴) (آ)، ترکی، مقالۂ اولیا چلبی، از جاوید بیسون (M. Cavid Baysun)؛ (۴۵) H. W. Duda: *Balkantürkische studien (Üsküb)*، وی انا ۱۹۴۹ء؛ (۴۶) R. F. Kreutel: *Ewlija Čelebīs Bericht über die türkische Grossbotschaft des jahres 1665 in Wien*، در *WZKM*، ج ۵۱ (۱۹۴۸-۱۹۵۲ء)؛ (۴۷) جاوید بیسون: *Evliya Çelebi'ye dáir notlar*، در *TM*، ج ۱۲ (۱۹۵۵ء)؛ (۴۸) A. Bombaci: *Storia della letteratura*، Milan ۱۹۵۶ء؛ (۴۹) H. J. Kissling: *Beiträge zur Kenntnis Thrakiens im 17. Jahrhundert*، Wiesbaden ۱۹۵۶ء؛ (۵۰) R. F. Kreutel: *Im Reiche des goldenen Apfels* (Vienna)، Graz ۱۹۵۷ء؛ (۵۱) M. Eren: *Evliya Çelebi Seyāḥatnamesi birinci cildinin kaynaklari üzerinde bir araştirma*، استانبول ۱۹۶۰ء؛ (۵۲) C. B. Ashurbeyle: *Seyāḥatnāme Evliya Čelebi kak istočnik po izučeniyu sotsial' no-ekonomičeskoi i palitičeskoi istorii gorodov Azerbaydjana v pervoy polovine XVII veka* (*The Seyāḥatnāme of Evliyā Čelebi as a source for the study of the social- économic and political history of the towns of Azerbaydjān in the first half of the 17th century*)، سوویٹ وفد کے مقالات، جو پچیسویں مؤتمرِ مستشرقین، منعقدۂ ماسکو، ۱۹۶۰ء، میں پڑھے گئے؛ (۵۳) اولیا چلبی: *Kniga puteshestviya perevod i kommentarii*، در *Zemli Moldavii i Ukrainī*، ماسکو ۱۹۶۱ء؛ دیگر حوالے در Pearson، ص ۲۷۷ و تکملہ، ص ۸۴.

(H. W. DUDA و J. H. MORDTMANN)

---

* **اَوَّل**: (مؤنث: اُولٰی؛ جمع: اوَائل [واُوَل؛ ایک جمع اَوَّلُون بھی آتی ہے (لسان)]۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ابتدائے امر بھی ہیں اور انتہائے امر بھی (تاج)۔ جب اللہ تعالیٰ کے متعلّق هُوَ الأَوَّل کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہے جس سے پہلے کوئی چیز موجود نہیں اور جن لوگوں نے اس جگہ اوّل کے معنی پہلا، غیر محتاج یا مستغنٍ بنفسہٖ کیے ہیں انھوں نے بھی اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امام راغب نے وَلا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ کے معنی کیے ہیں: کفر کے پیشوا نہ بنو (مفردات) اور یہ بھی لکھا ہے کہ اوّل وہ ہے جس سے پہلے کوئی نہیں اور جس پر دوسرا مرتب ہو اور یہ لفظ کئی طرح استعمال ہوتا ہے: (۱) زمانی لحاظ سے مقدم ہو؛ (۲) رتبے اور ریاست کے لحاظ سے مقدم ہو، جیسے کہتے ہیں اَلْاَمِيْرُ اَوَّلًا ثُمَّ الْوَزِيْرُ؛ (۳) وضع اور نسبت کے لحاظ سے مقدم، جیسے عراق سے جانے والے کو کہا جائے العراق سے نکل کر پہلے قادسیہ آئے گا پھر فید؛ (۴) کسی چیز کے بنانے میں جو پہلا مرحلہ ہو، جیسے مکان کی تعمیر میں اوّل بنیاد پھر عمارت (مفردات)۔ اوّل کا لفظ آخر کا نقیض ہے۔ اس کے مادّے کی تعیین کے لیے دیکھیے لسان، بذیل فصل الواو، حرف اللام؛ مفردات تحت اوّل؛ [نیز الجرجانی: التعریفات، مادّہ الاوّل].

(۱) ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر لفظ اوّل کو مسلمان فلسفیوں کے ہاں ارسطو اور فلاطینوس (Plotinus) کے عرب مترجمین نے یونانی الفاظ ἀρχαί اور πρῶτος کے عربی مرادف کے طور پر داخل کیا۔ اس طرح ارسطو کی ''فرضی الٰہیات'' (*Pseudo-Theology*) یعنی فلاطینوس کے مقالات (*Enneads*) کے آخری تین مقالوں کے عربی ترجمے میں ''اوّل'' کی اصطلاح اوّلیں ہستی یا اوّلیں مخلوق کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ اسی طرح رسائل اخوان الصّفا میں ہمیں ''القصد الاوّل'' کی ترکیب ملتی ہے، جس سے مراد ذات الٰہی سے نکلی ہوئی سب سے پہلی علّت ہے۔ یہی اصطلاح بُدّ العارِف اور ابن سَبْعِین کے اسئلۃ صقلویۃ میں بھی ملتی ہے۔ اسے معتزلہ کے علاوہ الکِندی اور الفارابی نے بھی استعمال کیا ہے، لیکن فلسفیانہ مصطلحات میں اس لفظ کے استعمال کو منظّم صورت ابن سینا نے دی، چنانچہ اس کے بعد لفظ 'اوّل' مشرق و مغرب کے ان اہلِ فکر میں عام طور سے رائج ہو گیا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ابن سینا کی فکریات سے واقف تھے.

(۲) حکما کے یہاں صیغۂ واحد میں لفظ اوّل کو اوّلیں ہستی کے معنوں میں ذاتِ خداوندی کے لیے استعمال کیا گیا ہے، چنانچہ واجب الوجود کی اصطلاح کے ساتھ ساتھ یہی خدا کا وہ نام ہے جسے مسلمان حکما نے سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ ان معنوں میں یہ لفظ بالعموم تنہا آتا ہے، اگرچہ بعض اوقات المَبْدَأُ الاوّل، الاصول الاوّل کی سی تاکیدی تکراری ترکیبیں بھی نظر آجاتی ہیں.

(۳) بعض مرکب ترکیبوں میں لفظِ اوّل اساسًا علتی تقدّم (casual priority) کو ظاہر کرتا ہے اور ثانیًا تقدّم زمانی کو، جیسا کہ اَلْمَعْلُولُ الْاَوَّل، اَلْاَجْسَامُ الْاُوَلی، اَلْحَرَكَةُ الْاُوْلٰی کی اصطلاحوں میں.

(۴) بصورتِ جمع اوائل [رک بآں] ان امور کو ظاہر کرتا ہے جو تاریخ کے لحاظ سے مقدّم ہوں، یا جنھیں سب سے پہلے رائج کیا گیا ہو۔ فلسفے میں یہ اصطلاح

ازمنۂ گزشتہ کے مفکّرین کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

(۵) اسی طرح بصورتِ جمع ''اوائل''، ہستی یا علم کی ترتیب میں پہلے اصولوں کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً المَبادِی الاُولٰی، یعنی ترتیب وجود میں پہلے اصول یا عقلِ مجرّد؛ المعقولات الاولٰی، یعنی پہلی قابلِ فہم چیزیں، یعنی علم کے اوّلیں اصول۔

(۶) لفظ اوّل سے اسم مجرّد اَوَّلِیَّہ (جمع: اَوَّلِیّات) بنایا گیا ہے۔ حکمت میں یہ اصطلاح اس شے کی ذات کو ظاہر کرتی ہے جو پہلی ہو۔

(۷) بصورت جمع لفظ اَوَّلِیّات بلا امتیاز یونانی الفاظ τὰ πρῶτα اور ἀρχαί کے ترجمے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس سے علم کے اعتبار سے پہلے اصول مراد لیے جاتے ہیں، یعنی وہ قضایا جو بذات خود بداہۃً ظاہر و باہر ہوں (نیز رک بہ الاسماء الحسنٰی)۔

مآخذ: (۱) رسائل اِخوانِ الصفا، قاہرہ ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۸ء، ۴: ۱۴-۱۸؛ (۲) الفارابی: رِسالۃ فِی آراء المدینۃ الفاضِلۃ (طبع Dieterici، در *Al Fārābīs Abhandlung der Musterstadt*، لائڈن ۱۸۹۵ء)، ص ۱۷-۲۳، ۲۷-۲۹؛ (۳) وہی مصنّف: عُیُونُ المَسائِل، (طبع Dieterici، در *Al Fārābīs Philosophischen Abhandlungen*، لائڈن، ۱۸۹۰ء)، ص ۵۷-۶۰؛ (۴) ابن سینا: الشِّفاء (چاپ سنگی، تہران ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء)، ۱: ۲۹۲-۲۹۳ و ۲: ۴۳۹، ۵۸۱، ۵۸۹، ۶۰۵-۶۰۸، ۶۲۰-۶۲۵؛ (۵) وہی مصنّف: اَلنَجاۃ، قاہرہ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء، ص ۱۰۰-۱۰۳، ۲۳۳، ۲۷۰، ۳۵۵، ۴۰۴، ۴۲۴، ۴۵۱-۴۵۳، ۴۶۱، ۴۷۹؛ (۶) وہی مصنّف: کتاب الاِشَارَات و التَنبِیْہَات، (طبع Forget، لائڈن ۱۸۹۲ء، ترجمہ از A. M. Goichon)، ص ۵۵-۵۹، ۱۶۷-۱۶۹؛ (۷) وہی مصنّف: تفسیر الصّمدیۃ (طبع جَامِعُ البَدائع، قاہرہ ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء، ص ۱۹؛ (۸) وہی مصنّف: رسالۃ فی العِشْق (وہی مدیر)، ۲: ۷۲؛ (۹) ابن حزم: کتاب الفِصَل، قاہرہ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء، ۱: ۲۱-۲۵؛ (۱۰) ابن السِیْد البَطَلْیَوسی: کتاب الحدائِق (طبع Asin، در *Andalus*، ۱۹۴۰ء)، ۵: ۶۳-۱۵۴؛ (۱۱) ابن رُشد: *Djami' de la Métaphysique* (طبع Quirós، میڈرڈ ۱۹۱۹ء)، ص ۱۳۱-۱۵۴؛ (۱۲) A. M. Goichon: *Lexique de la langue philiosophique d' ibn S īnā*، پیرس ۱۹۳۸ء، شمارہ ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۹، ۹۱، ۹۹، ۱۴۳، ۴۴۳، ۴۵۰، ۵۷۲؛ (۱۳) وہی مصنّف: *Vocabularies Comparés d'Aristote d' Ibn Sina*، پیرس ۱۹۳۹ء، ص ۲؛ (۱۴) M. Cruz Hernández: *Historia de la filosofía hispaño-musulmana*، میڈرڈ ۱۹۵۷ء، ۱: ۸۳، ۸۷، ۸۹، ۱۳۱، ۲۶۰، ۳۱۷ و ۲: ۱۵۰، ۱۵۴، ۳۰۲، ۳۰۷.

(M. CRUZ HERNÁNDEZ)

✱⊗ **اُوَیس اوّل**: (سُلطان) اُویس، خاندانِ جلائر [رک بآن] یا ایلکان (ایلکان، مشتق از اِلگان؟) کا دوسرا بادشاہ، جس نے ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء تا ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء حکومت کی۔

اُوَیس، جو ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا، حسن بزرگ [رک بآن] بن حسین گورگان (کُورا کان، یعنی دامادِ خان) بن آق بوغا نویان بن ایلکان (ایلکان) نویان (رشید الدین: ایلکای، ایلجای) کا فرزند تھا۔

حسن بزرگ کی والدہ ایک مغل شہزادی اور ارغون خان کی بیٹی تھی۔ خود حسن نے اپنی شادی ایک نامور خاتون دلشاد خاتون بنت دِمشق خواجہ بن چوپان [قب سُلدُوز] سے کی تھی۔ اس خاتون کی پہلی شادی ابوسعید خان سے ہوئی تھی اور جب ۷۶۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا تو پھر ایک امیر سلیمان نامی کی زوجیت میں آئی (حبیب السیر)۔ دلشاد خاتون اپنی ذہانت اور خوب صُورتی کے لیے مشہور تھی۔ وزرا اس سے امورِ سلطنت میں مشورہ لیا کرتے تھے (کتاب مذکور)۔

اکثر مؤرّخوں کے بیان کے مطابق اویس براہِ راست اپنے باپ کا جانشین ہوا، جس کا انتقال ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء میں ہوا تھا، لیکن جنّابی کا کہنا ہے کہ سلطان حسن (م ۷۵۷ھ) کا اصل جانشین سلطان حسین (م ۷۶۰ھ) تھا (جو دل آویز کردار کا حامل اور شاعر تھا)۔ اس طرح مارکوف (Markov) کا یہ نظریہ قابلِ قبول معلوم ہوتا ہے کہ حسین اور اویس دونوں نے ورثے میں الگ الگ ریاستیں پائی تھیں، جنھیں اپنے بھائی کے انتقال کے بعد اویس نے یک جا کر لیا۔

اویس کی سرگرمیوں کا مرکز بغداد رہا۔ اس زمانے میں تبریز [رک بآن] پر قپچاق کے خان جانی بیگ کا قبضہ تھا، جو چوپان [قب سُلدُوز] کے پوتے اشرف کے ظلم و استبداد کا خاتمہ کرنے کے لیے آذربیجان آیا تھا۔ ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء کے موسم بہار میں جب اویس کو معلوم ہوا کہ جانی بیگ وہاں سے چلا گیا ہے تو اس نے اخی جُوق پر، جسے جانی بیگ (یا اس کا فرزند بِردی بیگ) تبریز میں اپنا نائب بنا کر چھوڑ گیا تھا، چڑھائی کر دی۔ کوہ سِیِسَے (؟) مِیِنَے؟ (غالباً سہند) کے قریب دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اخی جُوق پہلے تبریز اور پھر نُخجُوان کی طرف پسپا ہو گیا۔ اویس نے تبریز میں عمارتِ رشیدی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ رمضان [۷۵۹ھ/] اگست ۱۳۵۸ء میں اشرف کے سینتالیس امیروں (حبیب السیر: امرائے شرقی، جو ایک صریح غلطی ہے) کے سر قلم کر دیے گئے۔ اس سے دوستوں کی ہمدردیاں مخالف سمت ہو گئیں اور انھوں نے اخی جوق کو تلاش کر کے اس کے ساتھ قرہ باغ کا رخ کیا۔ اویس نے ان لوگوں کے خلاف علی پیلتن کو روانہ کیا، لیکن اس نے کم زوری سے کام لیا اور شکست کھائی۔ اویس کو بھی بغداد کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ ۷۶۰ھ کے موسم بہار میں شیراز کے محمد مظفّری نے اخی جوق کے خلاف لشکر کشی کی اور اسے تبریز سے نکال کر وہاں کئی مہینے پڑاؤ ڈالے رکھا (تاریخ گُزیدہ، در *GMS*، ص ۶۷۷-۶۷۹، ۷۱۵-۷۱۷)، لیکن جونہیں اسے اطلاع ملی کہ اویس نے بغداد سے کوچ کر کے شمال کا رخ کیا ہے تو بغیر کوئی مدافعت کیے وہاں سے چلا گیا۔ اس طرح اویس نے دوبارہ تبریز پر قبضہ کر لیا۔ یہاں وہ خواجہ شیخ کُنجی (کُنجانی) کے مکان پر مقیم ہوا۔ ادھر اخی جُوق نے اپنے والد صدر الدین خاقانی کے ہاں پناہ لی۔ اخی جُوق کے سپر انداز ہو جانے پر اویس نے اسے غداری کے

الزام میں قتل کروادیا.

۷۶۵ھ/ ۱۳۶۳ء میں بغداد کے والی خواجہ مرجان نے بغاوت کردی مگر وہ بہت قلیل عرصے کے لیے مقابلے پر جمارہ سکا۔ اس نے شہر کے دروازے کھول دیے اور اویس نے اسے معاف کردیا، لیکن اس کی جگہ یہ منصب شاہ خازن کو دے دیا (حبیب السیر)؛ لیکن مصری مآخذ (المقریزی: السُلوک، درکتاب خانۂ ملّی، عربی مخطوطات، شمارہ ۶۷۳، ورق ۴۹، ۵۲) کا بیان ہے کہ ۷۶۷ھ میں مرجان نے یہ کوشش کی تھی کہ سلطانِ مصر اشرف شعبان کی امداد حاصل کرلے، جس کے بدلے اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے نام کا خطبہ رائج کردے گا۔ اویس نے اپنا جوقاصد بعدازاں یہ بتانے کے لیے قاہرہ بھیجا کہ مرجان کی ایک باغی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں اس کا استقبال سرد مہری سے کیا گیا۔ بہرحال اویس اس عرصے میں مرجان کا قصّہ پاک کرچکا تھا۔ المقریزی نے ۷۶۷ھ کی جو تاریخ دی ہے اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مرجان کی بغاوت خاصی مدت تک جاری رہی (اسی ماخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرجان کو اندھا کردیا گیا تھا).

بغداد میں اویس نے گیارہ مہینے قیام کیا پھر مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے بیرام خواجہ (قرہ قویونلو قبیلے کے 'ترکمان') کے بھائی سے موصل چھین لیا؛ پھر خود بیرام خواجہ کو مُوش کے میدان میں شکست دی اور اس کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا۔ اسی اثنا میں ماردین پر بھی قبضہ ہوگیا، جہاں کے امیر نے مصر سے مدد مانگی تھی، مگر نہ مل سکی (قب المقریزی: السُلوک، ورق ۵۳).

اویس قرہ کلیسیا (مابین ارزروم و بایزید) کے راستے تبریز واپس آیا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ [اس کی غیر حاضری میں] کاؤس بن کیقباد، فرماں روائے شروان، دومرتبہ آکر قرہ باغ (اڑان) کے باشندوں کو زبردستی شروان (کُر کے شمال) لے گیا ہے، حالانکہ اویس نے اخی جُوق کے ختم ہوجانے کے بعد یہ علاقہ اپنی مملکت میں شامل کرلیا تھا۔ اویس کے سپہ سالار بیرم بک نے کاؤس کو شروان کے قلعے میں محصور کرلیا۔ بالآخر کاؤس کو پابجولان اویس کے سامنے پیش کیا گیا، جسے اس نے بغداد میں جلاوطن کردیا، لیکن تین مہینے کے بعد اسے دوبارہ اویس کے ایک باج گزار کی حیثیت سے بحال کردیا گیا (قب وہ جلائری سکّے جو شروان میں مضروب ہوے).

دولت شاہ (ص ۲۶۱ - ۲۶۳) کے بیان کے مطابق اویس اتنا حسین و جمیل تھا کہ جب وہ نکلتا تو بغداد کے لوگ اسے دیکھنے کے لیے جوق در جوق دوڑتے تھے۔ سب کے سب مؤرّخ اس کی رحم دلی، عدل پروری اور جرأت کے مداح ہیں؛ وہ علم وادب کا بھی بڑا مربی تھا۔ اس کا سب سے بڑا مداح شاعر سلمان ساوجی تھا، جس نے اس کے دورِ حکومت کے خاص خاص واقعات پر قصائد لکھے ہیں۔ [اس کے عہد کے دیگر مشہور شاعر شرف رامی، خواجہ محمد عصّار اور عبید زاکانی تھے۔] اویس خود بھی ایک بلند مرتبہ خطّاط وانشا پرداز اور بڑے پائے کا شاعر تھا۔ اس نے تبریز میں ایک بڑی شان دار عمارت ''دولت خانہ'' بنائی (جسے Clavijo نے ''Tolbatgana'' کہا ہے)، جو غالباً وہی ہے جسے آج کل اَرْک [= قلعہ، مسکنِ بادشاہ] کہتے ہیں (قب مادّۂ تبریز).

اویس ایک ایسے خانوادے کا چشم و چراغ تھا جو بالکل ایرانی رنگ میں رنگا گیا تھا۔ ماں کی طرف سے وہ خاندان چوپان سے تعلّق رکھتا تھا، جس کے شورانگیز واقعات شہرۂ آفاق ہیں۔ اسی لیے اویس بھی بظاہر جذباتی مزاج کا آدمی تھا؛ چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ اسے اپنے مقرّب وزیر بیرم شاہ سے والہانہ تعلّق خاطر تھا اور اس کے انتقال پر ملک بھر میں سوگ منایا گیا۔ اسی طرح جب اس کا بھائی زاہد نشے کی حالت میں چھت سے گر کر مر گیا تو اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے ۷۷۳ھ میں امیر ولی کے خلاف مہم منسوخ کردی۔ اویس کا انتقال [۷۷۵ھ میں] تقریباً تیس برس کی عمر میں بعارضۂ تپ دق ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے اپنی موت کا پہلے سے احساس ہوگیا تھا، چنانچہ اس نے اپنے کفن اور تابوت کی تیاری کا حکم دے دیا تھا۔ [بقول دولت شاہ انتقال سے پہلے اس نے یہ حسرت آمیز اشعار بھی کہے تھے:

ز دارالملکِ جاں روزی بشہرستانِ تن رفتم
غریبی بودم اینجا چند روزی تا وطن رفتم
غلامِ خواجہ ای بودم گریزاں گشتہ از خواجہ
در آخر پیش او شرمندہ با تیغ و کفن رفتم
الا اے ہم نشینانم شدم محروم ازیں دنیا
شما را عیش خوش باد ادریں دنیا کہ من رفتم]

اس کے پانچ بیٹے تھے: حسن، جلال الدین حسین، شیخ علی، غیاث الدین احمد اور بایزید اور ایک بیٹی تھی جس کا نام تِنْدو تھا۔ اویس کی خواہش تھی کہ بغداد تو اپنے بڑے بیٹے حسن کو دے دے اور تاج وتخت کا مالک حسین کو بنائے۔ جب امرا نے شبہہ ظاہر کیا کہ شاید حسن یہ بات منظور نہ کرے تو کہا جاتا ہے کہ اویس نے جواب دیا: ''آپ لوگ جانتے ہیں (کہ ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے)''۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس دن اویس کا انتقال ہوا اسی دن حسن کو بھی ختم کردیا گیا.

منتخب التواریخ کے مطابق اویس کا وزیر امیر زکریا تھا اور امیر الامرا عادل آغا [قب سلطانیہ].

سکّے: مارکوف (Markov) نے ایسے چھیاسٹھ سکّوں کی کیفیت بیان کی ہے جو اویس کے نام پر بغداد، واسِط، تبریز، اردَبیل، خوئی، نَخْجوان، شابَران، باکو، گُشْتَسْفی، بَرْدَعَہ، ساوَہ، وَسْتان (؟)، طُوسان (اوجان؟)، باران (؟) اور باند (؟) وغیرہ میں مضروب ہوے۔ ۷۵۸ھ کے ایک سکّے پر، جو بغداد میں ضرب ہوا، یہ نام نقش ہے: السلطان العالم العادل؛ ۷۶۲ھ (بغداد) کے سکّے پر ''السلطان الاعظم شیخ اویس بہادر'' کندہ ہے؛ ۷۶۶ھ کے سکے (بغداد) پر منگولی زبان میں نام لکھا ہے۔ لین پول (Lane-poole) کی فہرست میں اویس کے ان سکوں کا حال ملتا ہے جو تبریز، سلطانیہ، بغداد، اِرْبِل، شیراز اور

اصفہان میں ڈھالے گئے۔ محمد مبارک کی فہرست میں ان سکوں کا ذکر ہے جو بغداد، بصرہ، حِلّہ، تبریز اور شیراز میں مضروب ہوے۔ شیراز کے ایک سکّے پر، جس کی تاریخ ۷۶۶ھ ہے، اویس کا لقب ''الواثق بالملک الدیّان'' منقوش ہے۔

مآخذ: (۱) معین الدین نطَنزی: منتخب التواریخ، Bibl. Nat.، تکملۂ مخطوطاتِ فارسی، شمارہ ۱۶۵۱، ورق ۳۲۷-ب تا ۳۲۸-الف۔ اس میں حسن بزرگ کے خاندان کا ذکر ہے اور ایک مختصر خاکہ دیا گیا ہے، جس سے بعد کے حکمرانوں کا شجرہ معلوم ہوتا ہے؛ (۲) شجرۃ الاتراک (الغ بیگ کی کتاب اُلُوس اربعہ کا خلاصہ)، مترجمۂ Miles، لنڈن ۱۸۳۸ء، ص ۳۳۵-۳۳۸؛ (۳) خواند امیر: حبیب السِیَر (جس نے حافظ ابرو [رک بآں] کا حوالہ دیا ہے)، طبع تہران ۱۲۷۱ھ، ۳/۱: ۸۰-۸۱؛ (۴) ابن تغری بِردی: المَنْهل الصَافِی، Bibl. Nat. مخطوطاتِ عربی، شمارہ ۲۰۶۹، ورق ۲۵ (بذیل مادۂ اویس)؛ (۵) دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، طبع محمد قزوینی، ص ۲۶۱-۲۶۳ وغیرہ؛ (۶) مُنجّم باشی: صحائف الاخبار، ۳: ۱۰-۱۱؛ (۷) D' Ohsson: *Histoire des Mongols*، ۴: ۷۴۲-۷۴۳؛ (۸) Dorn: *Versuch. einer Geschichte d. Schirwanschahe*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۴۱ء، ص ۳۹ (تعلقات مابین اویس وکاؤس)؛ (۹) Wüstenfeld: *Die Chroniken d. Stadt Mekka*، ۴ (۱۸۶۱ء): ۲۵۸، ۲۶۰ (جہاں سونے اور چاندی کے ان جھاڑوں کا ذکر ہے جو اویس نے مکّۂ معظّمہ بھیجے تھے اور اس نذرانے کے صلے میں ''صاحبِ مکہ'' عَجْلان بن کُمَیْثہ نے کئی برس تک خطبوں میں اویس کے لیے دعاے خیر کی)؛ (۱۰) Howorth: *History of the Mongols*، ۳: ۶۵۴-۶۵۹؛ (۱۱) Heyd: *Histoire du commerce du Levant*، طبع لائپزگ ۱۸۸۶ء، ص ۱۲۹، ۱۳۱ (وینس اور جنیوا کے باشندوں سے اویس کے تعلّقات کا ذکر)؛ (۱۲) مارکوف (Markov): *Katalog djalairskikh monet*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء [مبنی بر تواریخ عَرَبی از العَیْنی (۱۳۶۰-۱۴۵۱ء)، جَنَّابی (م ۱۵۹۰ء)، وغیرہ]۔ اس کتاب میں ان چارسو چوّن جلائری سکّوں کی بڑی عظیم دریافت کا حال ہے جو آزُرُوباد کے قریب ۱۸۵۸ء میں پائے گئے؛ اویس وغیرہ کے سکوں کی دوسری دریافت کے لیے، جو باکو میں ہوئی، دیکھیے: (۱۳) Pakhomov: *Monetnîye kladî Azerbaidjana*، باکو ۱۹۲۶ء، ص ۵۹؛ قب (۱۴) Lane-poole: *Cat. of Oriental Coins*، ۱۸۸۱ء، ۶: ۲۰۷؛ (۱۵) Lan e-poole: *Additions to the Oriental Collection*، ۳: ۱۲۸؛ نیز (۱۶) محمد مبارک: *Catalogue des monnaies djingui-sides*، وغیرہ، طبع استانبول ۱۹۰۱ء، ص ۱۹۴؛ (۱۷) E. G. Browne: *A History of Persian Literature*، ج ۳، بمد اشاریہ۔

---

* **اُوَیس ثانی:** بن سلطان وَلَد بن علی بن اویسِ اوّل، جلائری خاندان کا ساتواں بادشاہ، جس نے ۸۱۸ سے ۸۲۲ھ تک خوزِستان (شُوشتَر)، بصرے اور واسط پر حکومت کی (مُنجّم باشی، ۳: ۱۲)۔ وہ شاہ محمد ترکمان کے ہاتھوں قتل ہوا (Weil: *Gesch. d. Chalifen*، ۵: ۱۴۲)۔ اویس ثانی کی والدہ تَنْدو، جو ایک لائق و فائق خاتون تھی، حسین بن اویس اوّل کی بیٹی تھی۔ منتخب التواریخ کے مصنّف نے بیان کیا ہے کہ اس کے زمانے میں اویس ثانی ہی برسرِحکومت تھا۔ اس وقت اس کی عمر گیارہ برس تھی اور اس کی ماں ہی اس کی ''وزیر'' تھی۔ Huart کے قول (*Lafin de la dynastie Ilékanienne*، در *JA*، ۱۸۷۰ء، ۷: ۳۴۴-۳۴۸) کے باوجود اس خاتون کو تاندو [تندو؟] بنت اویس الاوّل نہیں سمجھا جا سکتا، جس نے یکے بعد دیگرے دو مظفریوں، محمود اور زین العابدین، سے نکاح کیا تھا۔

(V. MINORSKY)

اُوَیسؒ القَرَنی: ''سیّد التّابعین'' اُویس بن عَامِر [ایک روایت میں ⊗ عمرو، دیکھیے الاصابۃ، ص ۴۹۷ و ابن حزم: جَمْہرۃُ انساب العرب، ص ۴۰۷] بن جَزْء بن مالک بن عمرو بن سعد [یہ الاشتقاق، ص ۲۴۷ کا بیان ہے لیکن الاصابۃ اور المقتضب میں عمرو کے بعد ہے: ابن مُسْعَدَہ بن عمرو بن سعد]۔ ان کا سلسلۂ نسب قبیلۂ قَرَن بن رَدْمان بن ناجیہ بن مراد سے جا ملتا ہے۔ ابن الکلبی نے انھیں اُوَیس بن عمرو بن جُہَیّ بن مالک بن عمرو بن مُسْعَدَہ بن عَصْوان بن قَرَن [بن رومان] بتلایا ہے [نیز دیکھیے جَمْہرۃ، ص ۴۰۷] اور بعض نے اُوَیس بن مالکولا، اُوَیس بن الخُلَیْص اور اُوَیس بن اُنَیْس بھی لکھا ہے [الجوہری نے قَرَن بہ سکون را کہہ کر اسے قَرَن مَنازل کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، دیکھیے تاج العرُوس، بذیل مادّۂ ق رن؛ نیز مسالک الابصار، ۱: ۱۲۲]۔ اُوَیسؒ اہلِ یمن سے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عہدِ رسالت میں موجود تھے اور غائبانہ اسلام قبول کیا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ثابت نہیں۔ تاریخ میں ان کے حالات کم ملتے ہیں۔ ان کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں وہ بالعموم ہَرِم بن حیّان العبدی البَصْری (۴۳ھ)، اَصْبَغ بن زَیْد (م ۵۷ھ)، رَبیع بن خُثَیم (م ۶۷ھ)، اُسَیر (یا یُسَیْر) بن جابر (م ۸۵ھ) اور عبداللہ بن سَلَمۃ المُرادِی کی روایات پر مبنی ہیں۔ ان کے بیانات کے مطابق اویسؒ القرنی یمن کی امدادی فوج میں (یعنی ۱۷ھ کے بعد) مدینۂ منوّرہ آئے اور یہیں خلیفۂ وقت [حضرت عمرؓ] سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی؛ پھر وہ کوفے [بقول سامی بک بصرے (جو صحیح نہیں)] چلے گئے، جہاں وہ گوشۂ عزلت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اویس زہد و عبادت کے پیکر تھے۔ ان کے انداز و اطوار سے مجذوبانہ شان بھی جھلکتی تھی۔ حضرت عمرؓ سے اویسؒ کی دوسری ملاقات عَرفات میں ہوئی۔ اس کے بعد آذربیجان کے معرکے (۲۰-۲۲ھ) سے لوٹتے ہوے راستے میں اچانک بیمار ہو کر وفات پا گئے (حلیۃ الاولیاء، ۲: ۹)۔ اس بارے میں دوسرے اقوال بھی ہیں، مثلاً جنگ صِفّین (۳۷ھ/۶۵۷ء) میں حضرت علیؓ کی طرف سے حصّہ لیا [قب قاموس الاعلام، بذیل مادّہ] اور تقریباً چالیس زخم کھا کر شہید ہوے۔ بقول بعض اویسؒ نے دمشق میں وفات پائی اور وہیں مقبرۂ باب الجابیہ میں دفن ہوے یا انھوں نے مکّۂ معظّمہ میں انتقال کیا [نیز دیکھیے مُنتَہی المقال]۔

ابن سَعْد نے اویس کا حلیہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ صحیح مسلم میں اویس کے کئی مناقب وفضائل گنوائے ہیں مگر بعض نے [غلطی سے] اویس کے وجود ہی سے انکار کیا ہے۔ اویس چونکہ مفتی یا فقیہ نہ تھے اس لیے علماے حدیث نے ان سے روایت لی ہے نہ ان کے حالات جمع کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ماہرینِ انساب کی تالیفات اویس القرنی کے ذکر سے خالی نہیں، بلکہ الذّہبی، ابن حجر العسقلانی اور محمد طاہر الفتّنی ایسے محقّقین نے بھی اویس کے وجود کو نہیں جھٹلایا۔ [نبی اکرم صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم سے حضرت اویس کے متعلق جو روایات مروی ہیں ان کے لیے دیکھیے مسلم: صحیح، کتاب فضائل الصّحابۃ، حدیث ۲۲۳-۲۲۵۔ اویس کو حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے بڑی محبت تھی۔ جنگ صفّین میں انھوں نے حضرت علیؓ کی طرف سے شرکت کی۔ لکھا ہے کہ اس جنگ میں حضرت معاویہؓ کے طرف داروں میں سے ایک شخص نے پکار کر پوچھا کہ کیا تم کوفے والوں میں اویس قرنی ہے؟ جب جواب اثبات میں ملا تو اس نے کہا میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے سنا ہے کہ اویسؒ قرنی تابعین میں سب سے بہتر ہیں۔ پھر وہ شخص گھوڑے کو مہمیز لگا کر حضرت علیؓ کی فوج میں شامل ہو گیا (ابن سعد).]

مآخذ: (۱) ابن الکَلْبی: الجمہرۃ فی النّسَب، مخطوطۂ کتاب خانۂ اسکوریال، میڈرڈ، عدد ۱۶۹۸، ورق ۱۱۷؛ (۲) ابن سَعْد، بیروت ۱۹۵۷ء، ۶: ۱۶۱ ببعد، [لائڈن ۱۳۳۵ھ، ۶: ۱۱۱]؛ (۳) ابن دُرَیْد: الاِشْتِقاق، ص ۲۴۷؛ (۴) ابن حبیب: مختلف القبائل، ص ۴۶؛ (۵) مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ: حدیث ۲۲۳-۲۲۵؛ (۶) الطّبری، ۳: ۲۴۷۵، ۲۴۷۶، ۲۵۲۲، ۲۵۲۳؛ (۷) الحاکم: المستدرک، حیدرآباد [دکن] ۱۳۴۱ھ، ۳: ۴۰۲-۴۰۸: (۸) ابونُعَیْم الاِصبہانی: حِلْیۃُ الاولیاء، قاہرہ ۱۹۳۳ء، ۲: ۷۹-۸۷ (رقم ۱۶۲)؛ (۹) ابن عساکر: ۱۳۳۱ھ، ۳: ۱۵۷-۱۷۴؛ (۱۰) السمعانی، ۴۴۹-الف [بذیل مادّۂ القرنی]؛ (۱۱) یاقوت: المنتخَب (مخطوطہ)، ورق ۸۵، ۸۶؛ (۱۲) فریدُ الدین عطّار: تذکرۃ الاولیاء، ۱۳۳۰ھ، ص ۱۴-۲۱؛ (۱۳) الذّہبی: میزانُ الاعتدال، قاہرہ ۱۲۳۵ھ، ۱: ۱۲۹-۱۳۱؛ (۱۴) وہی مصنّف: المُشْتبہ، ۱۸۶۳ء، ص ۴۲۱؛ (۱۵) وہی مصنّف: دُوَل الاسلام، حیدرآباد [دکن] ۱۳۳۷ھ، ۱: ۱۶؛ (۱۶) ابن تَغْری بِرْدِی، قاہرہ ۱۹۲۹ء، ۱: ۱۱۲؛ (۱۷) ابن حجر العَسْقلانی: الاصابۃ، قاہرہ، ۱: ۱۱۵-۱۱۷ (رقم ۵۰۰)؛ (۱۸) وہی مصنّف: لسانُ المیزان، حیدرآباد [دکن] ۱۳۲۹ھ، ۱: ۴۷۱-۴۷۵؛ (۱۹) السّیوطی: الجامع الصغیر، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۲: ۷؛ (۲۰) صفّی الدین احمد الخَزْرجی: خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال فی اسماء الرّجال، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، ص ۴۱؛ (۲۱) محمد طاہر الفتّنی [پٹنی] تذکرۃ الموضوعات، بمبئی ۱۳۴۳ھ، ص ۱۵۱؛ (۲۲) القَلْقَشندی، نہایۃ الارب، ص ۳۶۳؛ (۲۳) ابن حزم: جَمْہرۃ انساب العرب، طبع عبدالسلام، قاہرہ ۱۹۶۲ء، ص ۴۰۷؛ (۲۴) تاج العروس، بذیل مادّہ؛ (۲۵) مسالکُ الابصار، ۱: ۱۲۲؛ (۲۶) الجوہری، بذیل مادّہ؛ (۲۷) سامی بک: قاموس الاعلام، بذیل مادّہ؛ (۲۸) مُنْتَہی المقال؛ (۲۹) مَنْہَج المقال، ص ۶۴؛ (۳۰) ذَیْلُ المُذیّل، ص ۸۷، ۱۰۸؛ (۳۱) نُوراللہ شوستری: مجالسُ المومنین، تہران ۱۲۹۹ھ، ص ۱۲۰ (طبع دیگر، ص ۵۶ ب)؛ (۳۲) محمد کاظم دہلوی: مقالات صوفیہ، لکھنؤ ۱۸۹۳ء، ص ۷؛ (۳۳) معین الدین ندوی، تابعین، دہلی ۱۹۳۷ء، ص ۳۲-۴۸؛ (۳۴) اسلم جیراج پوری،: نوادرات، کراچی ۱۹۵۱ء، ص ۵۶-۶۶؛ (۳۵): الاعلام، بذیل مادّہ.

(رانا احسان الٰہی وادارہ)

الاَہْدَل: جمع، مَہادِلَہ (یا مَہْدَلی، بجاے اَمْاَہْدَلی)؛ اشتقاق کے لیے* قبّ المُحبّی، ۱: ۶۷ و وَسْٹِنْفِلْٹ، ص ۶؛ سادات کا ایک خاندان، جو زیادہ تر جنوب مغربی عرب میں رہتا ہے اور جو علوی امامِ سادس حضرت جعفر الصادقؒ کی اولاد میں سے ہے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ علی بن عمر بن محمد الاَہْدَل معروف بہ قُطبُ الیَمَن اور اُن کے بیٹے ابوبکر (م ۷۰۰ھ/ ۱۳۰۰ء) مشہور صوفی تھے، جو بیت الفقیہ ابن عُجَیْل کے جانب شمال (قِبْلِیّہ) مُراوَعہ (تاجُ العروس) یا مَراوِعَہ (المحبّی) کے چھوٹے سے قصبے میں رہتے تھے۔ یہاں اُن کے مزار اب تک مرجعِ انام ہیں۔ اس خاندان میں حسب ذیل صوفی علما گزرے ہیں ان میں ہر ایک ابن الاَہْدَل کہلاتا تھا:-

(۱) حسین بن عبدالرحمٰن بن محمد بدر الدین (ولادت: بمقام قُحْرِیّہ (Ḳuḥriyya) [القَحْرِیَّہ، دیکھیے براکلمان و السخاوی] ۷۷۹ھ/ ۱۳۷۷ء؛ وفات: ابیات حسین میں بحیثیت مفتی، ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء)۔ الضَّوء اللاّمع، ۳: ۱۴۶ ببعد میں [ان کی] جن اٹھارہ کتابوں کے نام گنائے گئے ہیں ان میں حسب ذیل شامل ہیں: تُحْفَۃ الزّمن فی تاریخ سادات الیمن (اعیان اہل الیمن، بقول حاجی خلیفہ)؛ اَلْجَنْدی کی تاریخ [الیمن] (السلوک) کی تلخیص و اضافات؛ الیافعی کی مِرآۃ الجنان کی اسی قسم کی ترمیم، جو غِربال الزّمان کے نام سے موسوم ہے (قبّ براکلمان، ۲: ۱۵۸، و تکملہ، ۲: ۲۳۸ ببعد؛ F. Rosenthal: *A history of Muslim historiography*، ص ۲۴۸، ۳۵۵، ۴۰۷)۔ [ان کے علاوہ کَشْف الغِطاء عن حقائق التوحید و عقائد الموحدین؛ ذکر اَئمۃ الاشعریین و من خالَفَہم اور اَللُّمْعَۃ المُقْنِعَۃ فی ذکر فِرَق المُبْتَدِعَۃ قابل ذکر ہیں].

(۲) حسین بن الصِّدّیق بن حسین، مذکورۂ بالا کے پوتے (ولادت: ۸۵۰ھ/ ۱۴۴۶ء، در ابیات حسین؛ وفات: ۹۰۳ھ/ ۱۴۹۷ء در عدن)، ان کے شاگرد ابومَخْرَمَہ کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے دادا کی تاریخ (تُحفۃُ الزّمن) کا خلاصہ تیار کیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں عدن میں ان کی یادگار کے طور پر ایک مسجد تعمیر ہوئی، قبّ براکلمان: تکملہ، ۲: ۲۵۱؛ النُّور [السّافِر]، ص ۲۷-۳۰؛ الضَّوء اللاّمع، ۳: ۱۴۴.

(۳) طاہِر بن حُسَیْن بن عبدالرحمٰن، جمال الدّین (ولادت: ۹۱۴ھ/ ۱۵۰۸ء، بمقام مُراوَعَہ؛ وفات: ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۰ء، بمقام زبِیْد)، ایک فقیہ اور محدّث۔ انھوں نے اپنے دادا حسین (شمارہ ۱) کی ایک تصنیف بعنوان مطالب اہل القُرْبَۃ فی شرح دعاء الوَلِی ابن حَرْبَۃ [؟ ابی حَرْبَہ] کا خلاصہ کیا تھا (النُّوَر السّافِر، ص ۴۴۷ ببعد؛ قبّ الضَّوء اللاّمع، ۳: ۱۴۶)۔ ان کے بیٹے:

(۴) محمد بن طاہر، جنھوں نے بُغیة الطّالب بمعرفة اولادِ علیؓ بن ابی طالب لکھی (وسٹنفِلڈ، ص ۷؛ براکلمان: تکملہ، ۲:۲۳۹).

(۵) حاتم بن احمد بن موسٰی بن ابی القاسم بن محمد (وفات: ۱۰۱۳ھ/ ۱۶۰۴ء، المَخاء (=المُخا) کی بندرگاہ میں، جہاں وہ سینتیس سال تک رہے تھے)، مشہور صوفی اور عالم؛ اپنے مرید عبدالقادر العیدروس کے قول کے مطابق اپنے وقت کے ابن العربی، (النور السافر، ص ۱۶۱-۴۷۵)۔ العیدروس نے ان کے ساتھ اپنی خط و کتابت کو اپنی تصنیف الدر البَاسِم من روضِ السّید حاتم میں شائع کیا ہے۔ سید حاتم کی فی البدیہہ نظمیں دیوان کی صورت میں جمع کی گئی ہیں، قب براکلمان، ۲:۴۰۷ و تکملہ، ۲:۵۶۵؛ المُحبّی: ۴۹۶-۵۰۰؛ وسٹنفِلڈ، ص ۱۱۴؛ Serjeant: *Materials*، ۲:۵۸۵ ببعد؛ [الاعلام ۲:۱۵۱].

(۶) ابوبکر بن ابی القاسم بن احمد (ولادت: ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۶ء؛ وفات: ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۶ء)۔ اُن کا المَحُط (وادی رِمَع) میں ایک زاویہ تھا۔ ان کی تصانیف میں حسب ذیل شامل ہیں: (۱) نفحَة المَنْدَل (فی تراجم سادات الاهدل، در اسماعیل پاشا: ذیل) اور (۲) الاَحْساب العَلِیَّة فی الاَنْساب الاَهْدَلِیَّة؛ قب براکلمان، ۲:۵۴۴؛ المُحبّی، ۱:۶۴-۶۸؛ وسٹنفِلڈ، ص ۱۱۲ ببعد؛ [الاعلام، ۲:۴۴].

(۷) عبدالرحمٰن بن سلیمان (م ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء) اُن کا اور ان کی آٹھ کتابوں کا ذکر براکلمان: تکملہ، ۳:۱۳۱۱، میں آیا ہے۔ ایک اور تصنیف اَلنَّفَس الیَمانی فی اِجازةِ بنی الشّوْکانی کا ذکر Serjeant: *Materials*، ۲: ۵۸۷ میں آیا ہے۔ [نیز قب: صدیق حسن خاں: اَبجَد العلوم، ص ۸۶۵، بھوپال ۱۲۹۵ھ؛ الاعلام، ۴:۷۹].

اس خاندان کے دو اَور افراد کے احوال کے لیے، جن کی نسبت الموسوی ہے اور جن میں سے ایک نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی کے محمد الکاظم ہیں اور دوسرے زمانۂ حال کے، قب براکلمان: تکملہ، ۲:۲۳۹، ۸۶۵۔ جنوبی عرب کے بارے میں احادیث کا ایک مجموعہ، بعنوان نثرُ الدُّر المکنُون مِن فضائلِ الیمن المَیْمُون، قاہرہ میں ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء کے قریب محمد بن علی الاَہْدَل الحسینی الازہری نے شائع کیا تھا۔

مآخذ: (۱) النَّہْرجی: طبقات الخوّاص، ص ۸۰، ۱۷۳، ۱۹۰؛ (۲) السّخاوی: الضّوء اللاّمع، ۳: ۱۴۴-۱۴۷؛ (۳) عبدالقادر العَیْدرُوس: النُّور السّافر، بمواضع کثیرہ؛ (۴) المُحبّی: خُلاصةُ الأثر، بمواضع کثیرہ؛ (۵) وسٹنفِلڈ: *Die Çufiten in Süd-Aarabien im sudaradien im XI(XVII.) Jahrhundert*، ص ۱۱۱-۱۱۵؛ (۶) H. C. Kay: *Yaman*، ص *xviii* ببعد؛ (۷) O. Löfgren در *MO*، ۲۵: ۱۲۹ ببعد؛ (۸) وہی مصنّف: *Arab. Texte zur kenntnis der Stadt Aden*، مقدمہ، ص ۲۲ ببعد و مواضع کثیرہ؛ (۹) R. B. Serjeant: *Materials for South Arabian history*، ج ۱-۲، *BSOAS*، ۱۹۵۰ء، ص ۲۸۱-۳۰۷، ۵۸۱-۶۰۱؛ [ان کے علاوہ (۱۰) الاعلام، بذیل مادّہ؛ (۱۱) التِبر المَسْبُوک، ص ۳۵۸؛ (۱۲) الشوکانی: البدر الطالع، ۱:۲۱۸-۲۱۹].

(O. LÖFGREN)

اَہگّر: بربری زبان کا ایک لفظ، جس کے معنی ہیں: (الف) اُن معزز* قبیلوں میں سے جو شمالی طوارق (Touaregs) کے سابقہ گروہ پر مشتمل ہیں کسی قبیلے کے افراد (جمع: اِہگّرِن (Ihaggaren)؛ اور (ب) ان میں سے کوئی ایک قبیلہ (کل Kel اَہگّر یا اِہگّرِان) جو اس علاقے میں آباد ہے جس کا نام اس کے نام پر اَہگّر (ہُگّر Hoggar) ہو گیا ہے.

وسیع ترین مفہوم میں اَہگّر کا اطلاق ان علاقوں کے مجموعے پر ہوتا ہے جو قبیلۂ کل اہگّر کے قبضے میں ہیں۔ اس علاقے کا رقبہ دو لاکھ مربع میل ہے، جو ۲۱° ۲۵° عرض بلد شمالی اور ۳° و ۶° طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے اور اونچے پہاڑوں کے تودوں میں گھرا ہوا ہے (مشرق میں اَہَنِف (Ahanef)، شمال مشرق میں اَجّر (Ajjer) کی تَسِّلی (Tassili) نامی پہاڑیاں، شمال میں اِمِدِر (Immidir)، جنوب میں اِفوغہ [رک بآں] (Ifaoghas) کی پہاڑیاں اَدرار (Adrar) اور اَیُر [رک بآں] (Ayr)۔ یہ علاقہ بنجر اور تقریباً میدانی ہے، جس کی حد بندی کوہِ تَسِّلی نے کر دی ہے، جو شمال اور جنوب دونوں طرف ایک قوس کی شکل میں پھیلا ہوا ہے اور اوپر کو ہستانی تودے چھائے ہوئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ بلند اور اہم اَتَکُورن۔اہگّر (Atakorn-Ahaggar) یا 'اہگّر خاص' وسط میں واقع ہے۔ اس پہاڑ کی اوسط بلندی ۷۲۰۰ فٹ ہے۔ بعض چوٹیاں ۹۸۳۵ فٹ تک اونچی ہیں (تہَت (Tahat) ۹۸۳۵ فٹ، اِلَمن (Ilaman) ۹۵۱۰ فٹ، اَسکرِم (Asekrem) ۹۱۱۰ فٹ)۔ وادیاں اور گہری گھاٹیاں، جو پایاب اور محصور طاسوں پر ختم ہوتی ہیں، اس امر کا پتا دیتی ہیں کہ گزشتہ زمانے میں یہاں آج کل کے مقابلے میں پانی زیادہ مقدار میں موجود تھا۔ بحالتِ موجودہ پانی کی گزرگاہیں بہت ہی بے قاعدہ ہیں اور زمین دوز نالوں پر مشتمل ہیں، جن تک پہنچ جا بجا آسانی سے ہو سکتی ہے [رک بہ اِغَرْغَر]۔ اس علاقے کی آب و ہوا صحرائی ہے اور نباتات بہت کم اور خاردار ہوتی ہیں۔ چند درخت باقی رہ گئے ہیں، جن کی نشوونما رک گئی ہے اور بظاہر اس قابل نہیں کہ ان سے دوسرے پیڑ پیدا ہو سکیں۔ حیوانات میں کئی سُم دار (Ungulata) جانور، زیادہ تر ہرن، چیتے، گیدڑ اور خرگوش شامل ہیں۔ اس علاقے کے باشندے کھجوروں کی کاشت کرتے ہیں اور کچھ اناج بھی اُگاتے ہیں، اونٹ اور بکریاں پالتے ہیں اور گدھوں سے بہت سے کام لیتے ہیں.

اس علاقے کا نام ان باشندوں کے نام (یعنی کِل اہگّر) پر جو اس میں رہتے ہیں یا یہاں حکومت کرتے ہیں اہگر پڑ گیا ہے۔ لفظ اہگّر کا تعلّق قبیلۂ ہوارہ [رک بآں] سے ہے، کیونکہ بربری زبان میں 'واوِ مشدّد کا' 'گافِ' مشدّد سے بدل جانا عام بات ہے۔ غالباً ہوارہ قبیلے کی کوئی شاخ تاریخی دَور میں فزّان سے چل کر

اس کوہستان میں آباد ہوگئی، جو بعد میں انھیں کے نام سے موسوم ہوگیا اور اس نے اس علاقے کے قدیمی باشندوں کو مغلوب کر کے اپنا باج گزار بنالیا۔ ان لوگوں کی اصل کا مسئلہ تا حال حل نہیں ہوا [رک بہ بربر]، لہٰذا اہگّر کی آبادکاری کے متعلق مقامی روایات اور مختلف زمانوں میں اربابِ قلم کے قائم کردہ نظریات سے کام لینے میں تأمّل کی ضرورت ہے۔ یہ بات البتہ ظاہر ہے کہ یہ علاقہ بہت قدیم عہد میں آباد ہوگیا تھا، جس کی شہادت پتھر کے کام اور چٹانوں پر سنگ تراشی کے متعدّد آثار سے ملتی ہے (دیکھیے F. D. Chausseloup-Laubat: *Art rupestre au Hoggar*، پیرس ۱۹۳۸ء).

اہگّر کے ملک میں انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں سیّاح کئی بار گئے ہیں۔ فلیٹر مشن (Flatters mission) کے قتل عام (۱۸۸۰ء) اور فورو لامی (Fureau-Lami) کی مہم (۱۸۹۸ء) کے بعد امینوکل [رک بآن] (Ame-nokal) موسیٰ اگ اماسُتَن نے ۱۹۰۴ء میں فوجی کمان دار لاپرّین (Lapeyrrine) کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اہگّر کا ملک فرانسیسی اقتدار میں چلا گیا۔ اب یہ علاقہ مملکتِ نخلستان (Oasis Territory) کا ایک حصّہ ہے اور اس کے صدر مقام تمَن رَسّت (Tamanrasset) کی آبادی ایک ہزار سے بھی کم ہے۔

اہگّر کی [مجموعی] آبادی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں۔ وفاقِ اہگّر میں کِل غلہ (Kel Ghela)، تائیتوق (Toytok) اور تیگیہے ملت (Tegehe mellet) کے شریف قبائل، ان کی شاخیں اور ان کے ماتحت قبائل شامل ہیں۔ امینو کِل ''کِل غِلَہ'' قبیلے میں سے چُنا جاتا ہے۔

اہگّر کے طوارق (Touaregs) خیموں میں رہتے ہیں۔ معاشرہ تین طبقات پر منقسم ہے: (۱) شریف اور حکمران قبائل (اَہگّرِن یا ایموہَغ Imuhagh)؛ (۲) ماتحت قبائل (اِمْغِد، جمع: اِمْغَاد یا اِمْغَد) اور (۳) غلام (اَکُلی، جمع: اِکُلَن)۔ اَہگّرِن، جو دراصل سپاہی پیشہ ہیں، اِمْغَد سے ان کی حفاظت کے بدلے خراج لیتے تھے۔ وہ ہر قسم کی محنت مشقّت کے کام امغد یا غلاموں کے حوالے کر دیتے اور خود جنگ وجدال اور لوٹ مار پر گزارا کرتے تھے۔ جب ملک پر فرانس کا قبضہ ہوگیا تو اَہگّرِن کی جنگی سرگرمیوں کا خاتمہ ہوگیا اور اس طرح ان کی آمدنی کے ذرائع ایک حد تک محدود ہوگئے؛ تاہم ان کا وقار و اعزاز ہنوز قائم و برقرار ہے اور امغد برابران کا ساتھ دیتے ہیں۔

ان کی تحریر (تِفِنَغ tifinagh) اور زبان (تَمَہَقّ tamahakk) کے لیے، جو P. de Focauld کے ایک عالمانہ مطالعے کا موضوع ہیں، نیز ان کے ادب کے لیے رک بہ بربر.

مآخذ: (۱) Duveyrier: *Les Touareg du Nord*، پیرس ۱۸۶۴ء؛ (۲) Benhazera: *Six mois chez les Touareg de l'Ahaggar*، الجزائر ۱۹۰۸ء؛ (۳) E. F. Gautier: *La conquête du Sahara*، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۴) وہی مصنّف: *Le Sahara*، پیرس ۱۹۲۸ء؛ (۵) Ch. de Foucauld: *Dictionnaire de noms propres*، پیرس ۱۹۴۰ء، ص ۹۷-۱۰۱؛ (۶) وہی مصنّف: *Dictionnaire touareg-français*، پیرس ۱۹۵۲ء، ۲: ۵۳۳-۵۳۹؛ (۷) H. Lhote کا مخصوص مطالعہ: *Les Touaregs du Hoggar*، پیرس ۱۹۴۴ء، جس میں مفصل مآخذ دیے گئے ہیں، بہت اہم تصنیف ہے.

(CH. PELLAT)

اَہْل: (ع) لسان میں ہے: الاہلُ، اہلُ الرجُلِ واَہلُ الدّار = کسی شخص ✱⊗ کے متعلقین یا گھر والے۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ عبرانی زبان میں اہل کے مادے سے اوہل (ōhel) کے معنے خیمہ ہیں، یعنی وہ لوگ جو کسی کے ساتھ ایک ہی خیمے میں رہتے ہوں؛ اسی طرح اہل الاسلام = مسلمان۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ذکر میں اہل البیت کی ترکیب میں البیت سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ آلہٖ وسلّم کا گھر مراد لے کر اس کے معنی ہوں گے ''رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے گھر والے''۔ اہل بمعنی مستحق اور سزاوار بھی ہے (لسان)۔ جب اہل (جمع: اَہالٍ یا اَہالی) کسی شہر یا ملک کے لوگوں کے متعلّق استعمال ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے، اس شہر یا ملک کے باشندے، قرآن مجید: اَہْلِ مَدْیَنَ (۲۸ [القصص]: ۴۵)؛ یٰٓاَہْلَ یَثْرِبَ ۳۳ [الاحزاب]: ۱۳؛ نیز اہل المدینۃ اور اہل القُریٰ اور بعض اوقات، جیسا کہ مدینۂ منوّرہ میں دستور ہے (بقول Burton)، یہ لفظ خاص طور پر ان لوگوں کے متعلّق بولا جاتا ہے جو وہاں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے مکان رکھتے ہیں اسی طرح 'اہل اللہ' مکّۂ معظّمہ والوں کو کہتے ہیں (لسان)، لیکن اس لفظ سے دوسرے تصوّرات بھی وابستہ ہوجاتے ہیں اور اس قسم کی ترکیبوں میں اس کا استعمال قدرے غیر معیّن معنی میں ہوتا ہے، چنانچہ اَہْل کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں ''کسی چیز میں حصّے دار'' یا ''اس سے منسوب'' یا ''اس شے کا مالک''، وغیرہ۔ بعض مرکّبات میں (جو بہت کثرت سے استعمال ہوتے ہیں) 'اہل' جزو ترکیبی ہے، مثلاً اہلُ الاَمر وغیرہ۔ اہلُ البیت یا اہل بَیْت النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مراد ہیں: اَزْواجُہ و بَناتُہ وصِہْرُہُ... (لسان) = آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں آپ کی بیٹیاں اور داماد۔ قرآن مجید (۳۳ [الاحزاب]: ۳۳) میں آیا ہے: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ (اس میں اہل البیت کے مفہوم کے لیے رک بہ اَہْلُ البَیْت)۔ لسان میں دوسری ترکیبوں، مثلاً اہل التقوٰی اور اہلُ المغفرۃ وغیرہ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ صاحبِ محیط نے لکھا ہے کہ اہل سے بالخصوص بیوی مراد ہوتی ہے۔ دین میں اشتراک کے لیے بھی اہل کا لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے، مثلاً حضرت نوحؑ کو ان کے بیٹے کے سلسلے میں کہا گیا ہے: اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ (۱۱ [ہود]: ۴۶)۔ یہاں اہل میں نہ ہونے کی وجہ دین اور طریق میں عدم اشتراک ہے۔ نوحؑ کا بیٹا حقیقی معنوں میں تب اہل ہوتا جب وہ دین اور طریق میں بھی ان کے نقش قدم پر چلتا.

اہل کے معنی مالک اور حصّہ دار کے علاوہ سزاوار اور شایانِ شان کے بھی ہیں

آیت قرآنی: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (۴[النساء]: ۵۸) میں اہل سے مراد امانت والے بھی ہیں اور سزاوار اور مستحق لوگ بھی۔ اہلیت سے مراد صلاحیت اور قابلیت بھی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ امانتیں اور اختیارات ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے قابل ہیں؛ نااہلوں کے سپرد مت کرو۔ اہل القرآن سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن سے اختصاص رکھتے ہیں (النھایۃ، بذیل مادّہ).

مآخذ: (۱) لسان، بذیل مادّہ، (۲) مفردات، بذیل مادّہ؛ (۳) تاج العروس بذیل مادّہ؛ اہل کے باقی مرکبات کے لیے ملاحظہ ہوں متعلقہ مادّے].

(I. GOLDZIHER [و ادارہ])

---

* **اہل الاَثَر:** رک بہ اہل الحدیث واہل السنۃ والجماعۃ.

⊗ **اہلُ الاَھْواء:** (ع)، اَھواء کا مفرد ھَوٰی ہے، جیسے قرآن مجید میں ہے: وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی۔ یہاں ھوٰی کے معنی ہیں: میلانِ نفس؛ چنانچہ امام راغب نے لکھا ہے: مَیْلُ النَّفْس الی الشَّھْوۃ، نیز الھَوٰی= سُقوطٌ من عُلُوٍ الی سِفْلٍ (مفردات)، جس کا مطلب ہوا: پست یا برے میلانات جو انسان کے نفس حیوانی سے ابھرتے ہیں۔ الاَھْواء کا لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے، دیکھیے قرآن مجید: ۶ [الاَنْعام]: ۱۵۰ (وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا)۔ جُرجانی کی رائے میں اہل الاھواء کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو اہل قبلہ ہونے کے باوجود اہل سنت کے عقائد سے اختلاف رکھتے ہیں، مثلاً جبریہ، قدریہ، خوارج وغیرہ، دیکھیے التعریفات، بذیل مادّہ؛ تھانوی: کشاف، بذیل مادّہ؛ *ZDMG*، ۱۸۹۸ء، ص ۱۵۰؛ نیز دیکھیے؛ الشہرستانی؛ الملل و النحل؛ ابن حزم: الفِصَل؛ البغدادی: الفرق بین الفرق.

[ادارہ]

---

* **اَہْلُ البِدْعَۃ:** رک بہ بدعۃ.

---

* **اَہْلُ البَیْت:** قرآن پاک میں اہل البیت کی ترکیب دو مرتبہ آئی ہے: (۱) ۱۱[ھود]: ۷۳[... رَحْمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ]، جہاں حضرت ابراہیمؑ کے اہل بیت مراد ہیں اور (۲) ۳۳[الاَحزاب]: ۳۳ (اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا)، جس میں اہل البیت کی اصطلاح رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ''گھر والوں''، یعنی ازواج و اولاد کے لیے خصوصًا اور عشیرۃ اور عِترت [رک بآن] کے لیے عمومًا استعمال ہوئی ہے؛ البتہ بعض کے نزدیک اس میں قدرے وسعت ہے، یہاں تک کہ اس میں کل بنو المُطّلب بلکہ کل بنو ہاشم بھی شامل ہیں، لیکن شیعہ حضرات کے نزدیک اہل البیت سے اس کے محدود معنی مراد ہیں نہ کہ وسیع۔ اسی بنیادی تصور کے گرد ان کے بہت سے عقائد جمع ہیں (دیکھیے الکُمَیت: ھاشمیّات، طبع Horovitz، ص ۳۸؛ الاَشعری: مقالات الاسلامیین، ص ۹).

بعض علما نے لکھا ہے کہ اہل البَیت میں 'البیت' سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا بَیْت (= گھر) مراد ہے، جس میں ازواج مطہراتؓ سکونت پذیر تھیں چنانچہ؛ الفاظِ قرآنی: وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (۳۳[الاحزاب]: ۳۳) میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ان حجروں کا ذکر ہے جن میں آپؐ کی ازواج مطہراتؓ رہتی تھیں۔ ابن ابی حاتم اور ابن عساکر نے براویت عِکْرِمہ اور ابن مَرْدَوَیہ نے بروایت سعید بن جُبَیر، ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آیت قرآنی اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ (۳۳[الاحزاب]: ۳۳) ازواج مطہراتؓ کے حق میں نازل ہوئی (فتح القدیر، ۴: ۲۷۰، مصر ۱۳۵۰ھ)؛ لیکن دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ اس آیت میں جن اہلِ بیت کا ذکر ہے ان سے مراد حضرت علی کرّم اللہ وجہہ، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ الترمذی، ابن جریر، ابن المنذر، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے حضرت اُمّ سَلَمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے کہ یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی۔ اس وقت گھر میں یہ چاروں حضرات موجود تھے۔ آنحضرتؐ نے ان چاروں کو کمبل میں لے کر فرمایا کہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔ الترمذی اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ علامہ قرطبی اور حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اہل بیت میں ازواج مطہرات کے ساتھ یہ چاروں حضرات بھی شامل ہیں۔ بخاری میں حضرت انسؓ سے حضرت زینبؓ کی شادی کے واقعے کے سلسلے میں منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے، فَقَالَ السلام علیکم اھلَ البیت و رحمۃ اللّٰہ فقالت و علیک السلام و رحمۃ اللّٰہ و برکاتہٗ (بخاری، کتاب التفسیر، زیرِ آیت: لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ، ۳۳[الاحزاب]: ۵۳)۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اہل البیت میں ازواج مطہّراتؓ بھی شامل ہیں.

درود میں آل کا لفظ استعمال ہوا ہے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وعلٰی آلِ مُحَمَّدٍ ــــ اور آل بھی اصل میں اَہْل ہے، کیونکہ اس کی تصغیر اُہَیْل آتی ہے: فرق صرف استعمال میں ہے یعنی آل کا لفظ ہمیشہ انسانوں میں سے کسی عَلَم کی طرف مضاف ہوتا ہے اور اسم نکرہ یا اسم مکان کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی اور یہ کسی صاحبِ شرف وفضیلت ہستی کی طرف مضاف ہوتا ہے، مگر اہل کا لفظ ہر ایک کی طرف مضاف ہو جاتا ہے (لسان).

چونکہ اہل کی ایک شکل آل بھی ہے اس لیے عموماً اہل البیت کی تشریح میں آل کے مختلف معانی کی تصریح لازمی ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ بعض لوگ آل النّبی سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے اقارب مراد لیتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے وہ اہلِ علم مراد ہیں جنھیں آپؐ کے ساتھ خصوصی تعلّق ہے۔